عالم اسلام پر مغرب کی فکری یلغار

امریکی اسلام

نظریاتی جنگ سیکولر نظام تعلیم

فکری ارتداد کابل کی مسیحی یونیورسٹی جمہوریت

مولف:

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالہادی مجاہد حفظہ اللہ

مترجم: ابوعبداللہ

150/-

3

218599

عالم اسلام پر مغرب کی فکری یلغار

مولف
عبدالہادی مجاہد

مترجم
ابوعبداللہ

مکتبہ ابوہریرہ

۲۹۷۶۵۲
م ۱۹۹ ع

۱۱۷۵۹۵
ر ۱

مجاہد، عبدالہادی

نام کتاب........................عالم اسلام پر مغرب کی فکری یلغار
مولف........................عبدالہادی مجاہد
مترجم........................ابوعبداللہ
تعداد اشاعت........................ایک ہزار
سال اشاعت اول........................جولائی ۲۰۱۲ بمطابق ۱۴۳۳ھ
سال اشاعت دوم........................فروری ۲۰۱۳ بمطابق ۱۴۳۴ھ

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	انتساب	۱
۲	عرض مترجم	۳
۳	مقدمہ	۵
۴	عرض مؤلف	۹
۵	نظریاتی جنگ	۱۳
۶	نظریاتی جنگ کی تعریف	۱۵
۷	نظریاتی جنگ کے وسائل	۱۴
۸	نظریاتی جنگ کی تاریخ	۱۵
۹	نظریاتی جنگ کے اہداف	۲۲
۱۰	پہلا ہدف	۲۳
۱۱	دوسرا ہدف	۲۴
۱۲	تیسرا ہدف	۲۵
۱۳	چوتھا ہدف	۲۸
۱۴	اسلامی ممالک میں نا اھل قیادت سے کام لینے کے مختلف محاذ	۲۹
۱۵	ذہنی محاذ	۲۹
۱۶	سیاسی محاذ	۲۹
۱۷	عسکری محاذ	۳۰
۱۸	نظریاتی محاذ	۳۰
۱۹	اجتماعی محاذ	۳۰

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۲۱	نظریاتی اور عسکری جنگ میں فرق	۳۲
۲۲	نظریاتی جنگ علامہ اقبال رحمہ اللہ کی نظر میں	۳۹
۲۳	نظریاتی یلغار کی روک تھام	۴۴
۲۴	نظریاتی جنگ میں ہونے والی تباہی سے بچنے کی تدابیر	۴۶
۲۵	مسلمانوں کی پستی کے حقیقی اسباب	۵۸
۲۶	حاکمیت کا میدان	۵۹
۲۷	خاندانی اور شاہی حکومتیں	۶۰
۲۸	بغاوت کے ذریعے مسلط کردہ حکومتیں	۶۱
۲۹	فوجی حکومتیں	۲۶
۳۰	جمہوری اور انتخابی حکومتیں	۶۳
۳۱	تعلیم کا میدان	۶۵
۳۲	قانون سازی اور نظام حکومت کا محاذ	۶۸
۳۳	عسکری میدان اور امن وامان	۷۱
۳۴	میڈیا کا میدان	۷۴
۳۵	معاشرتی زندگی اور ثقافت کا میدان	۷۸
۳۶	جمہوریت کفر ہے یا اسلام؟	۸۴
۳۷	پہلا حصہ: جمہوریت کا تعارف	۸۷
۳۸	جمہوریت کی تعریف	۸۷
۳۹	جمہوریت کی نظریاتی بنیاد	۸۸

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۴۱	۱۔ سیادت (حاکمیت اعلیٰ)	۹۰
۴۲	۲۔ حقوق اور آزادیاں	۹۲
۴۳	جمہوریت میں حقوق اور آزادیوں کی تفصیل	۹۳
۴۴	۱) عقیدے کی آزادی	۹۳
۴۵	۲۔ نظریے اور رائے کی آزادی	۹۳
۴۶	۳۔ شخصی آزادی	۹۴
۴۷	۴۔ بیان یعنی اظہارِ خیال اور تبلیغ کی آزادی	۹۴
۴۸	۵۔ رہائش کا حق	۹۴
۴۹	۶۔ ملکیت کا حق	۹۴
۵۰	۷۔ پیشہ اختیار کرنے کا حق	۹۵
۵۱	۸۔ مرد وزن میں مساوات اور برابری کا حق	۹۵
۵۲	۹۔ سیاسی گروہ بندی	۹۵
۵۳	۱۰۔ دینی گروہ بندی	۹۶
۵۴	دوسرا حصہ: جمہوریت کا مناقشہ	۹۷
۵۵	۱۔ جمہوریت کیوں کفر ہے؟	۹۷
۵۶	۲۔ جمہوریت کی تکفیر کے دلائل	۹۹
۵۷	۳۔ جمہوریت میں اکثریت کی رائے حق کا معیار ہوتی ہے	۱۰۵
۵۸	۴۔ قانون کا مصدر وماخذ عقل ہے یا شریعت؟	۱۰۷
۵۹	۵۔ کیا صرف عقل کی بنیاد پر کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا درست فیصلہ ہو سکتا ہے؟	۱۰۷
۶۰	۶۔ انتخابات	۱۰۹
۶۱	اسلامی نظامِ حکومت کی خصوصیات	۱۱۰
۶۲	کیا انتخابات کے راستے سے اسلام نافذ ہو سکتا ہے؟	۱۱۴

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۶۳	انتخابی نظام کے ذریعے نفاذ اسلام کے ناممکن ہونے کے دس دلائل	۱۱۵
۶۴	جمہوریت کے حقوق اور آزادیوں کی تحقیق	۱۲۲
۶۵	۱۔ دین اور عقیدے کی آزادی کی تحقیق	۱۲۲
۶۶	۲۔ آزادیٔ اظہار رائے کی تحقیق	۱۲۶
۶۷	۳۔ شخصی آزادی کی تحقیق	۱۳۰
۶۸	۴۔ رہائش کے انتخاب میں آزادی کی تحقیق	۱۳۱
۶۹	۵۔ ملکیت کے حق کی تحقیق	۱۳۲
۷۰	۶۔ پیشہ اختیار کرنے کی آزادی کی تحقیق	۱۳۳
۷۱	۷۔ کام سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے حق کی تحقیق	۱۳۳
۷۲	پارلیمنٹ، جمہوریت کی نمائندگی کرنے والا ایک طاغوتی ادارہ	۱۳۴
۷۳	پارلیمنٹ کی حقیقت کیا ہے؟	۱۳۴
۷۴	پارلیمنٹ طاغوتی ادارہ کیوں ہے؟	۱۳۵
۷۵	جمہوری عمل میں شامل ہونے والوں کے دلائل اور ان کے جوابات	۱۴۰
۷۶	پہلی دلیل: حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کیساتھ کام کیا اور اس کے وزیر رہے	۱۴۱
۷۷	دوسری دلیل: نجاشی کے عمل سے استدلال	۱۴۷
۷۸	تیسری دلیل: جمہوریت کو شوریٰ کا نام دینا	۱۵۰
۷۹	پارلیمنٹ کی ووٹنگ اور اسلام کی شوری میں فرق	۱۵۰
۸۰	چوتھی دلیل: دعوت کی مصلحت کیلئے جمہوریت میں شرکت	۱۵۲
۸۱	امریکی اسلام	۱۶۴
۸۲	امریکی اسلام کی تعریف	۱۶۶
۸۳	امریکی اسلام کے فروغ کا منصوبہ	۱۶۹

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۸۴	فغانستان میں امریکہ کی مذکورہ تجاویز کی زندہ مثالیں	۱۷۰
۸۵	مغربی اسلام کے فروغ کے لیے امریکی اقدامات	۱۷۵
۸۶	افغانستان میں مصر کی سیکولر یونیورسٹی ''جامعۃ الازھر'' کی شاخ کھولنا	۱۷۶
۸۷	امریکہ کیلئے مغرب زدہ علمائے سوٗ کی خدمات	۱۷۹
۸۸	اسلام کے خلاف نام نہاد روایتی قسم کے علماء سے کام لینا	۱۸۳
۸۹	جمہوری عناصر کی امداد	۱۹۰
۹۰	بنیاد پرستوں کے خلاف حملے کا طریقہ کار	۱۹۲
۹۱	''عصری تعلیم'' کو اسلام کے خلاف استعمال کرنا	۱۹۵
۹۲	امریکی اور یورپی این جی اوز کا تعارف	۱۹۶
۹۳	امریکہ کے آتے ہی تعلیمی نصاب میں تبدیلی	۱۹۷
۹۴	قدیم وجدید نصاب کا تقابل	۱۹۸
۹۵	افغانستان کیلئے ہندوستان کی تعلیمی اور ثقافتی خدمات	۲۱۶
۹۶	چند اہم تجاویز اور سفارشات	۲۱۷
۹۷	پہلی تجویز: مجاہدین کی سیاسی اور نظریاتی تربیت کرنا	۲۱۸
۹۸	دوسری تجویز: دشمن کی نظریاتی جنگ سے باخبر رہنا	۲۱۸
۹۹	تیسری تجویز: مدارس کے نصاب میں درج ذیل مضامین شامل کرنا	۲۱۸
۱۰۰	الف: سیرت النبی ﷺ کی تعلیم	۲۱۹
۱۰۱	ب: اسلام میں سیاسی نظام کا تصور واضح کرنا	۲۱۹
۱۰۲	ج: دورِ حاضر کے کفر کی نئی شکلوں اور قسموں کا تعارف کرانا	۲۲۰
۱۰۳	د: مغرب کے پس پردہ جرائم کو بے نقاب کرنا	۲۲۲
۱۰۴	ھ: جہاد کے ساتھ ساتھ دعوت الی اللہ کی طرف بھی توجہ دینا	۲۲۳
۱۰۵	دورِ حاضر کا نظریاتی ارتداد علامہ ندوی رحمہ اللہ کی نظر میں	۲۲۷

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۰۶	علامہ ندوی رحمہ اللہ کا تعارف	۲۲۸
۱۰۷	رسالہ: ردۃ ولا ابابکر لہا (ارتداد ہے لیکن اس کے لئے کوئی ابوبکر جیسا نہیں)	۲۳۰
۱۰۸	'ارتداد' کی تعریف	۲۳۲
۱۰۹	گذشتہ زمانے میں مرتد کی پہچان	۲۳۲
۱۱۰	فتنۂ مادیت	۲۴۴
۱۱۱	کابل کی مسیحی یونیورسٹی	۲۵۳
۱۱۲	تاریخی پس منظر	۲۵۵
۱۱۳	مسیحیت تعلیم کے پردے تلے	۲۵۶
۱۱۴	امریکی یونیورسٹیوں کے لیے اسلامی دنیا میں اہم مراکز کا انتخاب	۲۵۷
۱۱۵	اسلامی دنیا میں امریکی یونیورسٹیاں کیوں؟	۲۵۹
۱۱۶	اسلامی ممالک میں امریکی یونیورسٹیوں کے مقاصد واغراض	۲۶۰
۱۱۷	پہلا ہدف: مسلم ممالک کے سیاسی اقتدار کو مسخر کرنا	۲۶۰
۱۱۸	دوسرا ہدف: نئی نسل کو عیسائی بنانا	۲۶۱
۱۱۹	تیسرا ہدف: اسلام کی حقانیت سے متعلق نوجوان نسل کو شکوک وشبہات میں ڈالنا	۲۶۲
۱۲۰	چوتھا ہدف: اسلام کے دفاعی نظریاتی سرچشموں کو ختم کرنا	۲۶۲
۱۲۱	پانچواں ہدف: نوجوانوں کو مقامی سطح پر مغربی کمپنیوں کے لیے امریکی طرز پر تربیت دینا	۲۶۳
۱۲۲	چھٹا ہدف: اسلامی ممالک میں مغربی طرز زندگی رائج کرنا اور مسلمانوں میں امریکی	۲۶۴
۱۲۳	مصنوعات کے استعمال کا شوق پیدا کرنا	۲۶۴
۱۲۴	امریکی یونیورسٹی ایک مسیحی یونیورسٹی ہے	۲۶۵
۱۲۵	عیسائیت کی تبلیغ کے شروع میں مبلغین کا احتیاطی رویہ	۲۶۶
۱۲۶	اس کا نام امریکی یونیورسٹی کیوں ہے؟	۲۶۷
۱۲۷	بیروت کی امریکی یونیورسٹی	۲۶۸

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۲۸	قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی	۲۷۰
۱۲۹	ترکی (استنبول) کی امریکی یونیورسٹی	۲۷۱
۱۳۰	افغانستان میں مسیحی سرگرمیوں کا پس منظر	۲۷۳
۱۳۱	عیسائیت کے فروغ کے تین ہتھیار: غربت، جہالت، بیماری	۲۷۴
۱۳۲	انٹرنیشنل ریسکیو کمیٹی I.R.C :	۲۷۵
۱۳۳	امریکن سینٹر	۲۷۶
۱۳۴	برٹش کونسل	۲۷۶
۱۳۵	ورلڈ ریلیف اور ٹائم	۲۷۶
۱۳۶	شیلٹر ناو انٹرنیشنل	۲۷۷
۱۳۷	کابل میں امریکی کالج	۲۸۱
۱۳۸	تعلیمی فیس کا ڈالروں میں ہونا	۲۸۳
۱۳۹	امریکی یونیورسٹی کے شعبے (Faculties) اور تخصصات	۲۸۵
۱۴۰	۱۔ سیاسی علوم کا شعبہ	۲۸۵
۱۴۱	۲۔ اقتصاد کا شعبہ	۲۸۶
۱۴۲	۳۔ صحافت کا شعبہ	۲۸۶
۱۴۳	۴۔ نظامِ حکومت (مینجمنٹ) کا شعبہ	۲۸۶
۱۴۴	۵۔ فنون لطیفہ کا شعبہ	۲۸۷
۱۴۵	۶۔ ادبیات اور تعلیم و تربیت کے شعبے	۲۸۷
۱۴۶	امریکی یونیورسٹی کی غیر نصابی سرگرمیاں	۲۸۸
۱۴۷	اقتصادی وسائل حاصل کرنے کی تربیت	۲۸۹
۱۴۸	امریکی یونیورسٹی اور C.I.A کے لیے جاسوسی	۲۹۰
	اختتامی کلمات	

الله
بسم الله الرحمن الرحيم

گلاب کی کھلتی کلیوں سے زیادہ خوبصورت

ان نوجوانوں کے نام

جنہوں نے

کم تجربہ اور کم وسائل

لیکن قوی ایمان

اور محض اللہ پر توکل کے ذریعہ

صلیبی لشکروں کے ماہر اور تجربہ کار جرنیلوں کو

عسکری میدان میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا............ اس فکر کے ساتھ

کہ معرکۂ فکر و نظر کا میدان امت کے مخلص داعیوں کا تا حال منتظر ہے۔

عرضِ مترجم

افغانستان پر امریکی حملہ محض عسکری حملہ نہ تھا بلکہ افغانی معاشرے کو نظریاتی اعتبار ۔ سے تہہ وبالا کرنے کیلئے ہمہ گیر حملہ تھا، حملہ آور افغان قوم کو فتح کرنے کیلئے بی باون، ہموی گاڑیاں، ٹینک، ڈرون اور جدید ترین اسلحہ ہی نہیں لائے تھے بلکہ اپنے ہمراہ ٹی وی چینلز، این جی اوز، اصلاحاتی پروگرام، عیسائی اور سیکولر (بے دین) تعلیمات کو عام کرنے والا لٹریچر بھی ہمراہ لائے، آج افغانستان میں جگہ جگہ نیٹ کیفے کھل چکے ہیں عیسائی تنظیمیں کھلے عام ارتدادی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں؛ افغانستان میں امریکا اور اتحادیوں کے زیر اثر چلنے والے تعلیمی ادارے افغانوں کی نسل نو کا دل ودماغ بدلنے کیلئے دن رات مصروف عمل ہیں۔

یہ تمام حالات کسی ذی شعور اور باغیرت مسلمان کو یہ باور کرانے کیلئے کافی ہیں کہ اگر کفار کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو افغانستان کا مستقبل کس قدر بھیانک ہوگا؟

اللہ تعالی جزائے خیر دے شیخ عبدالہادی ۔حفظہ اللہ۔ کو کہ انہوں نے افغانستان میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے جاری سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لیکر ان کا پردہ چاک کیا۔ شیخ عبدالہادی کا نام افغانستان کے جہادی حلقوں میں غیر معروف نہیں، آپ جید عالم دین، داعی، مفکر اور مجاہدین کے محبوب راہنما ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وتقویٰ سے نوازا ہے اور تحریر وتقریر میں یکساں مہارت عطا فرمائی ہے، فکری صلاحیت اور راست گوئی آپ کی امتیازی شان ہے۔

زیر نظر کتاب آپ ہی کے زور قلم کا شاہکار ہے، اصلاً یہ کتاب پشتو میں شائع ہوئی ہے کتاب کا متن ومواد اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ اس عظیم سرمائے کو اردو زبان میں بھی منتقل کیا جائے اس لئے کہ اس کے مندرجات کا تعلق افغانستان کے علاوہ کئی دیگر نام نہاد اسلامی ممالک کے احوال سے بھی ہے جن میں مسلمان قوم کو مائل بہ کفر کرنے کی مذموم کوششیں جاری ہیں اس

سلسلے میں نہ صرف یہ کہ مغربی این. جی اوز اور استعماری ایجنٹ اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ بدقسمتی سے بعض مذہبی عناصر بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ''دین محمد'' کو ''دین امریکا'' میں بدلنے کیلئے اپنی خدمات استعمار کی خوشنودی کیلئے بڑھ چڑھ کر پیش کر رہے ہیں۔

عرضِ مترجم کے طویل ہونے کا خدشہ نہ ہوتا تو اس سلسلے میں مزید تفصیل کیساتھ کچھ گذارشات پیش کی جاتیں۔ یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ شیخ عبدالہادی کی یہ کتاب اُن تمام مذکورہ سازشوں اور سازشی عناصر سے پردہ اٹھاتی ہے خصوصاً ''امریکی اسلام'' کے نام سے موسوم باب نہایت اہمیت کا حامل ہے قارئین اس پوری کتاب کے مطالعے سے اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت پاکستان اور افغانستان میں کن کن طریقوں سے لوگوں کے قلوب واذہان کو بدلنے کی پیہم کوششیں جاری وساری ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ کسی ایک زبان سے (خصوصاً پشتو جیسی دقیق زبان سے) اردو میں کسی مواد کو منتقل کرنا کتنا کٹھن اور محنت طلب کام ہے اس سلسلے میں پوری ذمہ داری سے پشتو سے اردو میں ترجمے پر محنت کی گئی ہے ایک مرتبہ ترجمہ ہونے کے بعد کئی احباب نے بھی اس پر خصوصی نظر ثانی فرمائی ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجمہ ہر اعتبار سے مکمل ہے مگر اتنا ضرور عرض ہے کہ یہ پڑھنے والے کو اپنا مدعا بحر حال سمجھا سکتا ہے۔ انشاءاللہ

تمام قارئین سے عرض ہے کہ اس ترجمے میں اگر کہیں کوتاہی نظر آئے تو ضرور مطلع فرمائیں اور ساتھ ساتھ ہمارے حق میں یہ دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ اس معمولی سی کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشے۔ آمین یارب العالمین

ابو عبداللہ عفی اللہ عنہ وعافاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على امام الهداة المرسلين وعلى آله وأصحابه الذين أناروا الدنيا بنور الدين وعلى من تبعهم باحسان ونشر الهدى الى يوم الدين أجمعين

میرا یہ گمان نہیں تھا کہ اس کتاب کو افغانی علماء، طلبہ اور عام پڑھنے والے لوگوں کے ہاں پہلی ہی طباعت میں اتنی مقبولیت حاصل ہوگی اور ان کیلئے یہ کتاب اتنی مفید ثابت ہوگی، یہ سب کچھ اللہ تعالی کے خاص فضل سے اور افغان ملت کی اسلامی فکر کیساتھ مضبوط لگاؤ اور اس کی طرف سے اسلام کے دفاع کا شعور رکھنے کی بدولت ہوا۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت جیسے ہی منظر عام پر آئی تو بہت کم وقت میں مارکیٹ سے نایاب ہوگئی، جس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبی حملوں کے خلاف ہر محاذ پر جاری جدوجہد میں ہماری ملت کے علماء، مبلغین، مفکرین اور ذی رائے لوگ اور مجاہدین مسلح جہاد کے ساتھ ساتھ فکر ونظر اور نشرواشاعت کے میدان میں بھی مغرب کے نظریاتی حملوں کے مقابلے کیلئے وسائل اور نظریاتی مواد کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جو لوگ دین، ملت اور وطن کے دفاع کا جذبہ رکھتے ہیں وہ اس قسم کی کتابوں کے بہت پیاسے ہوتے ہیں اور دن بدن ان کی یہ پیاس بڑھتی جا رہی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذہن میں مغربی فلسفے کے ملحدانہ تصورات مثلا جمہوریت، انسانی حقوق، مساوات (برابری)، روشن خیالی، صلح، ترقی اور دیگر سینکڑوں بے فائدہ طور طریقوں اور بے معنی عنوانات کی مقبولیت ختم ہو رہی ہے۔ امت مسلمہ کے نوجوان اور باشعور لوگوں کو مغربی فلسفہ میں دھوکہ، جھوٹ، تعصب، ظلم، خیانت اور تنگ نظری کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ امت کے مخلص لوگ چاہتے ہیں کہ ایک دفعہ پھر سچے انداز میں اسلامی شریعت اور اسلامی فکر کے نظریات و آداب کی طرف

لوٹ آئیں۔ یہ احساس دیگر اقوام کی بنسبت افغان نوجوانوں میں زیادہ دیکھا جارہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ افغان نوجوانوں کیلئے افغان علماء اور مفکرین نے دور حاضر کے اسلامی موضوعات پر یا تو بہت کم لکھا ہے یا پھر نوجوان طبقے تک وسیع پیمانے پر وہ مواد پہنچا نہیں ہے اور یہ مشکل شاید بہت سے خارجی اسباب کی وجہ سے بھی پیدا ہوئی ہے، لیکن اب وقت آ پہنچا ہے کہ نئی نسل کے مجاہدین اور نوجوانوں کے مغرب سے مقابلے کیلئے بہت کچھ لکھا جائے اور بڑے پیمانے پر اسے لوگوں تک پہنچایا جائے اس کیلئے میں دل کی گہرائیوں سے علمائے دین، تعلیمی اداروں اور اسلامی این جی اوز (N.G.O) چلانے والوں سے گزارش کرتا ہوں کہ اپنے درسوں اور تعلیمی نصابوں میں اسلامی فکر اور نظریات کو جگہ دیں اور اس کے ذریعہ مغرب کے سیکولر اور الحادی نظریات کے سیلاب کا راستہ روکیں اسی مقصد کے حصول کے لیے ہم اس کتاب کو نئے اضافوں کے ساتھ ایک بار پھر شائع کر رہے ہیں۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں درج ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

١۔ کتاب کو اول تا آخر بغور دیکھ کر حتی الامکان طباعت اور کتابت کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے تاکہ کتاب کی عبارت عام فہم اور آسان ہو جائے اور وہ لوگ بھی اسے سمجھ سکیں جو علمی اصطلاحات سے واقف نہیں۔

٢۔ ''امریکی اسلام'' کے مضمون میں افغانستان کے تعلیمی نصاب میں دین دشمنی پر مبنی تبدیلیوں کے کچھ نمونے ذکر کیے گئے ہیں بالخصوص روس کے دور کے مجاہدین کا وضع کردہ نصاب اور امریکی تسلط کے بعد بنائے ہوئے نصاب کے درمیان تقابل پیش کیا گیا ہے جس میں تبدیلی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور تقریباً ہر مثال کے ساتھ ایک مختصر سا تبصرہ بھی لکھا گیا ہے تاکہ عام لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ اہل مغرب اور ان کے ہم نوا نام نہاد مسلمان امت مسلمہ کے نوجوانوں کے ذہنوں سے اسلامی اقدار وافکار نکالنے کی کیسی کیسی کوششیں کر رہے ہیں اور اس کی جگہ ان کے سامنے مغربی طرز زندگی اور اس کے فلسفوں کا کامیاب اور قابل تقلید ہونا ثابت کر رہے ہیں۔

کتاب میں موجودہ دور کے ''فکری ارتداد'' کے نام سے ایک مکمل مضمون کا اضافہ کیا گیا

ہے۔ فکری ارتداد وہ ارتداد ہے کہ جس کے مرتکب ایسے لوگ ہیں جو دورِ حاضر کے رائج کفریہ نظاموں جیسے جمہوریت، لبرل ازم، کمیونزم، گلوبلائزیشن، نیشنلزم، ہیومنزم وغیرہ کے علم بردار ہیں اور اسلامی نظام اور نفاذ شریعت کے سخت مخالف ہیں۔ امارتِ اسلامیہ کا راستہ روکنے کیلئے کفار کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور اس سب کچھ کے باوجود وہ اسلامی معاشرے میں رہتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ موضوع بہت زیادہ اہم، خطرناک اور حساس ہے اور اس پر لکھنے والے بیشتر اصحاب قلم افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، یعنی بعض تو ان لوگوں کی تکفیر کر بیٹھتے ہیں جو ان نظامہائے زندگی کے تحت زندگی گذار رہے ہیں اور بعض وہ ہیں جو صریح کفر کو بھی کفر نہیں کہتے اور مرجئہ[1] کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں، چنانچہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر دور حاضر کے ایسے علماء قلم اٹھائیں جو اسلام کی حقیقی روح اور بالخصوص دور حاضر کی کفریہ شکلوں اور قسموں سے بھی باخبر ہوں اور مضبوط شرعی دلائل کی روشنی میں کوئی موقف اپنائیں۔ خوش نصیبی ہے اس بارے میں موجودہ زمانے کے بڑے داعی اور باخبر عالم ابوالحسن علی ندوی (رحمہ اللہ) کا مشہور علمی اور نظریاتی مقالہ "ردة ولا ابابكر لها" جو ان کی مشہور کتاب "الی الاسلام من جدید" کا آخری رسالہ ہے، عربی زبان میں منظر عام پر آیا، علامہ ندویؒ چونکہ مشرقی مسلمان اور مغربی کافر کے درمیان نظریاتی کشمکش کے بارے میں وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور انہوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، دوسری طرف اہل سنت والجماعت کے تقریبا تمام مکاتب فکر میں ان کی اعتدال پسندی اور پرہیزگاری بھی مسلم ہے، اس لئے ہم نے بجائے اس کے کہ خود کچھ لکھیں علامہ ندویؒ کے مقالے کو اپنی کتاب میں شامل کیا جس کے ذریعے ایک طرف تو امت مسلمہ کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اس میدان میں ایک جامع، سنجیدہ اور ٹھوس موقف اپنائے، اور دوسری طرف موضوع کو ایک ایسے عالم اور مبلغ کے قلم سے پیش کیا جس کے اعتدال اور دیانت پر سب کو اطمینان ہے، یہ بات ذہن میں رہے کہ علامہ ندوی نے موضوع کو زیادہ تر فکری زاویے سے چھیڑا ہے

---

[1] وہ فرقہ جس کا عقیدہ یہ تھا کہ کلمہ پڑھنے کے بعد انسان کچھ بھی کرتا رہے اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔

نہ کہ شرعی حکم کے بیان اور فتوے کی رو سے، اس لئے کہ شرعی حکم کا بیان کرنا تحقیقی بحث کا موضوع ہے اور ہمیں یہاں پر موضوع کا نظریاتی زاویہ چاہئے۔

دوسری بات یہ ذہن میں رہے کہ جب اس کتاب کی پہلی اشاعت سامنے آئی تو ملک کے کئی علاقوں کے فارسی خواں علماء، مدارس اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور عام لوگوں نے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا بارہا مطالبہ کیا لہٰذا ہم نے بھی ان کی طلب پوری کرنے کیلئے اس کو فارسی زبان میں (دانستہائے از فکر اسلامی) کے نام سے ترجمہ کیا جس کی اشاعت پر کام جاری ہے اور ان شاء اللہ مستقبل قریب میں قارئین کے سامنے آجائے گی۔ آخر میں ایک بار پھر علماء، اہل نظر اور دین کی نظریاتی سرحدات کی حفاظت کرنے والوں سے میں گزارش کروں گا کہ کفر اور گمراہی کی موجودہ شکلوں کے بارے میں نئی نسل کیلئے، مضبوط اور دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق قلمی کام کریں تاکہ مغرب کی نظریاتی یلغار کا راستہ روکا جاسکے اور آنے والی نسلوں کو ان کے دامِ فریب میں پھنسنے سے بچایا جاسکے۔

آخر میں اس بات کی یاد دہانی کرانا چاہوں گا کہ اس کتاب میں اگر میں نے حق بیان کیا ہو تو یہ اللہ جل شانہ کا مجھ پر فضل واحسان ہوگا اور اگر میں نے کہیں خطا کی ہو تو وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہے نہ یہ کہ میں غلطی پر مصر ہوں لہٰذا امید ہے کہ اسلامی فکر کے اساتذہ مجھے اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کی طرف متوجہ کر کے اپنی ذمہ داری پوری کریں گے اور مجھ پر مہربانی فرما کر میرے ساتھ دلی خیر خواہی کا ثبوت دیں گے۔

والسلام

کفر کی شکست اور اسلام کی فتح کے لئے پرامید

عبدالہادی مجاہد

عرض مؤلف

کچھ اہم باتیں

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على امام الهداة المرسلين وعلى آله وأصحابه الذين أناروا الدنيا بنور الدين وعلى من تبعهم باحسان ونشر الهدى الى يوم الدين أجمعين

قال الله تبارک وتعالیٰ:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُواْ أَذًى كَثِيْراً وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾

(آل عمران: ۱۸۶)

ترجمہ: ''(مسلمانو!) تمہیں اپنے مال و دولت اور جانوں کے معاملے میں ضرور آزمایا جائے گا اور تم اہل کتاب اور مشرکین دونوں سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ سے کام لو تو یقیناً یہی کام بڑی ہمت کے ہیں''

یہ کتاب درحقیقت پانچ اہم مضامین کا مجموعہ ہے:

۱۔ نظریاتی جنگ۔

۲۔ جمہوریت کفر ہے یا اسلام؟

۳۔ امریکی اسلام۔

۴۔ دورِ حاضر کا نظریاتی ارتداد۔

۵۔ امریکی یونیورسٹیاں۔

کتاب کے یہ مضامین اگرچہ موضوع کے اعتبار سے الگ الگ ہیں لیکن سب ایک ہی ہدف کی وضاحت کرتے ہیں اور وہ یہ کہ کفار بالخصوص مغرب کس طرح عسکری جنگ کے ساتھ ساتھ فکر، عقیدہ، اخلاق اور اطلاعات کے میدان میں بھی مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی اجتماعی جنگ میں مشغول ہیں اور اس جنگ میں عسکری جنگ سے بھی زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

اس طرز کی ایک کتاب کے لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ہماری ملت جنگ، قربانی اور دشمن کو شکست دینے کے لحاظ سے اونچی شہرت رکھتی ہے لیکن دشمن کے ساتھ نظریاتی جنگ کے بارے میں اب تک مجاہدین اور دفاع کرنے والوں کے ذہن میں کوئی واضح تصور اور روشن مقصد ہے نہ ہی اب تک کسی نے دشمن کی فکر اور نظر سے پورے طور پر ان کو آگاہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف نظریاتی جنگ اور دشمن کے خطرناک منصوبوں اور سازشوں کے بارے میں ہماری دینی درسگاہوں میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا اور عصری علوم کے نصاب بھی اس سے بالکل خالی ہیں، اس کے علاوہ نظریاتی تعلیم نہ ہونے کے اور بھی مختلف اسباب ہیں، بہرحال اسباب سے قطع نظر اسکا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اگرچہ ہماری ملت نے ہمیشہ سے حملہ آور اور قابض دشمن کو نہیں مانا اور کبھی اسکی غلامی قبول نہیں کی لیکن حقیقت میں حملہ آور قوتوں کے افکار کا مقابلہ بھی نہیں کیا جس کے نتیجے میں انہی افکار نے ہر دفعہ ان کو ایک نئی مصیبت میں پھنسا دیا۔

لہٰذا مندرجہ بالا اہم موضوعات پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ کہیں ہمیں پھر سے اس قسم کی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے اور فتح کے بعد پھر ایک نئے غم کا سامنا نہ ہو اور اختیارات یا حکومت پھر ایسے لوگوں کے ہاتھ نہ لگے جن کو دشمن آج سے تیار کر رہا ہے اور ملت میں اس کیلئے ذہن سازی کا عمل شروع کیا ہوا ہے۔ ہم یہ اہم کام اپنی امت کے سامنے اپنی ذمہ داری پوری کرنے اور اس کتاب کو ان کے سامنے فیصلہ کیلئے پیش کرنے کی غرض سے کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ملت کے دلسوز اور دردمند سپوت اسے غور سے پڑھیں گے اور اس کی روشنی میں باہر سے درآمد شدہ افکار، اشخاص، نظریاتی

گروپوں اور تنظیموں کے بارے میں مناسب رائے اپنائیں گے۔ اس کتاب کے مخاطب عمومی طور پر تو افغانستان کی مسلمان ملت کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے مسلمان ہیں لیکن میں خاص طور پر معلمین مدرسین، ائمہ مساجد، خطباء، مدارس، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، میدان جنگ کے مجاہدین اور فکر ونظر رکھنے والوں سے بھی اس کو پڑھنے کی امید کرتا ہوں کیونکہ یہی لوگ معاشرے کے دین، ایمان، عقیدے، اخلاق، تمدن، ملی اور تاریخی رسم ورواج کی حفاظت ودفاع کرتے ہیں جس کے نتیجے میں پوری ملت آزادی، سربلندی اور عزت کے ساتھ زندگی گزارتی ہے اور اللہ نہ کرے اگر یہ لوگ غیروں کے افکار، نظریات، عقائد اور غیروں کے رسم ورواج کا شکار ہو گئے تو پوری ملت اجتماعی ذلت اور بدبختی کا شکار ہو جائے گی۔

جہادی قیادت، دینی مدارس اور مکاتب کے اساتذہ سے امید کی جاتی ہے کہ وہ مجاہدین، طلبہ اور نئی نسل کے نوجوانوں کو یہ کتاب یا اس طرح کی دیگر کتابیں پڑھانے کا پکا ارادہ کریں گے تاکہ دشمن کے بارے میں جو کہ خطرناک منصوبے رکھتا ہے، ضروری معلومات رکھی جاسکیں اور ان کا نظریاتی مقابلہ کیا جاسکے اور پوری بصیرت کے ساتھ اپنی ملت کو دشمن کے خطرناک منصوبوں سے خبردار کیا جاسکے۔

یہ کتاب میری کئی سالوں کی تدریس، دعوت، مطالعہ اور نظریات کے تقابل، جہاد اور مقابلے کے میدان سے حاصل شدہ تجربات اور معلومات کا خلاصہ ہے جو سینکڑوں کتابوں، رسالوں اور ہزاروں صفحات کے مطالعے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ اس کتاب کے لکھنے میں بہت سے اہلِ بصیرت علماء اور اسلامی فکر کی قیادت کرنے والوں کی تالیفات، تجربوں اور تجزیوں سے استفادہ کیا گیا ہے اس ترتیب سے کہ ان کی کتابوں سے راہنمائی اور پھر اسی تاثر کی روشنی میں اپنے افکار اور معلومات جو مجھے حق نظر آئے، ان کی طرف منسوب کیے بغیر لکھے ہیں اس کام کی علت یہ تھی کہ ہمارے معاشرے کے علماء اور اصحاب فکر ونظر نظریاتی لحاظ سے بہت منتشر ہیں کوئی کسی ایک فکر اور مفکّر سے متاثر ہے تو کوئی کسی دوسرے سے، نیز اس معاملے میں اتنے اختلافات اور نفرتیں بھی رکھتے ہیں کہ کتاب پر صرف مصنف کا

نام پڑھ کر ہی کتاب کو پڑھنے کے قابل نہیں سمجھتے اور اسکی مخالفت کرتے ہیں، اگر چہ علمی ذوق اور انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ مسلمان مفکرین اور علماء کی کتابوں کو فراخ دلی سے پڑھا جائے، ان کی اچھی چیز لے لی جائے اور برے افکار شریعت کی روشنی میں رد کر دیئے جائیں۔

مندرجہ بالا وجوہات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے بہت سے مراجع ذکر نہیں کئے ہیں بلکہ افکار پڑھنے والوں کے سامنے رکھے ہیں کہ اگر ماننے کے قابل ہیں تو مان لیں ورنہ رد کر دیں اور اشخاص پر کوئی حکم نہ لگائیں، دوسری بات یہ تھی کہ میرے استفادے کے مراجع اکثر دوسری زبانوں میں تھے جو ہمارے ہاں عام طور سے دستیاب نہیں ہوتے اور اگر کہیں مل بھی جائیں تو ہر ایک کے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے۔

آخر میں یہ یاد دہانی کراتا چلوں کہ اگر میں اس کتاب میں حق پر ہوں اور میں نے حق کو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا تو یہ صرف اللہ جل شانہ کا فضل اور راہنمائی ہوگی اور اگر میں نے کسی جگہ یا کسی حکم میں خطا کی ہو تو یہ میری کوتاہی اور ناسمجھی کی وجہ سے ہی ہوگا، صحیح اسلامی فکر کے اساتذہ اور علماءِ دین سے امید رکھتا ہوں کہ مجھے میری غلطیوں کی طرف متوجہ کریں گے۔

والسلام

عبدالھادی مجاہد

نظریاتی جنگ

اقوام عالم کو ہمیشہ کیلئے زیر تسلط رکھنے اور بغیر کسی لڑائی کے ان پر قبضہ کرنے کے لئے عسکری جنگ سے زیادہ نظریاتی یلغار موثر ہوتی ہے، کیونکہ عسکری جنگ اکثر و بیشتر جانب مخالف سے بھرپور مقابلے اور ردعمل کا سبب بنتی ہے۔ جو کہ لڑائی کے طویل ہونے، جنگی اخراجات اور نقصانات کی زیادتی کا سبب بنتا ہے۔ اور بالآخر اس کا نتیجہ حملہ آور قوت کی شکست ہوتا ہے، اگرچہ یہ شکست طویل عرصہ بعد ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخ کے مطالعہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عسکری جنگ کے ذریعے حاصل ہونے والی فتح اور تسلط اس وقت تک پائیدار نہیں رہتی جب تک نظریاتی قبضہ طویل مدت کیلئے باقی نہ رہے۔ نظریاتی تسلط کی پائیداری کا تعلق اس بات سے ہے کہ فاتح قوم اپنی فکر میں کس حد تک حق بجانب ہے اور وہ نظریہ مفتوحہ علاقے کیلئے اپنے اندر کتنی حد تک خیر خواہی، انصاف اور انسانی شرافت کا پیغام رکھتا ہے۔ اب جبکہ مغربی عیسائیوں نے امریکی قیادت میں افغانستان پر حملہ کیا ہے اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ افغانستان کو ایک کٹھ پتلی ریاست بنا کر افغان قوم کو آزادی اور جمہوریت جیسے جھوٹے دعوؤں کے ذریعے اپنا غلام بنائیں تو اسی نظریاتی جنگ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عسکری یلغار کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر ایک بڑی نظریاتی یلغار بھی شروع کی ہوئی ہے تاکہ افغان قوم کے ذہنوں کو ہمیشہ کے لئے فتح کر لیں۔ امریکہ نے افغانستان میں عسکری جنگ کو آگے بڑھانے کیلئے صرف چند ادارے مصروف عمل بنائے ہیں جیسے امریکی فوج، نیٹو، ایساف، افغان آرمی، ملّی اردو اور جاسوسی ادارے، جبکہ نظریاتی محاذ کیلئے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے تقریباً چار ہزار غیر فوجی ادارے مصروف عمل ہیں جو کہ افغان قوم کی زندگی کے دینی سیاسی، معاشرتی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی اور اسکے علاوہ اور بہت سے مختلف شعبوں پر مسلسل کام کر رہے ہیں۔ امریکی اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن ہم افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنے پر مجبور ہوں گے اسلئے وہ ابھی سے افغانستان میں اپنی نظریاتی لڑائی ایسے موثر انداز سے آگے بڑھا رہے ہیں کہ جیسے ہی عسکری شکست کا سامنا ہو تو

ظریاتی فتح اسکی جگہ لے لے، جیسا کہ یہی تجربہ ان سے پہلے انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی کٹھ پتلی سلامی ریاستوں میں کیا تھا جس کی وجہ سے ان ریاستوں کے آزاد ہونے کے بیسیوں سال بعد بھی کسی یک ریاست میں بھی اب تک اسلامی نظام کو جگہ نہ مل سکی۔

نظریاتی جنگ کی تعریف

نظریاتی جنگ وہ جنگ ہے جو کفار غیر فوجی وسائل کے ذریعے مسلمانوں کو مسخر کرنے اور ان کے عقائد، فکر، رسم و رواج، اخلاق اور زندگی گزارنے کے اسلامی ڈھانچے کو یکسر بدلنے کیلئے لڑتے ہیں۔ تاکہ مسلمان اپنے انفرادی تشخص سے محروم ہو جائیں اور انہیں زندگی کے تمام شعبوں میں مغرب کی تقلید کرنا پڑے۔ نیز کفار کے خلاف کسی مسلمان کے ذہن میں عسکری جنگ کا تصور تک باقی نہ رہے۔

نظریاتی جنگ میں مسلمانوں کے ظاہری وجود کو نشانہ نہیں بنایا جاتا بلکہ ان کے دین، سوچ و فکر، معاشرتی رسم و رواج اور اخلاق کو ہدف بنا کر ان پر کاری ضرب لگائی جاتی ہے کیونکہ یہی وہ باطنی عوامل ہیں جو کسی قوم کے افراد کو اپنے ظاہری اور معنوی وجود کو بچانے اور حملہ آور کا مقابلہ کرنے کیلئے جنگ کی صف اول میں کھڑا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی ان باطنی قوتوں کو آہستہ آہستہ منظم طریقے سے ختم کیا جاتا ہے تو دشمن کے ساتھ ظاہری لڑائی کا تصور خود بخود ختم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں فاتح قوم یعنی دشمن ہر قسم کے مالی اور جانی نقصان سے محفوظ رہتا ہے اور بغیر کسی لڑائی کے اسے اپنا مقصود بھی ہاتھ آ جاتا ہے۔

نظریاتی جنگ کے وسائل

جیسے کہ عسکری جنگ میں فوجی وسائل کو کارآمد بنایا جاتا ہے یعنی فوج، توپ، ٹینک، جہاز، بم، بارود، کارتوس، بندوق، عسکری ٹیکنالوجی، عسکری قوت اور تربیت یافتہ ماہر فوجی افسر وغیرہ کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اسی طرح نظریاتی محاذ پر فکری نوعیت کے وسائل کو بروئے کار لایا جاتا ہے جیسے کہ

استاذ، کتاب، درسگاہ، اسکول، کالج علمی تحقیقات کتب خانے، اخبارات ورسائل، جرنلیزم، ادبی کتابیں، معاشرتی علوم، علاج معالجہ کے ادارے جیسے کہ شفاخانہ اور ہسپتال، سیر وتفریح کے مواقع جیسے کہ پارک، کلب، سوئمنگ پول، ساحلِ سمندر، میڈیا، اور نشر واشاعت مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما گھر، تھیٹر، انٹرنیٹ، سیٹلائٹ، فلمیں بنانے والی کمپنیاں، سیاسی شخصیات اور سیاسی جماعتیں، سیاسی لٹریچر، جنسی خواہشات اور ہر چیز میں عورت کا استعمال اور اسی قسم کے دیگر ذرائع کو ماہر اور تربیت یافتہ لوگوں کے ذریعے منظم طریقے سے کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ تمام وہ وسائل ہیں جو انسان کی سوچ وفکر اور نظریہ کو متاثر کرتے اور قوموں کے نظریاتی رخ کو بدلتے ہیں، یہی وہ وسائل ہیں کہ جنھیں کفر آج پوری مہارت کیساتھ مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نظریاتی جنگ کا میدان اتنا وسیع ہے کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو شامل ہے اور ہزاروں مغربی ادارے اس میں مصروف عمل ہیں۔

نظریاتی جنگ کی تاریخ

حق وباطل کے درمیان عسکری جنگ کی بہ نسبت نظریاتی جنگ کی تاریخ زیادہ قدیم ہے۔ اس کی ابتداء اسی دن ہو گئی تھی جس دن حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے درمیان دشمنی کی ابتداء ہوئی، ابلیس جو کہ باطل قوتوں کا علمبردار ہے اس نے حضرت آدم علیہ السلام کیخلاف نظریاتی جنگ سے کام لیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو مغلوب کرنے کیلئے نظریاتی وسائل کا استعمال کیا۔ چنانچہ ابلیس نے جب یہ بھانپ لیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اسکے دشمن ہیں اور بزور بازو انہیں زیر نہیں کیا جاسکتا تو اس نے نظریاتی وسائل سے کام لینا شروع کیا۔ مثلاً حضرت آدم کے سامنے اپنے آپ کو خیر خواہ کی شکل میں ظاہر کرنا، ان کے ساتھ خیر خواہی کا دعویٰ کرنا اور پھر اپنے دعویٰ کو سچا دکھانے کیلئے جھوٹی قسموں کے ذریعے ان کے دل میں وسوسہ ڈالنا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اور ان کی بیوی کو بالآخر بہکا دیا۔ اور ان دونوں کو جنت سے نکلوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ان کے درمیان نظریاتی جنگ کا تذکرہ سورۃ

اعراف کے ان آیات میں کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلآئِکَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ فَسَجَدُواْ إِلاَّ إِبْلِیسَ لَمْ یَکُن مِّنَ السَّاجِدِینَ(۱۱) قَالَ مَا مَنَعَکَ أَلاَّ تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُکَ قَالَ أَنَاْ خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِی مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِینٍ(۱۲) قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَکُونُ لَکَ أَن تَتَکَبَّرَ فِیهَا فَاخْرُجْ إِنَّکَ مِنَ الصَّاغِرِینَ(۱۳) قَالَ أَنظِرْنِی إِلَی یَوْمِ یُبْعَثُونَ(۱۴) قَالَ إِنَّکَ مِنَ الْمُنظَرِینَ(۱۵) قَالَ فَبِمَا أَغْوَیْتَنِی لأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیمَ(۱۶)ثُمَّ لآتِیَنَّهُم مِّن بَیْنِ أَیْدِیهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَیْمَانِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ وَلاَ تَجِدُ أَکْثَرَهُمْ شَاکِرِینَ(۱۷) قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْؤُوماً مَّدْحُوراً لَّمَن تَبِعَکَ مِنْهُمْ لأَمْلأَنَّ جَهَنَّمَ مِنکُمْ أَجْمَعِینَ(۱۸)وَیَا آدَمُ اسْکُنْ أَنتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّةَ فَکُلاَ مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَلاَتَقْرَبَا هَـذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَکُونَا مِنَ الظَّالِمِینَ(۱۹) فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطَانُ لِیُبْدِیَ لَهُمَا مَا وُورِیَ عَنْهُمَا مِن سَوْءَاتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاکُمَا رَبُّکُمَا عَنْ هَـذِهِ الشَّجَرَةِ إِلاَّ أَن تَکُونَا مَلَکَیْنِ أَوْ تَکُونَا مِنَ الْخَالِدِینَ(۲۰)وَقَاسَمَهُمَا إِنِّی لَکُمَا لَمِنَ النَّاصِحِینَ(۲۱)﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو چنانچہ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا(۱۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا؟ تو وہ بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا(۱۲) اللہ نے فرمایا تو یہاں سے نیچے اتر جا، کیونکہ تجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہاں تکبر کرے۔ اب نکل جا یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے(۱۳) اس نے کہا مجھے اس دن تک (زندہ رہنے کے) مہلت دیدے کہ جس دن لوگوں کو قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا(۱۴) اللہ نے فرمایا تجھے مہلت دے دی گئی(۱۵) کہنے لگا اب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا اس لیے میں

(بھی) قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان (انسانوں) کی گھات لگا کر تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ رہوں گا (۱۶) پھر میں ان پر (چاروں طرف سے) حملے کروں گا، ان کے سامنے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کے دائیں طرف سے بھی اور ان کے بائیں طرف سے بھی۔ اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا (۱۷) اللہ نے فرمایا نکل جا یہاں سے ذلیل اور مردود ہو کر، ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا (وہ بھی تیرا ساتھی ہوگا) اور میں تم سب سے جہنم بھر دوں گا (۱۸) اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جہاں سے جو چیز چاہو کھاؤ۔ البتہ اس درخت کے قریب بھی مت جانا ورنہ تم زیادتی کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے (۱۹) پھر ہوا یہ کہ شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا، تا کہ ان کی شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی ہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔ کہنے لگا کہ تمہارے پروردیگار نے تمہیں اس درخت سے کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے روکا تھا کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہمیشہ کی زندگی نہ حاصل ہو جائے (۲۰) اور ان کے سامنے وہ قسمیں کھا گیا کہ یقین جانو کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں (۲۱)"

مذکورہ بالا آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کیساتھ دشمنی کرتے ہوئے شیطان نے اس بات کی پکی قسم کھائی کہ وہ اس سلسلے میں ہر طریقہ بروئے کار لائے گا اور مؤمنوں کو سیدھے راستے سے بہکانے کیلئے ہر جگہ گھات لگائے گا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کیلئے قسمیں کھانا اور ان کے لئے خیر خواہی کے جذبات ظاہر کرنا اور حضرت آدم علیہ السلام کیساتھ اپنی دشمنی آگے بڑھانے کے لیے نرم زبان اور لب ولہجہ استعمال کرنا، یہ سب نظریاتی جنگ کے بنیادی وسائل ہیں جو آج ترقی کر کے اپنے عروج کو پہنچ چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح تاریخ کے طول وعرض میں باطل کے اتحادیوں نے ہمیشہ سے انبیاء کے خلاف اپنی مزاحمتوں میں جنگی وسائل کیساتھ ساتھ نظریاتی وسائل سے بھی کام لیا ہے، چنانچہ کبھی تو انبیاء کے بارے میں بیہودہ اور لغو الزامات کا چرچا کیا کرتے تھے اور کبھی انہیں پاگل، ناقص العقل، اور جادوگر کے نام سے پکارتے اور کبھی لوگوں کو طرح طرح کے وسائل

اور دھوکہ بازی کی باتوں کے ذریعے ورغلا کر انبیاء کے خلاف صفوں میں کھڑا کرتے اور کبھی مؤمنوں کے دلوں میں ان کے دین اور پیغمبر سے متعلق شکوک وشبہات ڈالنے کی کوشش کیا کرتے۔

مثلاً جب قریش نے دیکھا کہ قرآن لوگوں پر اثر انداز ہو رہا ہے اور حق کی دعوت ان کے دل ودماغ میں جا اترتی ہے اور اس پر یقین حاصل ہونے کے نتیجے میں لوگ ایمان قبول کر لیتے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر حق کی دعوت اسی طریقے سے لوگوں تک بغیر کسی مزاحمت اور رکاوٹ کے پہنچنے کا سلسلہ جاری رہا تو پورا قبیلہ قریش مسلمان ہو جائے گا لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ قرآن کے مقابلہ میں لغو باتوں اور قصے کہانیوں سے کام لیا جائے نیز قرآن کی تلاوت کی مجالس کے بالمقابل شعر گوئی، قصہ خوانی اور قدیم بادشاہوں کی من گھڑت داستانوں سے آراستہ مجالس منعقد کی جائیں اور لوگوں سے کہا جائے کہ آیئے ہمارے قصے، اشعار اور افسانے سنیئے جو کہ قرآن کی بہ نسبت زیادہ مزیدار ہیں۔ (قریش کے ایک سردار مالک بن نضر کا یہی وطیرہ تھا)۔ اس بارے میں قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ (فصّلت: ۲۶)

ترجمہ: ''اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو (جسے محمد ﷺ پڑھتے ہیں) اور شور وغل مچاؤ (قرآن کے پڑھے جانے کے وقت) تا کہ دوسرے لوگ اسے نہ سن پائیں۔''

یہ سب وہ غیر فوجی وسائل اور طریقے تھے جو قرآنی پیغام کی نشر واشاعت کی روک تھام کیلئے بروئے کار لائے گئے۔ آج بھی حق کی دعوت اور آواز کے مقابلے میں باطل کی تبلیغ کرنے والی کربناک آوازیں اسی طرح شور مچا رہی ہیں تا کہ لوگ حق کی آواز نہ سن سکیں، بس دونوں زمانوں کے طریقے کار میں اتنا فرق ہے کہ آج ذرائع ابلاغ کے تمام جدید ذرائع موجود ہیں جیسے ریڈیو، ٹیلی ویژن، سیٹلائٹ، انٹرنیٹ، پریس اور کم قیمت آسانی سے ملنے والا لٹریچر وغیرہ، یہ سب وسائل لوگوں کو حق کی دعوت سننے سے روکتے اور اس میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی مدینہ کے یہودی علماء نے یہ کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کریں اور وہ اس طرح کہ اسلام سے پہلے مدینہ کے لوگ یہود کو قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیونکہ ان کے پاس آسمانی مذہب کا علم تھا۔ ان کا وحی اور انبیاء سے تعلق تھا اور وہ گزشتہ پیغمبروں کے علم ومعرفت کے وارث تھے۔ یہود نے چاہا کہ مدینہ کے عربوں کے اس اعتقاد اور حسن ظن سے فائدہ اٹھائیں اور انہیں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات میں ڈالیں لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس غرض کیلئے ہم یوں کریں گے کہ صبح ایمان لے آئیں گے اور اسی دن شام کے وقت دوبارہ یہودیت کی طرف واپس آجائیں گے تو اس طرح کرنے سے عرب یہ گمان کریں گے کہ یہ اہل کتاب جو کہ آسمانی دین، وحی، نبوت، اور احکام الٰہیہ کی پہچان رکھتے ہیں اس دین سے واپس پھر گئے ہیں تو لگتا ہے کہ اسلام وہ حق دین نہیں ہے جس کا سابقہ کتابوں میں وعدہ کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کرنے سے مدینہ کے عرب ہم پر اعتماد کرکے ہمارے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام سے مرتد ہو جائینگے۔ یہاں بھی یہود نے اسلام کے خلاف ایک فکری ذریعہ ارتداد استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دھوکہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (آل عمران: ۷۲)

ترجمہ: ”اہل کتاب کے ایک گروہ نے (دوسرے سے) کہا: ”جو کلام مسلمانوں پر نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آؤ اور دن کے آخر حصے میں اس سے انکار کر دینا شاید اس طرح مسلمان (بھی اپنے دین سے) پھر جائیں۔“

یہی دھوکہ دہی آج بھی اسلام کے خلاف مختلف شکلوں میں بروئے کار لائی جارہی ہے، آج بھی اسلامی دنیا میں دشمن کے ذہنی غلاموں کا ایک بڑا لشکر اساتذہ، فلاسفہ، ڈاکٹروں، تجزیہ نگاروں، مضمون نگاروں، شاعروں، صنعت کاروں، اور صحافیوں کی شکل میں موجود ہے۔ جو مختلف طریقوں اور

مختلف وسائل کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلام سے متعلق شکوک وشبہات میں ڈالنا چاہتے ہیں اور لوگوں کے سامنے اسلام کا تعارف دہشگردی، ظالم اور رجعت پسند مذہب کے طور پر کراتے ہیں اور انہیں اسلامی عقائد اور احکامات کے بارے میں شکوک وشبہات میں ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ دن کے وقت تو لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو دھوکہ باز یہود کی طرح مسلمان دکھاتے ہیں لیکن در پردہ اسلام کیخلاف کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

نظریاتی جنگ کی ایک اور مثال وہ کوشش بھی ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہود نے کی تھی اور قریب تھا کہ اسکے ذریعے انصار قبائل کے درمیان ایک خونریز لڑائی شروع ہو جاتی۔ اور وہ اس طرح کہ ایک دن یہود کے ایک عمر رسیدہ سفید ریش شخص ''شاث بن قیس'' نے اوس اور خزرج کے مسلمانوں کو اس حال میں دیکھا کہ ایک ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے بات چیت میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے یہی دو قبیلے ایک دوسرے کیخلاف کئی دہائیوں تک مسلسل لڑتے رہے۔ جس کے نتیجے میں دونوں قبائل کے بہت سے لوگ مارے گئے تھے لیکن اسلام لاتے ہی گزشتہ تمام تر اختلافات اور رنجشیں بھول گئے۔ اور ان کے درمیان محبت اور بھائی چارے کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ شاث بن قیس کو یہ حالت راس نہ آئی اور اس مقصد کیلئے اس نے ایک خطرناک نظریاتی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ تھا کہ اس نے ایک نوجوان یہودی لڑکے کو یہ کہہ کر ان کے درمیان بٹھا دیا کہ انکی مجلس میں طویل مدت تک جاری رہنے والی 'بعاث' نامی لڑائی سے متعلق وہ اشعار پڑھے جو فریقین نے اس جنگ میں ایک دوسرے کیخلاف کہے تھے۔ اس طرح ان کے ذہنوں میں جنگ کی پرانی یادیں تازہ ہو جائینگی اور ایک بار پھر ایک دوسرے کیخلاف آمادۂ جنگ ہو جائینگے۔ 'شاث بن قیس' اپنی اس سازش اور نظریاتی حملے کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے فریقین پر یہ رحم ہوا کہ تلواریں ہاتھ میں لینے سے پہلے رسول اللہ ﷺ تک خبر پہنچ گئی چنانچہ آپ ﷺ اپنے مہاجر صحابہ کیساتھ آئے اور وعظ ونصیحت کے ذریعے دونوں کے درمیان ہونے والی

ممکنہ لڑائی کی آگ پر پانی ڈال کر ٹھنڈا کیا اور یہود کا فریب ناکام اور بے نتیجہ رہا۔ بالکل اسی طرح ہر زمانے میں کفار اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو عسکری جنگ کی بجائے نظریاتی لڑائی سے مغلوب کیا جائے، زمانے میں یہ جنگ مختلف جماعتوں کی شکل میں اور مختلف ناموں سے جاری رہی کبھی زنادقہ اور کبھی روافض کی شکل میں تو کبھی مرزائی اور قادیانیوں کی شکل میں یہاں تک کہ مغربی عیسائیوں نے مسلمانوں کیساتھ اپنی عسکری جنگوں میں مسلسل شکست کھانے کے بعد ایک خطرناک اسلحہ کے طور پر اس طریقہ جنگ کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ مغرب کی طرف سے مسلمانوں پر منظم طریقے سے نظریاتی جنگ مسلط کرنے کا منصوبہ فرانس کے بادشاہ "لوئیس" نے پیش کیا۔ یہ شخص ۱۲۵۰ء میں 'مصر' میں 'منصورہ' کی لڑائی میں فرانسیسی لشکر کی تباہی کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا اور بعد میں بطور فدیہ خطیر رقم ادا کر کے رہا ہوا، یہ بادشاہ اپنے ایام اسیری میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ مادی اور عسکری وسائل کی کمی کے باوجود مسلمان کافروں پر کیوں غلبہ پا لیتے ہیں؟ مسلسل سوچ و بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمانوں کی قوت کا سرچشمہ مادی وسائل نہیں بلکہ ان کا اپنے دین پر پکا ایمان، پختہ عقیدہ، اخلاق اور وہ معنوی صفات ہیں جو ان کے مذہب نے ان کو عطاء کی ہیں، لہٰذا جب تک یہ چیزیں ان میں برقرار رہیں گی اس وقت تک وہ اپنے مدمقابل پر غالب رہیں گے ۔ رہائی کے بعد جب یہ واپس فرانس پہنچا تو اس نے فرانس کے فوجی، سیاسی اور مذہبی لیڈروں اور دوسرے بااثر لوگوں کو جمع کیا اور اسلامی دنیا کے ساتھ جنگ کی نوعیت بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر کے دوران ان سے کہا:

> "اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمانوں کو شکست دو تو صرف اسلحہ کی جنگ پر اکتفا نہ کرنا کیونکہ اس جنگ میں تم نے ان کے سامنے ہر دفعہ شکست ہی کھائی ہے، تمہیں ان کے عقیدے کے خلاف لڑنا چاہئے کیونکہ ان کی فاتحانہ قوت کا راز ان کے عقیدے میں مضمر ہے۔"

اس کے بعد یورپ کی سیاسی، نظریاتی اور فوجی قیادت نے فیصلہ کیا کہ اب آئندہ کیلئے

مسلمانوں کے خلاف فوجی جنگ کے ساتھ ساتھ نظریاتی جنگ بھی شروع کردی جائے اور اس لڑائی کیلئے انہوں نے یورپ کے کلیساؤں، تعلیمی، سیاسی اور سفارتی مراکز میں اسلام، اسلامی فکر اور اسلامی تمدن سیکھنے اور ان پر تحقیق کرنے کے ادارے کھول دیئے، یہ مراکز بعد میں استشراقی علوم اور عیسائیت کی تبلیغ کی شکل میں منظر عام پر آئے، ان مراکز میں منظم طریقے سے اسلامی دنیا کی فکر اور تہذیب کی بناوٹ پر توجہ دی گئی اور مسلمانوں کی نئی نسل میں اپنی فکر کی تاثیر منتقل کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ اس نظریاتی انقلاب کو برپا کرنے کے نمایاں مراکز میں ہمارے سامنے تعلیمی ادارے مثلاً اسکول، کالجز، مغربی طرز کی مسلمان بچوں کی تربیت گاہیں، میڈیا کا موجودہ سیلاب، یورپ کی سیاسی سرگرمیاں اور سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان تمام مراکز اور اداروں کی کوششوں کے نتیجے میں ایک ایسی نسل تیار ہوگئی جن کے نام تو اسلامی ہیں لیکن ان کی زندگی کے تمام سیاسی، نظریاتی، اخلاقی، معاشرتی، عسکری، اقتصادی اور ادبی طور طریقے مغربی تصورات اور ترجیحات کی بنیادوں پر قائم ہیں اور ان کی ساری توجہ اس پر ہے کہ کسی طریقے سے اسلامی دنیا اور مسلمان امت کو مغربی خواہشات کے مطابق بنایا جائے چاہے اس مقصد کے حصول میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہانے کی ضرورت ہی کیوں نہ پیش آجائے۔

نظریاتی جنگ کے اہداف

مغرب نے مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کیلئے عسکری جنگ کیساتھ ساتھ نظریاتی جنگ کی ابتدا بھی کردی ہے اور اب بھی ہر سال اس پر کھربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں اور اب اس جنگ میں انہوں نے اپنے لاکھوں کارندے اور ماہرینِ فن مختلف نظریاتی، ثقافتی، سیاسی اور تعلیمی اداروں میں مصروف عمل کردیے ہیں، جن کو جدا جدا اور مختلف اہداف دیے جاتے ہیں، ذیل میں ہم انہیں اہداف کو ذکر کرنے جارہے ہیں۔

پہلا ہدف:

مسلمانوں کے دل و دماغ سے جہادی سوچ و فکر ختم کرنا

مغربی کفار یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک جہاد، ہجرت، شہادت اور قربانی جیسی عبادات مسلمانوں کی فکر کو تشکیل دینے میں مرکزی کردار ادا کرتی رہیں گی اس وقت تک یہ لوگ ذہنی طور پر ہر حملہ آور کے مقابلے کیلئے تیار رہیں گے اور اس کے لیے ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے لیکن اگر ایک بار ان کے دل اور ان کی فکر سے یہ چیزیں نظریاتی جنگ کے ذریعے نکال لی جائیں تو پھر یہ جنگی وسائل اور عسکری آلات سے خواہ کتنے ہی لیس ہو جائیں، دشمن سے مقابلے پر کبھی آمادہ نہیں ہونگے۔ آج یہی بات ان تمام مسلم ملکوں کے نوجوانوں اور افواج میں نظر آتی ہے جو مغرب کی فکری یلغار سے متاثر ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور میں مسلمان کم تعداد اور کمزور عسکری وسائل کے باوجود طاقتور دشمن کے مقابلے میں مردانگی سے لڑتے رہے اور اللہ کے فضل سے جنگیں بھی جیتتے رہے کیونکہ اس دور میں مسلمانوں میں مقابلہ کرنے کی باطنی قوت اجتماعی طور پر عروج پر تھی لیکن آج مسلم ممالک اپنے لاکھوں فوجیوں، اعلیٰ عسکری تجربات اور ترقی یافتہ جنگی وسائل کے باوجود دشمن سے لڑنے کی نہ صرف یہ کہ استطاعت نہیں رکھتے بلکہ اسے دہشت گردی سمجھتے ہیں، اسکے برعکس اپنی ہی قوم کے خلاف حملہ آور دشمن کی صف میں کھڑے ہونے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ نظریاتی جنگ نے ان سے مقابلہ کرنے کی معنوی قوت چھین لی۔ ان کی ایسے انداز میں تربیت کی گئی کہ ان کی رائے میں یہی بات مناسب ٹھہری کہ وہ دشمن کے مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنی قوم کے خلاف اس کے معاون کی حیثیت سے کام کریں۔

دوسرا ہدف:

اسلام، اسلامی طرز زندگی اور اسلامی طور طریقوں کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالنا

یورپی عیسائی چاہتا ہے کہ مسلمان اپنے دین، عقیدے، اور اخلاق، نظریاتی ترجیحات اور معاشرتی طور طریقوں میں ہماری طرح ہو جائیں اور ہر ہر چیز اور ہر ہر عمل میں اہل یورپ کی تقلید کریں، اس ہدف کے حاصل ہونے کے نتیجے میں ایک طرف تو اہل یورپ کیخلاف مسلمانوں کے دلوں میں نفرت اور بغض ختم ہو جائے گا اور وہ ان کے ان مکروہ منصوبوں کی مخالفت بھی نہیں کریں گے جن کے ذریعے وہ مسلم ملکوں پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف پوری مسلم دنیا مغربی مصنوعات کیلئے اوپن مارکیٹ میں تبدیل ہو جائے گی، کیونکہ مسلمانوں کی زندگی کی ضروریات جب اہل مغرب جیسی ہو جائیں گی تو چونکہ مسلمان وہ خود نہیں بنا سکتے یا اس طرح عمدہ معیار اور کم قیمت کیساتھ بازار میں پیش نہیں کر سکتے اس لیے اس طرح مسلمانوں کے بازار بھی اہل یورپ کی مصنوعات بکنے کیلئے کھلے رہیں گے۔

لیکن اسلامی شریعت، عقیدہ اور اسلامی تہذیب مغرب کے ان مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ہیں، کیونکہ دیندار مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنی زندگی کے تمام طور طریقے اور ضروریات اسلامی احکام کی روشنی میں اسلامی طور طریقوں کے مطابق بنانے چاہئیں تا کہ اسکے ذریعے مسلمانوں کا قومی اور مذہبی تشخص برقرار رہے۔ دین تو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہمارا سب کچھ اہل یورپ سے مختلف ہو کیونکہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا ہے اور ان کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اپنے دین کے قوانین اور طور طریقوں پر مضبوطی سے قائم رہیں لہذا اہل مغرب کی یہ بڑی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان یہ فرق اور دوری ختم ہو جائے اور نظریاتی جنگ کے ذریعے مسلمانوں کی نسل کے دل ودماغ میں اپنے دین، عقیدہ، اخلاق، تہذیب اور بلند قدر انسانی

ترجیحات کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے جائیں اور طرح طرح کے منفی پروپیگنڈوں کے ذریعے اسلام کی حقانیت اور شرافت کی افادیت کو مشکوک بنایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے نظریاتی جنگ کے تمام وسائل کو مصروف عمل کرنا شروع کر دیا، جیسے اسکول، کالج، جدید نصاب، ثقافت، میڈیا، اقتصادی کمپنیاں، تجزیہ نگار، شعراء اور مضمون نگار وغیرہ تاکہ اسلامی دنیا سیکولرازم، لبرل ازم (لادینیت) ماڈرن ازم، جمہوریت اور عالمگیریت کے ذریعے زندگی کے ہر رخ میں مغرب کی اطاعت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

تیسرا ہدف:

سچے اور حقیقی اسلام کو مغربی معاشرے تک پہنچنے سے روکنا

مغربی حکومتیں اور عیسائی کلیسائیں یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ دین اسلام انسانی فطرت اور عقل سلیم کے مطابق ہونے کی وجہ سے دنیا کے ہر خطے اور قوم میں مقبول ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسلام مکمل اور حقیقی شکل میں ان تک پہنچے۔ دنیا کے بہت سے ممالک جیسے ہندوستان، بنگال، برما، تھائی لینڈ، ملائشیا، فلپائن، برونائی اور وسطی افریقہ کے بہت سے ممالک کے لوگوں نے دعوت کے ذریعے اسلام قبول کیا ہے۔ ان ممالک میں کوئی بھی ایسا فاتح لشکر نہیں گیا جس نے عسکری فتح کر کے اسلام پھیلایا ہوا، بلکہ لوگوں نے اسلام کی حقانیت، افادیت اور عقلِ سلیم کے تقاضوں کے مطابق ہونے کی وجہ سے از خود اسے قبول کیا۔

مغربی عیسائی دنیا میں اب بھی اس بات کا خوف پھیلا ہوا ہے کہ اگر اسلام اپنی سچی اور حقیقی شکل میں اس مغربی معاشرے تک پہنچ گیا جو عیسائیت کے ظلم اور اس کی نامعقولیت سے تنگ آچکے ہیں تو بعید نہیں کہ یورپ کے عقلمند اور تعلیم یافتہ لوگ جو کہ حق کی تلاش میں ہیں اسے اپنالیں اور نصرانیت اور مادیت کو یکسر چھوڑ بیٹھیں گے لہٰذا ایسی صورت میں اس طلاطم خیز طوفان کا راستہ روکنا ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا چنانچہ اب بھی یورپ کے بہت سے لوگ اسلام کے بارے میں مطالعہ اور تحقیق میں

لگے ہوئے ہیں اور ہر سال ہزاروں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ لہذا لوگوں تک سچا اور مکمل اسلام پہنچنے کی روک تھام کیلئے یورپ اور امریکہ نے درجہ ذیل اقدامات کئے ہیں۔

الف:

مغربی حکومتیں اور کلیسائیں اس کوشش میں ہیں کہ مغربی معاشرے کے سامنے اسلام کو مسخ اور تحریف شدہ شکل میں پیش کریں۔ ان کے سامنے اسلام کا تعارف قدیم زمانے کے ایک ایسے دین کے طور پر کیا جائے جو تلوار، قتل، جنگ، ہاتھ پاؤں کاٹنے اور لوگوں پر مذہبی تسلط جمانے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔ اسمیں نہ تو انسانی زندگی گزارنے کیلئے کوئی نظام اور لائحہ عمل ہے نہ ترقی کرنے کا تصور ہے، اسلام نہ تو صلح پر مبنی زندگی چاہتا ہے اور نہ ہی اس میں تمدن ہے اور نہ انسانی ہمدردی کا تصور اور مزید یہ کہ اسلام انسانی زندگی کے فطری تقاضوں کے یکسر مخالف دین ہے جو کہ معاشرہ کی زندگی میں تبدیلی لانے کیلئے عقل، علم، سیرت اور مذہبی اطمینان کے فطری وسائل کو بروئے کار نہیں لاتا بلکہ اسکے لئے تلوار، بندوق اور ڈنڈے کا زور استعمال کرتا ہے۔

مغربی میڈیا اور انکی سیاسی و دینی قیادت نے اسلام کے خلاف اس طرح کے مختلف زہریلے پروپیگنڈوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اور اس پر ہر سال اربوں ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں تاکہ مغربی معاشرے کو اسلام سے متنفر کر کے اسلام قبول کرنے سے روکا جائے۔

ب:

یورپ کی سیاسی، نظریاتی اور دینی قیادت یہ کوشش کر رہی ہے کہ اپنے سیاسی، اقتصادی، عسکری اور بین الاقوامی اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے اسلامی ممالک کی حکومتوں کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ اپنے ملکوں میں ایسا تعلیمی نصاب رائج کریں جسمیں اسلام حقیقی شکل میں موجود نہ ہو، علماء، مبلغین، دینی مدارس، دینی جماعتوں، پریس اور اسی طرح مختلف اداروں کو جو کہ اسلامی نشر و اشاعت میں مصروف کار ہیں، شدید دباؤ میں رکھا جائے اور ان کے اداروں کو بند کیا جائے، شخصیات کو

قتل کیا جائے اور انہیں اتنا کمزور اور اپنی ذات میں مصروف رکھا جائے کہ وہ مغرب تک صحیح اسلام پہنچانے سے عاجز ہو جائیں، ان کے مالی وسائل، مادی اور معنوی ذرائع کو مختلف عنوانات اور بہانوں کے ذریعے ان سے چھین کر باہر نکالا جائے اور بالآخر انہیں اپنے ہی ملکوں میں فقر و ذلت اور مشکلات کیساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے، اسلامی تنظیموں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر انہیں غیر مؤثر کیا جائے اور یہ ساری کوششیں اس وقت تک جاری رہیں کہ جب تک اسلام کی نشر و اشاعت کرنے والی شخصیات اور ادارے بالکل بے بس نہ ہو جائیں، اسکے بالمقابل عام لوگوں کے سامنے اسلام کا تعارف ایک ایسے دین کے طور پر کیا جائے جو یا تو بالکل اسلام ہی نہ ہو یا پھر اسلام کی ایک مسخ شدہ شکل ہو جس سے فطرت سلیمہ نفرت کرتی ہو۔

ج:

مغرب اگر ایک طرف مغربی معاشرے تک سچے اور حقیقی اسلام پہنچنے کی روک تھام کرتا ہے تو دوسری طرف صرف ان گروہوں، تنظیموں اور اداروں کو یورپ میں مؤثر طریقے سے کام کرنے کی اجازت دیتا ہے جو تحریف شدہ شکل میں اسلام کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ اور خود بھی اسلامی معاشرے میں مرتد اور کفریہ جماعتوں کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ جیسے قادیانی فرقہ، بہائی جماعت اور مشرک جعلی صوفیاء وغیرہ یا پھر ان جماعتوں کو اجازت دیتا ہے جو حقیقی اسلام کو لوگوں کے سامنے ناقص اور ادھوری شکل میں پیش کرتی ہیں، جنہوں نے اپنی دعوت کے نصاب سے اسلام اور اسکی ترجیحات، فرائض اور واجبات، جہاد، ولاء اور براء (اللہ کے لئے دوستی اور اللہ ہی کے لئے دشمنی) کا عقیدہ، اسلامی نظام، اسلام کی حاکمیت، فتنہ وفساد کا مقابلہ، بقدر ضرورت شرعی علم، جہادی جماعتوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کے ساتھ مالی تعاون جیسے ضروری امور بلکہ ان کو دعاء دینے تک کو صرف اسلیئے نکال دیا ہے کہ کہیں کفار ان سے ناراض نہ ہو جائیں اور اپنے ممالک میں سفر کرنے کیلئے انہیں ویزوں سے محروم نہ کردیں۔ اگر یہ لوگ اپنی اسی جدوجہد کو لے کر مجاہدین کے پہلو بہ پہلو کھڑے

ہو جائیں اور مجاہدین اسلام کی کمر مضبوط کریں تو یقیناً وہ صرف دس سال کے عرصہ میں اسلامی دعوت پھیلانے کیلئے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو یہ جماعتیں ایک صدی میں بھی نہیں کر سکتیں۔ یورپ اسی لئے تو ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی نہیں لگاتا کیونکہ ان کی دعوت سے مغربی نظام، تسلط جمانے کے منصوبے، کفریہ تہذیب اور عالمی حیثیت کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچتا۔ مزید برآں اہل مغرب کٹھ پتلی مسلم حکمرانوں سے اسلامی ممالک میں عیسائیت کے پرچار کی اجازت کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ اور اس بات کا خطرہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مکّار مغرب اس قسم کی سادہ لوح جماعتوں سے جہاد اور مجاہدین کے خلاف بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔

مذکورہ تمام طریقے مجموعی شکل میں نظریاتی جنگ کے مقاصد تک پہنچنے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

چوتھا ہدف:

اسلامی ممالک میں نااہل اور غیروں کے ہاتھوں پلے ہوئے افراد کو قیادت سونپنا

نظریاتی جنگ کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اسلامی ممالک اور مسلمان معاشرے کو نیک قیادت سے محروم کیا جائے اور ان کے متبادل نااہل اور غیروں کی گود میں پلی ہوئی قیادتوں کو متعارف کرایا جائے اور نئی نسل کے سامنے انہیں نمونے کے طور پر پیش کیا جائے۔ اہل یورپ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ جب تک اسلامی ملکوں میں مخلص، شریف، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور امت مسلمہ کے وفادار لوگوں کی قیادت موجود رہے گی اس وقت تک اسلامی دنیا میں مغرب کی خواہشات ہرگز پوری نہیں ہو سکتیں اسی لئے یورپ مسلسل اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ مسلمانوں کے مخلص حکمرانوں کو یا تو غائب کر دیا جائے یا قید کر دیا جائے یا من گھڑت الزامات لگا کر بدنام کیا جائے اور نتیجۃً زمام کار ان کے ہاتھ سے لے لی جائے۔ اس مقصد کیلئے وہ طرح طرح کے منصوبے بناتے اور پروپیگنڈے کرتے ہیں تاکہ معاشرے میں انکی مقبولیت ختم ہو جائے، کبھی ان پر تہمتیں باندھتے ہیں تو کبھی ان کے پیروکاروں اور

ساتھیوں کو گروہ بندی اور تفرقہ بازی کی طرف مائل کرتے ہیں اور کبھی انہیں گمراہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی انہیں دھوکہ اور فریب پر مشتمل ظاہری مصالحت کی طرف دعوت دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف مخلص قیادت کی بجائے ان اشخاص کی رہنمائی اور پشت پناہی کرتے ہیں جو یورپ کے پیروکار ہوتے ہیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان معاشرے کو بھی مغرب کی راہ پر چلائیں۔ انہی جیسے مغرب زدہ قائدین کو اپنے میڈیا میں ابھارتے ہیں اور ان کے لیے مختلف محاذ ہموار کرتے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اسلامی ممالک میں نااہل قیادت سے کام لینے کے مختلف محاذ

ا۔ دینی محاذ

دینی محاذ میں مخلص علماء، مبلغین اور اصلاح پسند لوگوں کو بالکل ختم کیا جاتا ہے۔ یا ان کا میدانِ عمل تنگ کر کے انکی سرگرمیاں محدود کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے بالمقابل ان علماء، مفتیان، خطباء، درباری ملاؤں اور ایسے پیروکاروں کو سامنے لایا جاتا ہے جو مغربی مقاصد کیلئے کام کرتے ہیں، جمہوریت کو انسانی زندگی کیلئے ایک نظام کی حیثیت سے مانتے ہیں اور سیکولرازم کو زندگی کیلئے بنیاد اور عقیدے کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ملکی خزانے سے وظائف دے جاتے ہیں، انکی دعوت کو مؤثر بنانے کیلئے میڈیا ان کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کے سامنے وہ حقیقی اسلام جسے اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے ہیں، مسخ شدہ اور معاشرے میں عملی طور پر مفلوج شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اسلام کا تعارف ایک ایسے دین کے طور پر کرایا جاتا ہے جسے حکومت اور معاشرتی نظام سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ وہ اسلام ہے جسے امریکہ چاہتا ہے۔

۲۔ سیاسی محاذ

سیاسی محاذ میں مسلمانوں کی ایسی سیاسی قیادت کا راستہ روکا جاتا ہے جو زمین پر اللہ کی مخلوق

کیلئے اللہ کا نظام رائج کرنے کی خواہاں ہو اور ان کی جگہ خیانت گر، جھوٹے، بزدل، بکے ہوئے، کفر کیساتھ گٹھ جوڑ کرنے والی منافق شخصیات کو قیادت سونپی جاتی ہے تاکہ ان کے ذریعے اسلامی نظام کے نفاذ کو روکا جائے اور مسلم ممالک ہمیشہ کیلئے مغرب کے سیاسی غلام رہیں۔

۳۔ عسکری محاذ

اس محاذ میں بھی مغرب اسلامی ممالک میں انہی فوجی افسروں کو آگے لاتا ہے جنکی فکر اور سوچ انکی تربیت کی وجہ سے اسلام کے خلاف ہو چکی ہو اور پھر انہی مسلط فوجیوں کے ہاتھوں اسلامی تحریکوں اور اسلام پسند لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے۔

۴۔ نظریاتی محاذ

نظریاتی محاذ میں بھی یورپ اسلامی دنیا میں موجود ان اشخاص اور اداروں کی پشت پناہی کرتا ہے جو مغربی جمہوریت، لبرل ازم، سیکولر ازم، ہیومن ازم اور دوسرے غیر اسلامی نظریات اور افکار کی نشر و اشاعت کیلئے کام کرتے ہیں، یورپ ایسے لوگوں کو فنڈ دیتا ہے، ان کے لئے سیاسی جماعتیں تشکیل دیتا ہے اور انہیں قدرت و اختیار کے منصب تک پہنچا کر ان کے ذریعے مسلمان مفکرین کی راہ روکتا ہے۔

۵۔ اجتماعی محاذ

اس محاذ میں مغرب اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ پورے معاشرے میں عمومی طور پر اور نوجوانوں کے طبقے میں خاص طور پر ان بے پروا، رذیل، گرے پڑے اور باطنی صفات سے بے بہرہ افراد جیسا کہ میراثی، گویئے، ناچنے والے، کرکٹر اور فلمی اداکاروں کو اچھے اچھے اور دلنشین نام دے کر نمونے اور ماڈل کے طور پر پیش کرے۔ اس غرض کیلئے میڈیا کے ذریعے معاشرے میں انکی حیثیت کو اتنا اونچا کر کے دکھایا جاتا ہے کہ لوگ انکی تقلید کرنے لگتے ہیں۔

اسی طرح ان مشکوک، بدذات اور باہر سے برآمد شدہ افراد کیلئے لوگوں میں خدمات انجام دینے کی غرض سے رفاہی ادارے بنائے جاتے ہیں اور یورپ کے بڑے بڑے رفاہی ادارے انکو اموال اور دیگر وسائل فراہم کرتے ہیں تا کہ مسلم معاشرے میں یہ لوگ خیر خواہ اور ہمہ گیر شخصیات کی حیثیت سے ابھریں اور مقبول ہوں لیکن اسکے بالمقابل تمام اسلامی رفاہی اداروں کی سرگرمیوں کا راستہ روکا جاتا ہے۔ اور ان کے کارکنان کو طرح طرح کے دباؤ اور پابندیوں کے ذریعے اس پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو اپنی سرگرمیاں بالکل چھوڑ دیں یا پھر انہیں انتہائی محدود کر دیں۔ یہ سب کچھ اسلئے کیا جاتا ہے کہ معاشرے میں حقیقی اور مخلص قیادتوں کا راستہ روکا جائے اور انکی جگہ نااہل اور غیروں کی گود میں پلے ہوئے لوگوں کو زمام کار سونپی جائے تاکہ موقع آنے پر ان سے مسلم معاشرے میں مغربی مقاصد کیلئے کام لیا جاسکے اور اسلام کو ایک حاکمانہ نظام کی حیثیت سے ابھرنے سے روکا جاسکے، یورپ کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے۔

نظریاتی جنگ کے نقصانات

یہ جنگ عسکری جنگ کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ یورپ اپنی عسکری جنگوں میں صرف معدنیات چوری کرتا تھا۔ لوگوں کے گھر ویران کرتا اور انہیں قتل کرتا تھا۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے دلوں میں ان کی نفرت بڑھانے کا سبب بنتا تھا۔ اور وہ اپنے دین پر اور بھی مضبوط ہو جاتے تھے اور صدیوں تک لڑائی جاری رہنے کے باوجود بھی ہمہ وقت ان کے ساتھ جنگ پر آمادہ رہتے تھے لیکن نظریاتی جنگ کا نقصان یہ ہوا کہ اس نے مسلمانوں کو مغرب کی زہریلی تہذیب کا خوگر بنا دیا۔ مسلمانوں میں لادین نظریات، بے دین ثقافت اور گرے پڑے اخلاق پھیلا دئے، مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلامی اقدار سے ایسے انجان کر دیا کہ انکی نظر میں اسلامی شریعت، عقائد، تاریخ اور طرز زندگی بالکل اجنبی معلوم ہونے لگے، ہر معاملے میں مغربی فلسفے پر اور مغربی ترجیحات پر یقین رکھتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ نظریاتی جنگ نے ان کے قلبی احساسات کو ایسی شکست دی کہ اب انکی نظر

میں مغرب کی ہر بات حق اور درست دکھائی دیتی ہے اور اسے اپنانے کو اپنی ترقی اور تہذیب سمجھتے ہیں اور جو بات بھی یورپی نظریات اور طرز زندگی کیخلاف ہو، اُسے رجعت پسندی، بے وقوفی اور ترقی سے محرومی سمجھتے ہیں۔

یورپ نے نظریاتی جنگ کے ذریعہ اسلامی ممالک میں حکومتیں اور اختیارات ایک ایسی نسل کے ہاتھوں میں دیے ہیں جو کہ اہل مغرب کی غاصب قوتوں کیلئے محفوظ ٹھکانے ثابت ہوتے ہیں، اس نسل کے افکار، نظریات، اخلاق، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی فلسفوں اور سوچوں میں اور قابض عیسائیوں کے نظریات وافکار میں کوئی فرق نہیں۔ مسلمانوں کو تکلیف دینے میں یہ لوگ ان نصرانیوں سے بھی زیادہ سخت دل ہوتے ہیں۔

نظریاتی جنگ میں مسلمانوں کی اس شکست خوردہ نسل نے اسلام اور امت مسلمہ کو اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ چنگیز خان کے سانحہ کے بعد کبھی انہیں اس پیمانے پر نقصان نہیں پہنچایا گیا، اس ذہنی غلام نسل نے مسلمانوں کی زندگی کے اسلامی طور طریقوں اور ترجیحات کو انکی نظروں میں اجنبی بنا دیا جسکی مزید تفصیل اس کتاب کے عنوان "اغیار کی ترجیحات" کے ذیل میں آئے گی۔ (انشاء اللہ)

نظریاتی اور عسکری جنگ میں فرق

ان دونوں کے درمیان کئی اہم فرق موجود ہیں۔ جنکو بغور دیکھ کر نظریاتی جنگ کی اہمیت اور اسکے بھیانک نقصانات معلوم ہو جاتے ہیں ان میں چند اہم فرق یہ ہیں:

۱۔ عسکری جنگ کھلم کھلا اور نظریاتی جنگ خفیہ طور پر جاری رہتی ہے

جب بھی کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر عسکری حملہ کرتا ہے تو اس ملک کے تمام لوگوں کو حملہ آور کی دخل اندازی کا علم ہو جاتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے حملہ آور کے مقابلے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیتے ہیں۔ عسکری جنگ کا بگل پوری ریاست میں یکبارگی بجتا ہے جسکے بعد نوجوانوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں، سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں میں اپنے دفاع اور دشمن کیساتھ مزاحمت کا

شعور جاگ اٹھتا ہے اس حال میں یا تو وہ جنگ کرتے ہیں یا مصلحت کو دیکھ کر جنگ زدہ علاقے سے کسی اور جگہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ لیکن نظریاتی جنگ عسکری جنگ کے برعکس اتنے مخفی انداز سے جاری رہتی ہے کہ عوام الناس میں سے بہت کم تعداد کو اسکا شعور اور اسکے خطرات کا علم ہوتا ہے کیونکہ یہ لڑائی ظاہری تباہی، توپ، ٹینک اور بارود کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ اسکول و کالج کے تعلیمی نصاب، کلچر اور رسائل و اخبارات کے ذریعہ اور سیاسی نظم وضبط، اقتصادی سرگرمیوں، کھیل کود اور جدید فیشن کی شکلوں میں ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو اس جنگ کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اسکے خطرناک نتائج اور اثرات ملک وملت کی طرز زندگی کو یکسر بدل چکے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں میں سے بہت ہی کم لوگوں کو نظریاتی یلغار کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس کے مقابلے کیلئے اٹھتے ہیں، ایسے لوگ عام مسلمانوں کے سامنے کتنا ہی زور سے چیختے ہوئے یہ آواز اٹھائیں کہ ایک بہت بڑے طوفان کا ریلا ملک وملت کو بہانے کے لیے آرہا ہے اس سے اپنی حفاظت کرو لیکن لوگ اس وقت تک ان کی بات پر بھروسہ نہیں کرتے جب تک وہ طوفان ان کو بہا کر نہ لے جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اسلامی ممالک میں عسکری جنگ کی بجائے نظریاتی جنگ کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ اس جنگ میں ان کے مدمقابل مزاحمت کا میدان خالی رہتا ہے۔

۲۔ عسکری جنگ میں مدمقابل فوجی ہوتے ہیں جبکہ نظریاتی جنگ میں نہتے عوام

عسکری لڑائی دو ایسے فریقین کے درمیان پیش آتی ہے جن میں ہر ایک مسلح ہوتا ہے اگر ایک فریق حملہ کر سکتا ہے تو دوسرا اس سے دفاع کی طاقت رکھتا ہے، ایک طرف ٹینک ہوتا ہے تو دوسرے کے پاس اس کے توڑ کے لیے مائن ہوتا ہے، ایک کے پاس جنگی جہاز ہوتے ہیں تو دوسرے کے پاس اس سے دفاع کیلئے راکٹ اور میزائل ہوتے ہیں، ایک فریق حملہ کر کے اقدام کرتا ہے تو دوسرا راستے میں اس کیلئے گھات میں بیٹھتا ہے، الغرض دونوں کو حسبِ استطاعت صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔

لیکن نظریاتی جنگ میں ایسے تمام لوگوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے جو دفاع کی صلاحیت اور اسکے

وسائل سے عاری ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظریاتی جنگ میں ایک فریق کے پاس اسکول، کالج، نصاب تعلیم استاذ اور مادی وسائل ہوتے ہیں جن کو وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے تو دوسری طرف عام لوگ ان تمام چیزوں سے تہی دست و تہی دامن ہوتے ہیں۔

ان کے پاس سوائے اسکے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو بشمول اولاد کے ان اداروں کے سپرد کر دیں۔ ایسے ہی اگر ایک فریق کے پاس ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات، رسائل، سینما، تھیٹر، فلمی کمپنیاں، میڈیا چلانے والے ماہرین ہیں تو مدمقابل جو کہ عام لوگ ہیں یہ وسائل بالکل نہیں رکھتے ان کے پاس بھی سوائے اسکے اور کوئی چارہ نہیں کہ دشمن کا پیغام سن کر اس کو من وعن قبول کر لیں اور اس سے اثر انداز ہوں کیونکہ وہ مقابلہ کرنے میں مذکورہ بالا وسائل سے محروم ہوتے ہیں۔ اس غیر متوازن نظریاتی لڑائی میں ایک طرف ماہر، مکار، چرب زبان چکنی چپڑی باتیں کرنے والا، اور لوگوں کی نفسیات سمجھنے والا حملہ آور ہوتا ہے تو دوسری طرف ان پڑھ، غریب بے بس بچے اور عورتیں، کم عمر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہوتے ہیں، جو بہت جلد اور آسانی کیساتھ انکی نشر و اشاعت سے متاثر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ دشمن کے دلچسپ پروگراموں، تبلیغات اور نشریات میں پیش کئے جانے والے مضامین کا صحیح تجزیہ اور ان پر صحیح تبصرہ کر سکیں، اسی لئے یورپ نے اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ محاذ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں کھولا ہے جو اپنی ذات، اپنے عقیدے، فکر اور زندگی کے رسم و رواج سے درست فائدہ اٹھانے کی بالکل قدرت نہیں رکھتے۔

۳۔ عسکری جنگ میں زمین پر قبضہ ہوتا ہے جبکہ نظریاتی جنگ میں عقل وفکر پر

عسکری جنگ میں دشمن ایک ملک کی زمین پر قبضہ کرتا ہے جسے حملہ اور قبضے سے چھڑانا بآسانی ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی دنیا کے بہت سے ممالک یورپ نے قبضہ کئے تھے لیکن اب وہ ظاہری طور پر ان کے تسلط سے آزاد ہیں۔ بالکل ایسے ہی افغانستان کے ساتھ بھی ہوا کہ انگریزوں سے آزاد ہوا پھر روسیوں نے اپنا قبضہ جما لیا جب ان سے بھی آزاد ہوا تو امریکہ نے اپنی قسمت آزمائی کے لیے اپنا

تسلط جما لیا لیکن الحمدللہ اب بہت سے علاقے ان کے ظاہری تسلط سے بھی آزاد ہو چکے ہیں۔ لیکن نظریاتی جنگ میں دشمن یہ کوشش کرتا ہے کہ مسلمانوں کی فکر، ان کی عقل، عقیدے اور رسم ورواج پر قبضہ کرلے اور جب کسی کی فکر، عقل اور عقیدے پر دوسرے کا قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنی زمین کو دوسرے کے تسلط سے آزاد کرانے کا بالکل نہیں سوچتا اور قابض دشمن کو اپنا دوست، اسکی تخریب کو تعمیر، غلامی کو آزادی اور ذلت کو عزت سمجھتا ہے۔ یورپ کے قابضین گزشتہ دو سالوں کے عرصہ میں اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ اسلامی دنیا کے بہت سے عام لوگوں اور خاص طور پر حکمران طبقے کے ذہن اور عقل کو اپنے قبضہ میں لے لیں۔ انہوں نے مغربی فکر، عقیدے اور مادہ پرستی کی تہذیب کی روشنی میں انکی تربیت کی اور انہیں اس پر مطمئن کر دیا کہ اسلام کی حاکمیت کی بہ نسبت کفر کی حاکمیت اور اسکے قوانین کو نافذ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اسی وجہ سے وہ تمام اسلامی ممالک جو بظاہر تو یورپ کے تسلط سے آزاد ہو گئے مگر ان میں اب تک مغرب کے تعلیم یافتہ ایجنٹ حکومتیں چلا رہے ہیں، اسی لیے آزادی کے بعد سے آج تک ان ممالک میں کبھی بھی اسلام نافذ نہ ہوا۔ یہ مغرب زدہ طبقہ نہ صرف یہ کہ اسلامی نظام نافذ نہیں کرتا بلکہ اسلامی نظام کے نافذ ہونے کے لئے اٹھنے والی ہر آواز بھی ان کی اصطلاح میں جرم ہے۔ جو لوگ بھی اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں انہیں یا تو قتل کر دیا جاتا ہے، یا قید و بند کی سختیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے یا پھر ان کی دعوت اور سرگرمیوں پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یورپ کی کامیاب نظریاتی جنگ کے نتیجے میں یہ تمام اقدامات ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کے نام مسلمانوں کی طرح ہی ہوتے ہیں لیکن ان کی فکر و سوچ پر دشمن کا قبضہ ہوتا ہے۔

زمین آزاد کرانا تو آسان ہے لیکن ایسے دل و دماغ کو آزاد کرانا بہت مشکل ہے جن پر اغیار کا نظریاتی قبضہ ہو چکا ہو ہم نے افغانی کمیونسٹوں کو عسکری شکست تو دیدی لیکن چند گنے چنے کمیونسٹوں کو کمیونیزم سے علانیہ توبہ کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ وہی کمیونسٹ طبقہ جو کل بھی یورپی نظریات کو ماننے والا

تھا، آج بھی وہی طبقہ دوسرے طریقے سے یورپ کے ملحدانہ نظریات کا علم بردار ہے۔ یہی راز ہے کہ مغرب اس بات کی انتہائی کوشش کرتا ہے کہ مسلمانوں کی زمین کو چھوڑ کر انکی فکر پر تسلط جمائے کیونکہ یہ تسلط ایک طرف تو بے خطر طریقے سے حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف اسکے نتائج بھی دشمن کے حق میں نکلتے ہیں اور بہت طویل عرصہ تک اسلامی دنیا مغرب کے سیاسی اور نظریاتی تسلط کے زیرِ اثر رہتی ہے۔

۴۔ عسکری جنگ کے نتیجے میں جنگی وسائل اور آبادیاں تباہ ہوتی ہیں جبکہ نظریاتی جنگ میں ایمان، عقیدہ اور ان پر مبنی پختہ عزائم کو نشانہ بنایا جاتا ہے

عسکری جنگ میں دشمن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے جنگی وسائل، افواج، عسکری اور حکومتی اداروں کی تعمیرات کو تباہ کرے اور انہیں توپوں کا نشانہ بنائے یا انہیں جلا ڈالے یہاں تک کہ فوجی قوت کو دفاع اور نقل و حرکت سے بھی بے بس کر دے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگی وسائل جتنے بھی تباہ یا ناکارہ ہو جائیں جب تک دلوں میں مزاحمت اور دفاع کا پکا ارادہ موجود ہو اللہ تعالیٰ کی مدد پر ایمان اور یقین موجود ہو اور مسلمان فوجیوں کے دلوں میں فتح حاصل کرنے کے معنوی اسباب موجود ہوں مثلاً ایمان تقویٰ، احساس ذمہ داری، امیر کی اطاعت اور اجتماعیت کا احساس، تو ایسی صورت میں فوجی وسائل خواہ کتنے ہی کم یا کمزور ہوں پھر بھی وہ دشمن کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے، کمزور ہونے کی صورت میں ان کے سامنے تسلیم ہونے کی بجائے وقتی اور عارضی پسپائی کو ترجیح دیتے ہیں یہاں تک کہ کل کی لڑائی کیلئے دوبارہ تیاری کر کے میدان میں لوٹ آتے ہیں لیکن کبھی بھی اسلحہ ان کے حوالہ نہیں کرتے۔

لیکن نظریاتی جنگ میں دشمن کے ساتھ مزاحمت کے مذکورہ بالا تمام معنوی عوامل ختم کر دئے جاتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مسلم ممالک جو مغرب کے مقابلے میں نظریاتی شکست سے دوچار ہوئے، بڑی تعداد میں جنگی وسائل حتی کہ ایٹم بم موجود ہونے کے باوجود بھی دشمن کے مقابلے میں آنے

کی صلاحیت نہیں رکھتے اور انہوں نے جنگ شروع ہونے کے خطرے سے ہی اسلام دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا اور یہ ممالک سب کچھ ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ انتہائی بے شرمی کے ساتھ اپنے دین اور ملت کے خلاف دشمن کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں خوش کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں جو دشمن چاہتا ہے۔ نظریاتی جنگ میں شکست کی صورت میں بڑی مقدار میں اسلحہ، جنگی مہارت، بھاری تعداد میں فوج، کثیر مادی وسائل اور مضبوط معیشت میں سے کوئی بھی چیز دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی دکھانے اور ان سے دفاع یا مقابلہ کرنے کے لیے فائدہ نہیں دیتی۔ جب تک اسلامی جنگجوؤں کے دل میں ایمان، اللہ کا خوف، اسلام کی حقانیت پر اعتماد اور پکا یقین اور کفر سے نفرت موجود نہ ہو اس وقت تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مسلمان فوجوں کو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم کرنے کے لئے مغرب نے تمام مسلم ممالک کی مسلمان فوجوں، دفاعی قوتوں اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں کی تربیت ایسے طریقے سے کی ہے کہ وہ اپنے دین، عقیدے اور اس اسلامی روح سے محروم ہو جائیں جو کہ نصرت خداوندی کے معنوی عوامل میں سے ہیں۔

یہ اسی بے دین تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج تقریباً تمام اسلامی ممالک کی افواج صلیب کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم مذہب قوموں کے خلاف برسرپیکار ہیں کیونکہ نظریاتی جنگ نے ان کا ایمان، عقیدہ اور دینی شعور یکسر ختم کر دیا ہے۔

۵۔ عسکری جنگ کی تباہ کاریوں کا ازالہ تھوڑے وقت میں ہو جاتا ہے جبکہ نظریاتی جنگ سے ہونے والی تخریب کی تعمیر کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں

عسکری جنگ میں زیادہ سے زیادہ شہر، گاؤں، پل، سڑکیں اور دوسری عام تنصیبات تباہ ہوتی ہیں، جن کو دس پندرہ سال کے عرصہ میں پہلے سے زیادہ بہتر بنانا ممکن ہوتا ہے کیونکہ ٹیکنالوجی دن بدن

ترقی کر رہی ہے اور تعمیرات کے لئے نئے سے نئے وسائل اور میٹیریل (مواد) ایجاد ہو رہے ہیں ساتھ ساتھ صنعتی تجربات میں ترقی ہو رہی ہے۔ لہذا ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تباہ شدہ عمارتیں اور تنصیبات پہلے سے زیادہ مضبوط اور شاندار بنائی جاسکتی ہیں لیکن وہ ذہنی افکار، عقائد اور اخلاق جو نظریاتی جنگ کے نتیجے میں یکسر بدل چکے ہوں۔ ان کی از سر نو اصلاح کرنے اور ان کو حق کے میزان کے مطابق کرنے کیلئے لاتعداد نشریات واشاعت اور تعلیم وتربیت کے ایسے نصاب جن کو انتہائی قابل اور ماہر اساتذہ اور امت کے مصلحین نے ترتیب دیا ہو، کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے کوئی مختصر نہیں بلکہ ایک طویل عرصہ کی مسلسل محنت اور جدو جہد درکار ہوتی ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک انگریزوں سے آزاد ہوئے لیکن برسہا برس گذرنے کے باوجود انگریزیت سے آزاد نہ ہوسکے۔ اسی طرح بہت سے ممالک فرانس سے تو آزاد ہوگئے لیکن ان کے باشندوں کے افکار ونظریات اور طرز زندگی آدھی صدی گذرنے کے باوجود بھی فرانس کی ثقافت اور ان کی ترجیحات سے آزاد نہ ہوئی۔

ایسے ہی کئی اسلامی ممالک روس سے آزاد ہوئے لیکن ان کے باشندوں کی زندگی اور نظام سلطنت میں اسلام کو اب تک جگہ نہ مل سکی اور اب تک ان کے ادارے اُسی روسی نظام کے ملحدانہ فلسفہ کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ اور مستقبل قریب میں اسکا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان ممالک میں حقیقی اسلام کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہوگی اور لوگوں کی معاشرتی زندگی اسلام کا عملی نمونہ بنے گی، اس مقصد کے حاصل ہونے میں ممکن ہے کہ صدیاں بیت جائیں، یہ سب کچھ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نظریاتی جنگ کی تخریب عسکری جنگ کی تباہ کاریوں کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک اور دیرپا ہوتی ہے۔

نظریاتی اور عسکری جنگ کے درمیان کچھ اور اعتبار سے بھی فرق پائے جاتے ہیں لیکن بحث کے زیادہ طویل ہونے کے خوف سے مذکورہ چند مثالوں پر اکتفاء کیا گیا ہے جو کہ عنوان کی تشریح کیلئے یقیناً کافی ہے۔

نظریاتی جنگ علامہ اقبال رحمہ اللہ کی نظر میں

مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان نظریاتی جنگ کے بارے میں علامہ اقبال کی نظر اور رائے اس وجہ سے قابل اعتبار ہے کہ وہ اس جنگ کے درمیان سے ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے اس جنگ کے تمام مراحل کو بذات خود دیکھا تھا۔ اسکی آگ کا مشاہدہ کیا تھا بلکہ انہوں نے جنگ میں مسلمانوں کے مدمقابل جنگجوؤں کیساتھ شب و روز بھی گزارے تھے اور وہ اس جنگ کی منصوبہ بندی کرنے والوں کی نیتوں اور ارادوں پر وہیں سے باخبر ہوئے تھے اور اس کو پھر اپنے اشعار اور نظریاتی کلام میں جگہ دی اور اپنی ملت کو اس نظریاتی جنگ کے خطرات اور نقصانات سے آگاہ کیا۔

اقبالؒ نے پہلے اپنے ان ہم وطنوں سے استفادہ کیا تھا جو مغربی فلاسفہ سے متاثر تھے، ان کے نظریات کو جانا پھر اسکے بعد یورپ گئے۔

وہاں یورپ کے نظریاتی رہنماؤں اور فلاسفہ کے ساتھ وقت گذارا اور اسلام کی روشنی میں ان کے نظریات کو پرکھا۔ انہوں نے یورپ کے معاشرے میں رہ کر بہت کچھ سیکھا اور پڑھا لیکن ان کے جال میں نہیں پھنسے۔ ان کے اپنے بقول وہ وہاں سے آکر ایسا محسوس کر رہے تھے کہ جیسے ابراھیم علیہ السلام آتشِ نمرود سے صحیح سلامت باہر آئے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

طلسم عصر حاضر را شکستم   ربودم دانہ و دامش گسستم
ماند کہ مانند ابراھیم   بے نار او چہ بی پرواہ نشستم

اقبال خود تو اس نظریاتی جنگ کے حملوں سے صحیح سلامت رہے، لیکن انہوں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ جو اس جنگ کی نذر ہو گئے ان کے بارے میں لکھتے ہیں : ۔

ماھمہ افسوس تہذیب غریب   کشتۂ افرنگیاں بی حرب و ضرب

اقبال مرحوم ان لوگوں کو ملت اسلامی کی طرف آنے کی نصیحت کرتے ہیں اور خود اعتمادی کا درس دیتے ہیں جو اس جنگ کی نذر ہو چکے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں یورپ کی تقلید کرتے ہیں اور

ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو وہ مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ مغرب کو تم نے اس کی حقیقی شکل میں نہیں پہچانا اور اس کے خُم سے چند جام پی کر تم خود سے بے خبر ہو گئے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

بیا اقبال جامی از خمستان خودی درکش   تو از میخانہ مغرب زخود بیگانہ می آئی

پھر پوری بے باکی کیساتھ مغرب کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے اور فریب خوردہ مسلمانون کے سامنے مغربی فلسفہ کے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد   زیر گردون رسم لادینی نهاد
گرگی اندر پوستین برہ ئی   ہر زمان اندر کمین برہ ئی
مشکلات حضرت انسان از وست   آدمیت راغم پنهان از وست
در نگاہش آدمی آب و گل است   کاروان زندگی بی منزل است
علم اشیا خاک مارا کیمیاست   آہ درافرنگ تاثیر جداست

اقبال مرحوم یہ ثابت کرتے ہیں کہ مغرب کس طرح ایک فرشتہ صفت انسان کو ابلیس بنا دیتا ہے۔ اور علم کے ذریعے کس طرح انسانیت کی تباہی کا اسلحہ تیار کرتا ہے، لہٰذا لکھتے ہیں:

علم از ورسواست اندر شہر و دشت   جبرئیل از جنبش ابلیس گشت
دانش افرنگیان تیغ بدوش   در ہلاک نوع انسان سخت کوش
آہ از افرنگ و از آیین او   آہ از اندیشہ لادین او

آپ یورپ کے فریب خوردہ لوگوں کے سامنے ان کے انسان دوستی اور انسانی صفتوں کے جھوٹے دعوؤں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

شرع یورپ بی نزاع قیل و قال   برہ را کردست بر گرگان حلال
کشتن بی حرب و ضرب آیین او   مرکها از گردش ماشین او

اقبال نے اپنے اشعار میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے مغرب کی اصل حقیقت واضح کر دی بلکہ اس کے دام میں پھنسے ہوئے مسلمانوں اور نظریاتی جنگ میں قربان ہونے والوں کی وہ تصویر بھی پیش کی کہ کس طرح مغربی طرز تعلیم نے باغیرت مسلمانوں کو مغرب کی کٹھ پتلی بنا دیا اور ان سے اسلام کا سب کچھ چھین لیا چنانچہ وہ کہتے ہیں:

حکمت ارباب دین کردم بیان
حکمت ارباب کین را ہم بدان
حکمت ارباب کین مکر است وفن
مکر وفن؟ تخریب جان تعمیر تن
حکمتی از بند دین آزادہ ئی
از مقام شوق دور افتادہ ئی
مکتب از تدبیر او گیرد نظام
تا بہ کام خواجہ اندیشد غلام
شیخ ملت با حدیث دلنشین
بر مراد او کند تجدید دین
وای قومی کشتۂ تدبیر غیر
کار او تخریب خود گردہ تعمیر شیر
میشود در عالم وفن صاحب نظر
نوجوانان چون زنان مشغول تن
در دل شان آرزوہای ثبات
مردہ زایند از بطون امہات
دختران او بہ زلف خود اسیر
شوخ چشم وخودنما وخوردہ گیر
ملتی خاکستر او بی شرر
صبح او از شام او تاریک تر
ہر زمن اندر تلاش ساز و برگ
کار او فکر معاش وترس مرگ
منعمان او بخیل وعیش دوست
غافل از مغز ند واندر بند پوست
قوت فرمانروا معبود او
در زوال دین وایمان سود او
از حد مروز خود بیرون نجست
روزگاش نقش یک فردانہ بست
از نباکان دفتری اندر بغل
الامان از گفتہ ہای بی عمل
دین او عہد وفا بستن بہ غیر
یعنی از خشت حرم تعمیر دیر

از حیا بیگانہ پیران کہن　　نو جوانان چون زنان مشغول تن

اسکے بعد حکیم اور فلسفی اقبال انگریزی طرز تعلیم اور اسکولوں کے نظام سے نالاں ہو کر روشن خیال اور تاریک ضمیر نسل کا یوں تعارف کراتے ہیں۔

در عجم گردیدم ہم در عرب　　مصطفی نایاب ارزان بولہب
این مسلمان زادہ روشن دماغ　　ظلمت آباد ضمیرش بی چراغ
در جوانی نرم و نازک چون حریر　　آرزو در سینہ او زود میر
این غلام این غلام ابن غلام　　حریت اندیشہ اورا حرام
مکتب از وی جذبہ دین در ربود　　از وجوش این قدر دانم کہ بود
این زخود بیگانہ این مست فرنگ　　نان جو میخواہد از دست فرنگ
از فرنگی میخود لات و منات　　مؤمن و اندیشہ او سومنات
دین و دانش را غلام ارزان دہد　　تا بدان را زندہ دارد جان دہد
گرچہ بر لبھاری او نام خدا است　　قبلہ او طاقت فرمانرو است

مغرب کے مادی فلسفے کے زہریلے پن سے باخبر اقبال مسلمانوں کو مغربی فکر اپنانے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جو شخص بھی فکر کے زہریلے اثرات سے متاثر ہو گیا تو وہ پھر مسلمانوں کے کسی کام نہیں آ سکتا۔

ہوشمندی از خم او نمی خورد　　ہر کہ خورد اندر ہمین میخانہ مرد

بعض مغرب زدہ لوگ جو علم اور رواج و معاشرت کے مابین بالکل فرق نہیں کر سکتے، یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر ہم اہل یورپ کی طرح رسم و رواج اپنا لیں اور اپنی شکل، وضع قطع، لباس اور فیشن ان کی طرح بنا لیں تو ہم بھی دنیاوی علوم و فنون میں انہی کی طرح ترقی کر لیں گے۔ اور اس طرح مادی ترقی میں مشرقی لوگ بھی مغرب کے ہم پلہ ہو جائیں گے، اقبال اس خیالِ فاسد کا سدِ باب کرتے ہوئے اور

نفسیاتی دھوکے میں پڑے ہوئے لوگوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

شوق رااز خود برد تقلید غرب　　باید این اقوام را تنقید غرب
قوت مغرب نہ از چنگ و رباب　　نی ز رقص دختران بی حجاب
نی ز سحر ساحر لالہ روست　　نی ز عریان ساقی نی از قطع موست
محکمی اوزانہ از لادینی است　　نی فروغش از خط لادینی است
قوت افرنگ از علم و فن است　　از ہمین آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نست　　مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را ای جوان شوخ و شنگ　　مغز می باید نہ ملبوس فرنگ
اندرین رہ جز نگہ مطلوب نیست　　این کلہ یا آن کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکی آگر داری بس است　　طبع داکی آگر داری بس است

اقبالؒ اس اسلامی امت کی نسل کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ نہ تو مغرب کا موتی حاصل کرنے کے قابل ہے اور نہ ہی اسکا مشک سونگھنے کے قابل۔ کیونکہ انکا موتی صاف نہیں اور انکا مشک وہ نہیں جو کہ نافۂ ہرن سے حاصل کیا گیا ہو بلکہ وہ تو نافۂ کلب (کتا) سے حاصل شدہ ہے۔

گوہر تفد ارو در لعلش رگ است　　مشک این سوداگر از ناف سگ است

لیکن مغرب کے بے دین غلام پھر بھی نوجوانانِ اسلام کو یورپ کی پیروی کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور ان کے سامنے مغربی تہذیب کو ایک بلند قدر انسانی تہذیب کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

نظریاتی یلغار کی روک تھام

عسکری جنگ کی روک تھام کبھی تو مدمقابل پر غلبہ حاصل کر کے اور کبھی صلح کے ذریعے حاصل ہو جاتی ہے لیکن نظریاتی جنگ ایسی ہے کہ کسی بھی صورت صلح یا ثالثی سے نہیں ٹلتی اور نہ ہی اسمیں صلح کی کوئی گنجائش ہوتی ہے۔ اُسے روکنے کی تو بس ایک ہی صورت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مدمقابل پر نظریاتی غلبہ حاصل کیا جائے۔ نظریاتی میدان میں ایک مقابل جب تک دوسرے پر مکمل غلبہ حاصل نہ کر لے یہ لڑائی ختم نہیں ہوتی۔ اس جنگ میں نہ تو اسلام صلح اور ثالثی قبول کرتا ہے اور نہ کفر۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بالکل اکیلے شرک اور کفر کے خلاف نظریاتی جنگ شروع کی تو مکہ کے کفار اس لڑائی میں آپ ﷺ سے بہت تنگ آ گئے، اُن کے سردار آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے تا کہ وہ آپ ﷺ اور مشرک قوم کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کریں اور ان کے شرکیہ افکار و نظریات کے خلاف نظریاتی محنت جاری رکھنے سے آپ ﷺ کو روکیں۔ چنانچہ ابو طالب نے نہایت شفقت کے ساتھ کفار مکہ کا یہ مطالبہ آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ اس نظریاتی جنگ سے پیچھے ہٹنے کے خطرناک نتائج سے باخبر تھے لہذا اپنے چچا کو یوں جواب دیا:

((والله یاعم لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی أن اترک هذا الامر مافعلت حتی یظهره الله او أهلک دُونه))

ترجمہ: ''اے میرے چچا! خدا کی قسم اگر یہ کفار میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں، صرف اس لیے کہ میں یہ کام چھوڑ دوں تو میں یہ اسوقت تک نہیں چھوڑوں گا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس دین کو کفر پر غلبہ نہ دے دیں یا میں یہ کام کرتے کرتے فوت ہو جاؤں۔''

بغور دیکھنے سے واضح معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جنگ جاری رکھنے کا عزم ایک ایسے وقت میں قسم اٹھا کر ظاہر فرما رہے ہیں کہ جب آپ اس میدان میں مدمقابل کے سامنے تنہا ہیں۔ حد یہ کہ مہربان چچا بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں لیکن پھر بھی فرماتے ہیں کہ اگر یہ کافر

سورج اور چاند بھی میرے ہاتھوں پر رکھ کر میری ناممکن شرطیں بھی ممکن بنادیں تب بھی میں ان کے ساتھ نظریاتی جنگ سے باز آنے والا نہیں۔

یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام کبھی بھی کفر کے خلاف نظریاتی جنگ میں صلح صفائی، احترام باہمی اور ثالثی کو قبول نہیں کرتا، اسی لیے آپ ﷺ نے عسکری جنگ میں تو صلح کی ہے لیکن نظریاتی جنگ میں کبھی صلح نہیں کی۔

بالکل اسی طرح کفار بھی مسلمانوں کی دشمنی سے اس وقت تک باز آنے والے نہیں جب تک انہیں اپنے دین، فکر اور ملت اسلامی سے گمراہ نہ کردیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرة:۱۲۰)

ترجمہ: ''یہود ونصاریٰ آپ ﷺ سے اسوقت تک خوش اور راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ﷺ ان کے دین کی پیروی نہ کرلیں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلاَ يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىَ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُواْ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُوْلَـئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَأُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (البقرة ۲۱۷)

ترجمہ: ''اور یہ (کافر) تم لوگوں سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ کو تمہارا دین چھوڑنے پر آمادہ کرلیں اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا دین چھوڑ دے اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔''

ان دو آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی جنگ ہمارے ساتھ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ ہمارے دین، نظریات اور افکار وترجیحات کو نہ بدل ڈالیں۔ یعنی ان کی

عسکری لڑائی کا اصل مقصد بھی نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی اصل جنگ تو نظریاتی ہی ہے لیکن عسکری لڑائی اس میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہے۔

نظریاتی جنگ میں ہونے والی تباہی سے بچنے کی تدابیر

پہلی تدبیر: حکومتی اختیارات ہاتھ میں لینا

اس وقت اسلامی دنیا یا اس کے علاوہ میں جہاں کہیں بھی نظریاتی جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اس کی پشت پناہ منظم کفری حکومتیں ہیں، جو وسائل اس جنگ میں بروئے کار لائے جاتے ہیں جیسے اسکول، یونیورسٹیاں، تحقیقی مراکز، ریڈیو، ٹیلیویژن، وزارتیں، قوانین، سیاسی اور فوجی دباؤ، اربوں ڈالر اور لاکھوں تربیت یافتہ شخصیات اور ان کے ماہر کارکنان اور اس کے علاوہ دیگر وسائل یہ سب ان حکومتوں کے اختیار میں ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس فکری جنگ میں برسرپیکار ہیں اور اس کو ترقی دینے میں ہر دم مستعد ہیں۔

اسلامی ممالک اور بالخصوص افغانستان اور پاکستان میں ان وسائل کا مقابلہ کرنا اور ان کا راستہ روکنا افراد اور تنظیموں کے بس کی بات نہیں ہے جب تک نظامِ حکومت اسلامی فکر رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں نہ آجائے اور جب تک ان ممالک کے دینی، سیاسی، فوجی، اجتماعی، مالی، ثقافتی اور تعلیمی امور کے اختیارات فسادی، دہریے، جمہوری، روشن خیال، کمیونسٹ، قوم پرست، مغرب کے تھوپے گئے عناصر اور یورپی افکار کے دل دادہ لوگوں کے گندے ہاتھوں سے نہ لے لیے جائیں، اس وقت تک اصلاح کی انفرادی کوششیں بے فائدہ ہیں۔

حکومتی اثر و رسوخ سے علیحدہ گذشتہ کئی سال سے جاری افراد کی کوششوں اور دعوت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ کئی دہائیوں کی دعوت اور طاغوتی قوتوں کے سامنے احتجاج اور ان کی منت سماجت کرنے سے اسلامی دنیا کے کسی ایک ملک میں بھی اسلامی نظام وجود میں نہیں آسکا کیونکہ یہ صرف

اور صرف دعوتِ قرآن پاک رسول اللہ ﷺ کے طریقے اور تعلیمات کے خلاف ہے، رسول اللہ نے تیرہ سال صرف دعوت دی، جس کے نتیجے میں آٹھ سو کے لگ بھگ لوگ مسلمان ہوئے پھر بھی جاہلیت کا نظامِ زندگی اپنی جگہ قائم رہا لیکن جب نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں حکومت اور اسلامی نظام قائم کیا اور حکومت کے اختیارات ہاتھ میں لیے تو صرف دس سال کے مختصر عرصے میں نہ صرف اسلام پورے جزیرۂ عرب میں پھیل گیا بلکہ جزیرۃ العرب سے باہر بھی بڑے بڑے کفریہ ممالک کے زوال کے اسباب پیدا ہو گئے۔

ہم افغانستان میں اس وقت تک مغرب کی نظریاتی یلغار کا راستہ نہیں روک سکتے جب تک اُن جیسے وسائل پر مبنی طاقت حاصل نہ کر لیں اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک ہم اپنے نظام اور حکومت کو مغرب کے غلاموں اور تنخواہ داروں سے چھٹکارا دلا کر حقیقی معنوں میں اسلامی بنیادوں پر قائم ایک اسلامی حکومت نہ بنا لیں۔ وہ حکومت ایسی نہ ہوگی کہ صرف نام کی اسلامی حکومت ہو اور نظام سارا کفر اور زمانہ جاہلیت کے قوانین پر چل رہا ہو بلکہ وہ ایک عملی اسلامی خلافت ہوگی کہ جس کا ہر ہر عمل قرآن وسنت کے عین مطابق ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

طالبان کے مختصر دور حکومت کے تجربے نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسلامی ادارے اگر چہ مادی لحاظ سے کمزور ہوں مگر ظلم وفساد اور کفریہ نظریات کا راستہ روکنے میں مضبوط بے دین حکومت سے بہت مؤثر ہوتے ہیں یہی ایک بنیادی وجہ تھی کہ جس کے سبب پوری دنیائے کفر متحد ہو کر ایک ایسی اسلامی حکومت کے مقابلے میں جنگ کے لیے کھڑی ہوگئی جس کے ابھی تک قدم بھی نہ جمنے پائے تھے۔ کافر اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ اگر ایک دفعہ کسی اسلامی ملک میں ایک حقیقی اور واقعی اسلامی نظام اور حکومت وجود میں آگئی اور وہ حتمی طور پر دوسری اسلامی ملتوں کے لیے ایک مثال اور ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئی تو پھر وہ ممالک بھی اپنے ملکوں میں اسی نظام کو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

امت مسلمہ کو مغرب کے کفریہ نظریات اور اس کے نظریاتی حملوں سے نجات دلانے کے

لیے ضروری ہے کہ حکومتی وسائل اور میڈیا کو مغرب کے تھوپے گئے سیکولر عناصر سے چھڑایا جائے اور اللہ کے دین کی حاکمیت نافذ کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے اور اس راہ میں کسی بھی قسم کی سودے بازی کے لیے تیار نہ ہوں، اور کسی بھی مصلحت پسندی سے کام نہ لیا جائے۔

گذشتہ اسّی سال کی تاریخ نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ جب تک مغربی فکر کے تربیت یافتہ افراد اور عناصر حکومت میں رہیں گے اس وقت تک اسلامی فکر رکھنے والوں کو قتل کیا جاتا رہے گا، انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالا جاتا رہے گا اور ان کی سرگرمیوں کو محدود کیا جاتا رہے گا اور انہیں طرح طرح کی سختیوں اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری تدبیر: تعلیمی نصاب کی اصلاح

اسلامی دنیا میں تعلیم کے دو طرح کے نصاب رائج ہیں جن میں سے ایک دینی اور دوسرا دنیاوی تعلیمی نصاب ہے یہ دونوں قسم کے نصاب بنیادی اصلاح کی ضرورت رکھتے ہیں جو کہ درج ذیل طرز پر ہونی چاہیے۔

ا۔ عصری تعلیمی نصاب کی اصلاح

تعلیمی نصاب کو دور حاضر کی تحقیقات کی روشنی میں مؤثر اور عصری طریقہ تدریس (Method) کی شکل میں مدون کیا جائے اور اسے مغربی فلسفے، مغربی اخلاق، مغربی ثقافت اور مغرب کی نظریاتی تاثیروں سے ہر حال میں پاک کیا جائے، کیونکہ جب ہم ایک مسلم امت کی حیثیت سے اپنے اوپر یہ لازم سمجھتے ہیں کہ ہمارے رسم و رواج، ثقافت اور طور طریقے، غرض زندگی کے تمام معاملات دین اسلام ہی متعین کرتا ہے تو اس کے بعد ہمیں مغرب سے جس چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے وہ صرف مغرب کے علمی اور صنعتی تجربات ہیں نہ کہ مغرب کے اخلاق اور ثقافت جو کہ مغرب نے اپنے تربیت یافتہ شاگردوں کے ذریعے ہمارے تعلیمی نصابوں میں شامل کیے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ماہرین اور اسلامی فکر کے ہر رخ کی سمجھ رکھنے والے اشخاص کی طرف

سے اس قسم کے مضامین کا تصفیہ ہو اور انکی جگہ اسلامی افکار کو نصاب میں شامل کیا جائے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی مدارس میں پڑھائی جانے والی دینی عربی کتابوں اور صرف اور نحو کی مخصوص کتابیں جو آج سے تقریباً آٹھ سو یا ہزار سال قبل اُسی زمانے کی ذہنی کیفیت، علمی استعداد اور لوگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئیں تھیں، انہیں لے لیا جائے اور بغیر کسی تسہیل، ترجے اور نئی تدوین کے مکتب کے نصاب میں شامل کر دی جائیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ دینی اور لغوی مسائل کو منظم طرز پر زمانے کے رسم و رواج، علمی، اجتماعی، لغوی حالت اور عُرف کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب انداز اور تدریج کے ساتھ پورے نصاب میں اول درجے (کلاس) سے یونیورسٹی تک داخل کیا جائے ایسے نہیں کہ بغیر کسی مقدمے، تدریج اور مستقبل کے لیے ذہن بنائے بغیر ''قوانین زرادی'' اور ''شرح زنجانی'' کو اسکول کی ساتویں یا آٹھویں جماعت میں داخل کر دیا جائے کیونکہ اس حال میں تو ان کتابوں کا مدرس خود بھی اس پر قادر نہیں ہوگا کہ ''زرادی'' کے قوانین کو منظم ترتیب سے کلاس کے طلباء کے لیے بورڈ پر منظم انداز میں لکھ کر اس کی تشریح کر سکے۔

۲۔ دینی نصاب کی اصلاح

دینی نصاب ہر زمانے کے تقاضوں اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کیے جاتے ہیں اور زمانے اور حالات کے بدلنے کے ساتھ دینی نصاب کے مضامین میں بھی تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔ یہی انبیاء اور امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی سنت بھی رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے پیغمبر اور امت کے لیے الگ الگ شریعت اور منہج جو اصولوں میں آپس میں متحد تھے نازل کیے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہی حضرت آدم علیہ السلام کے صحیفے کو قیامت تک انسانوں پر مقرر کرنے اور الگ الگ صحیفوں اور کتابوں کے نازل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی لیکن یہ کام حکیم اور علیم رب نے اس لیے نہیں کیا کہ ہر زمانے کی ضرورتیں اور تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہماری شریعت میں ناسخ اور منسوخ کا فلسفہ بھی ہے اس کے ساتھ یہ بھی ہم دیکھتے

ہیں کہ مکی دور میں شرعی احکام کا انداز کچھ تھا اور مدنی دور میں کچھ اور، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پھر صحابہ کرام کے اجتہاد کی دلیل کا بھی شریعت میں اضافہ ہوا، اس کے بعد اجماع، قیاس اور دیگر شرعی دلائل کا اضافہ فقہی مذاہب کی شکل مین وجود میں آیا یہ سب تبدیلیاں ایسی شکل میں آتی گئیں کہ شریعت کی اصل ان میں محفوظ اور باقی رہتی تھی یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے حالات الگ نصاب اور الگ مضامین چاہتے ہیں۔

کیا آج کے زمانے میں یہ بہت انوکھا اور عجیب نہین کہ اسلامی دنیا اور مسلم امت کو مادیت، جمہوریت، کیپٹل ازم، کمیونزم، لبرل ازم، نیشنل ازم اور گلوبلائزیشن کی بلا منہ میں لیے ہوئے ہے اور ہم اب بھی اپنے دینی تعلیمی نصاب میں ہزار سال پرانے کلامی اور فلسفی فرقوں اور مذاہب کے بارے میں معلومات کی تدریس کر رہے ہیں؟

ہم موجودہ زمانے کے ان فلسفوں، نظریات اور باطل فرقوں کو اپنے نصاب میں کیوں شامل نہیں کرتے جنہوں نے کروڑوں مسلمانوں کا ایمان اور عقیدہ خراب کیا اور مزید خراب کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے کسی دینی مدرسے یا کسی دینی تعلیمی نصاب میں موجودہ زمانے کے کفر کی مختلف شکلوں اور قسموں کے بارے میں مضامین کی تدریس ہوتی ہے؟ کیا ہم کل کمیونیزم کے نظریات اور آج مغرب کے سیکولر (بے دینی) کے نظریات کی نشر واشاعت کا راستہ روک سکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نصاب سے وہ سب پرانے بے ضرورت اور اضافی مضامین نکال دیں اور انکی جگہ خالص شرعی مضامین اور وہ مضامین جنکی موجودہ زمانے کی اسلامی فکر کو شدید ضرورت ہے جیسے سیرت اور اسلامی تاریخ، سیاسی اور اجتماعی علوم اور اسلامی دنیا کے موجودہ حالات اور اسلامی دنیا کو درپیش مشکلات کے بارے میں مضامین کا اضافہ کریں تاکہ آج کے دور کا دینی طالب علم موجودہ اور آنے والے کل کے فکری، سیاسی اور معاشرتی چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے۔

تیسری تدبیر:

مساجد کو فکری جنگ کے مورچوں میں تبدیل کرنا

ایک محتاط اندازے کے مطابق آج افغانستان، پاکستان کے شہروں محلوں اور گاؤں میں تقریباً لاکھوں مساجد موجود ہیں اور ہر مسجد میں ایک امام صاحب بھی امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ مساجد اگر حقیقی معنی میں دعوت کے مراکز بن جائیں اور ان کے امام حقیقی طور پر اللہ جل شانہ کے دین کی طرف لوگوں کو بلانے اور لوگوں کی فکر، عقیدہ کو سنوارنے اور عوام کی فقہی اور اخلاقی مشکلات کے حل کرنے کی استعداد اور صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلیں تو پھر کیا مجال ہے کہ کوئی اجنبی اور باہر سے درآمد شدہ فکر اور نظریہ مسلمانوں کو اور خاص طور پر لاکھوں نوجوانوں کو اسلام کے علاوہ دیگر نظریات پر مطمئن کر سکے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے جسے ہمیں ماننا پڑے گا کہ کمیونزم نے اتنے علماء اور اماموں کے ہوتے ہوئے ہمارے لاکھوں نوجوانوں کو اسلام سے منحرف کر کے اپنی صف میں کھڑا کر دیا، اسی طرح باوجودیکہ ہماری ملت نے جہاد، ہجرت، قربانیوں، شہادتوں اور بڑے پیمانے پر شرعی فکر و شعور اور علم کے ساتھ قربت کا ایک بڑا زمانہ پایا ہے لیکن پھر بھی مغربی این جی اوز اور مغربی فکر کی طرف دعوت دینے والے ادارے اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے، جس کے نتیجے میں ہماری ملت کا ایک بڑا طبقہ افغانستان پر امریکی حملے میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور امریکہ انھیں اس پر مطمئن کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ وہ صلیب کے پرچم تلے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لڑیں۔

ہمارے لاکھوں امام، خطیب، قاری اور شرعی علوم کی طرف منسوب لوگ آنے والے کفریہ افکار کے خلاف مزاحمت اور اسے بے اثر کرنے سے کیوں عاجز ہیں؟ ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود ملت کے لاکھوں بچے کبھی کمیونزم کے پرچم تلے کھڑے ہوتے ہیں اور کبھی مغرب کے صلیبی پرچم تلے۔ اسکی کئی بنیادی وجوہات ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

الف۔ احساسِ دعوت کا فقدان

بہت سے مساجد کے امام، دیندار حضرات، مدارس کے طلباء واساتذہ ایسے ہیں کہ ان میں دعوت کے احساس کا نہ ہونا دیکھا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف مدرسین، مساجد کے امام اور کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والے سمجھتے ہیں، اگر کوئی ان سے پوچھے تو جواب دیتے ہیں اور اگر نہ پوچھے تو یہ کسی کے پیچھے نہیں جاتے اور نہ اپنی طرف سے معاشرے کے افراد کی اجتماعی اصلاح کے لیے دعوتی پروگرام بناتے ہیں اور نہ ہی اجتماعی معاشرے میں پھیلتی ہوئی بے دینی کے خلاف منظم جدوجہد کو اپنی ذمہ داری شمار کرتے ہیں۔

یہ کمزوری ہمارے اندر اس وجہ سے آئی ہے کہ ہمارے دینی تعلیمی نصاب میں صرف، نحو، منطق، بلاغت، شعروشاعری، ''نفحۃ العرب'' اور ''مقامات حریری'' کی شکل کے لفظی صنعت کے تکلفات سے بھرے ہوئے خرافاتی قصے اور کہانیاں ادب کے نام پر پڑھائے جاتے ہیں لیکن دعوت کے طور طریقے اور انفرادی اور اجتماعی مخفی اور اعلانیہ دعوت کے طریقوں کے بارے میں ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور دیگر پیغمبروں کی دعوت کے بارے میں انکی تاریخ اور تجربات کے بارے میں اور انبیاء کی دعوت میں ان کو پیش آنیوالی مشکلات کے بارے میں، ان کی کامیابیوں اور انسانوں پر ان کے احسانات کے بارے میں ایک کتاب کیا ایک مضمون بھی نہیں پڑھایا جاتا۔ رسول کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جو انبیا کرام کے بعد بلند ترین شخصیات ہیں اور جو انسانوں کے لیے دعوت کے میدان میں رہنماء کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تاریخ اور دعوت کے بارے میں بھی کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی یہاں تک کہ فقہی مذاہب کے اماموں اور اسلامی شریعت کو مدون کرنے والے علماء کی تاریخ، جدوجہد اور قربانیوں کے بارے میں بھی کوئی کتاب رسمی طور پر بھی ہمارے تعلیمی نصاب میں شامل نہیں ہے۔

بات واضح ہے کہ جب نصاب میں دعوت کا مضمون وجود ہی نہیں رکھتا ہے تو نصاب کے

فارغ ہونے والوں میں دعوت کا احساس کہاں سے آئے گا؟

البتہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج کے دور میں بھی بعض علماء نے مثالی طرز پر اسلامی فکر، دعوت اور معاشرتی واجتماعی اصلاح کے لیے بہت بڑی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں لیکن ان کی تعداد دیکھی جائے تو دس بیس ہزار میں کوئی ایک شخص ایسا نکلتا ہے۔

ب۔ مساجد میں امامت کے لیے نااہل شخصیات کا ہونا

ہماری اکثر مساجد میں ایسے لوگ بھی امامت کرنے پر مامور ہیں جو صحیح معنی میں امامت کی استعداد اور صلاحیت نہیں رکھتے، انہیں نہ تو شرعی علوم پر دسترس حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں اور بہت سے افراد ایسے بھی پائے گئے ہیں جن میں تقویٰ و پرہیزگاری بھی ناپید ہوتی ہے اور وہ اپنے شعبے سے متعلق کافی شرعی علوم بھی نہیں رکھتے۔ وہ نہ قرآن اور حدیث کو سمجھتے ہیں اور نہ بات سمجھانے کا فن جانتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو موروثی ترتیب پر امام بنے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض دیگر امامت کے منصب سے بعض مادی فوائد کے حصول کے لیے منسلک ہیں نہ کہ امامت کا حق ادا کرنے کیلئے۔ لوگوں کی اصلاح اور گمراہی ان کے ہاں اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی زکوۃ، صدقات، فطرے، قربانی کی کھالیں اور شکرانے لینے کی اہمیت۔ اسی طرح اکثر امام تو نہ صرف یہ کہ خود دعوت کا فریضہ انجام نہیں دیتے بلکہ دیگر علماء اور داعیوں کو بھی اپنی مسجد اور محلے میں دعوت کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ عام لوگوں اور جاہلوں کو مخلص داعیوں کے خلاف ابھارتے ہیں اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں اور الزام لگاتے ہیں۔ ان اماموں کے نزدیک محلے کے لوگوں کے رسم و رواج شریعت کے احکام سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ محلے کے رسم ورواج کا ادا کرنا تنخواہ کے دوام کی ضمانت دیتا ہے لیکن شریعت کے وہ احکام جو لوگوں کے رسم ورواج پر کاری ضرب لگاتے ہیں ان کو بیان کرنے سے کیونکہ اپنی امامت خطرے میں پڑ جاتی ہے اس لیے اس کو کبھی اپنے وعظ و تقریر میں نہیں چھیڑتے، اس قسم کے بے دین امام نہ صرف یہ کہ زمانے کے نظریاتی فتنوں اور ارتداد کا مقابلہ نہیں کر

سکتے بلکہ اپنے غلط عقائد اور غیر شرعی اعمال کی وجہ سے دین کو بدنام کرنے اور دین دشمنوں کو مضبوط کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔

حکومتِ اسلامیہ کا یہ فرض بنتا ہے کہ اس طرح کے اماموں کو امامت کے عظیم اور مہتم بالشان منصب سے ہٹائیں اور انکی جگہ اہل اور دین کی روح کو جاننے والے علماء متعین کریں تا کہ ہماری مساجد صحیح طرز پر اسلامی علوم کے سیکھنے کے مراکز اور نظریاتی جنگ کے مورچوں میں تبدیل ہو جائیں اور تا کہ اماموں اور خطیبوں کے اندر قیادتی صلاحیتیں اور اسلامی نظریات اور عقیدے میں بگاڑ پیدا کرنے والے فتنوں سے دفاع کی استعداد پیدا ہو جائے۔

اس کمی کو دور کرنے کے لیے ایک اقدام یہ بھی ضروری ہے کہ حکومتِ اسلامیہ اماموں اور خطیبوں کی تربیت کے لیے بھی ایسے ہی تربیتی مواقع پیدا کرے جیسے کہ مفتیان کرام، قاضی صاحبان اور معلمین کو تربیتی کورسز کی شکل میں فراہم کیے جاتے ہیں اور پھر اسکی عملی مشق کے بعد ان کو میدان میں لایا جاتا ہے۔

اس کے لیے یونیورسٹیوں کی حدود میں دعوت اور امامت کے نام سے شعبے بھی کھولے جا سکتے ہیں یا اس کام کے لیے ایک خاص اعلیٰ مدرسہ، اکیڈمی یا کسی دوسرے نام سے علمی تربیت کے مراکز بھی کھولے جا سکتے ہیں جو کہ مکمل طور پر حکومتِ اسلامیہ کے تحت چلائے جائیں۔

امامت کا منصب اصل میں منصبِ نبوت کی میراث ہے، جب تک اس منصب پر اہل اور بااستعداد علماء کو متعین کیا جاتا رہا مسلم معاشرہ ہر قسم کی نظریاتی اور اجتماعی پریشانیوں سے امن میں رہا۔ معاملہ دین کا ہو یا اسکا تعلق دنیاوی کاروبارِ زندگی سے ہو اس وقت کے ائمہ حضرات اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات سے باخبر رکھتے تھے اور شریعت کی روشنی میں لوگوں کی نظریاتی، اخلاقی، عقیدتی، فقہی اور یہاں تک کہ اجتماعی مشکلات کے حل کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے لیکن جس دن سے اس منصب کو کم تر سمجھا گیا اس دن سے ہی عوام اور امام کے درمیان روحانی رابطہ کمزور پڑ گیا اور اس کمزوری کو اسلام کے

دشمنوں نے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اور معاشرے کے افراد کے افکار اور ذہنوں پر اثر انداز ہونے لگے۔

اگر ایک بار پھر مساجد عبادت کے ساتھ ساتھ علم و اخلاق، اجتماعی اور اصلاحی تفکر اور دشمنوں کے منصوبوں کو بے اثر کرنے کے مراکز میں تبدیل ہو جائیں اور دل سوز علماء اور داعی اماموں کی طرف سے مساجد میں اجتماعی دعوت شروع ہو جائے تو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح معاشرے کی نظریاتی قیادت اسلام دشمن اشخاص کے ہاتھوں سے نکل کر ایک دفعہ پھر صالح لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے گی۔

آخر میں خلاصے کے طور پر یہ بات دوبارہ ذہن نشین کرانا چاہوں گا کہ نظریاتی جنگ عسکری جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور اس کی تاثیر عسکری جنگ کی تاثیر سے زیادہ دیرپا ہوتی ہے اسی طرح نظریاتی جنگ کا مقابلہ بھی عسکری جنگ کے مقابلے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس میں بہت صبر و استقامت وسیع البنیاد منصوبہ بندی اور تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ عسکری جنگ مین کسی قوم وملت کا پیچھے رہ جانا اس ملت کے دائمی ختم ہونے کے معنی میں نہیں ہو سکتا لیکن اگر کوئی قوم نظریاتی جنگ میں شکست کھالے اور اپنے فکر و شعور، عقیدے، اخلاق، قومی اقدار اور تاریخ سے دفاع نہ کر سکے تو یہ شکست حقیقت میں اس قوم کی معنوی اور نظریاتی موت کے مترادف ہوتی ہے جس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔

نظریاتی جنگ کے بارے میں یہ چند باتیں بہت عرصے سے میرے ذہن میں تھیں اور میں یہ چاہتا تھا کہ ان باتوں کو ملت اسلامیہ کے دلسوز اور مخلص لوگوں کے سامنے رکھ دوں اور میں امید کرتا ہوں کہ میں نے انھیں اس خطرناک جنگ کی طرف توجہ دلا کر اپنی ذمہ داری کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔

◆

مسلمانوں کی پستی

کے حقیقی اسباب

الله
بسم الله الرحمن الرحيم

مسلمانوں کی پستی کے حقیقی اسباب

مسلمان اس دینِ حق کے ماننے والے ہیں کہ اللہ جل شانہ اسکے علاوہ کوئی دوسرا دین قبول نہیں فرماتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الإِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹)

ترجمہ: ''بے شک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلَامِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (آل عمران:۸۵)

ترجمہ: ''جو کوئی شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

تمام مسلم ممالک آباد دنیا کے درمیان میں واقع ہیں جو کہ سیاسی، اقتصادی اور اسٹریٹیجک محل وقوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مسلمان آبادی کے لحاظ سے بھی بڑھتے جا رہے ہیں اور انکی زندگی کے وسائل بھی بہتر سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں پھر بھی مسلم ممالک گذشتہ پانچ سو سال سے کبھی ایک حملہ آور اور استحصالی ملک کے تحت آ جاتے ہیں اور کبھی دوسرے کے تسلط و دباؤ تلے زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دنیا میں پس ماندہ قوم شمار کیے جاتے ہیں۔

یہ بری حالت بہت سے اسباب اور عوامل کی وجہ سے ہے جن میں سے سب سے بنیادی وجہ مسلمانوں کا اپنے دین کے مزاج اور تقاضوں کو نہ سمجھنا ہے۔ جب مسلمان دنیا کو اپنی اسلامی فکر کی روشنی میں دیکھتے تھے صحیح اور غیر صحیح کاموں کو اپنے دینی معیاروں پر پرکھتے تھے اور اپنی ذات کیلئے ترقی کی راہ خود متعین کرتے تھے اس وقت مسلمان قوم سب سے مضبوط قوم تھی۔ ہسپانیہ سے لیکر چین تک ان کا پرچم لہراتا تھا دنیا کی دوسری قومیں بھی یہ کوشش کرتی تھیں کہ مسلمانوں کے مدارس اور یونیورسٹیوں سے دینی و دنیاوی علوم سیکھیں۔

لیکن جب مختلف وجوہات کی بناء پر مسلمانوں کی اجتماعی سوچ بدل گئی اور انہوں نے اپنی اسلامی تعلیمات اور زندگی گزارنے کے اسلامی طور طریقوں کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ غیروں کے غیر اسلامی طور طریقوں کو اپنالیا تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا، قیادت اور سیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور مسلمان آہستہ آہستہ غلام بنتے گئے، اس غلامی کو مضبوط کرنے اور دوام بخشنے کے لیے دشمن نے ذرائع ابلاغ (میڈیا) اور مختلف طریقوں سے مختلف میدانوں میں محنت کی اور اپنی سازشوں کے جال بچھائے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ حاکمیت کا میدان

ہر ملک کے سیاسی اور اجتماعی کام چاہے وہ داخلی ہوں یا دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ بین الاقوامی دوطرفہ خارجی روابط ہوں ملک کے حاکم کی جانب سے آگے بڑھائے جاتے ہیں، اسی اہمیت کی بنا پر حاکم اور نظام حکومت کا نگران متعین کرنا اسلام میں شریعت اور عقیدے کا موضوع ہے۔ اسلامی شریعت حاکم نامزد کرنے کیلئے ایسے راستوں اور کاموں کو اپنانے کا حکم دیتی ہے جسکے نتیجے میں صالح اور عادل حاکم اقتدار میں آئیں، اسلام کے فقہاء نے مسلمانوں کا حاکم نامزد کرنے اور معزول کرنے کے لیے شریعت کی روشنی میں ایسے معیار اور قیدیں متعین کی ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے سے اسلامی معاشرہ حاکمیت کے میدان میں تزلزل اور تذبذب سے ہمیشہ کیلئے محفوظ رہتا ہے۔

اسلام میں حاکم کی بنیادی اور اہم ذمہ داریوں میں اسلامی شریعت کا نافذ کرنا، ملک اور دین کا دفاع کرنا، لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کا امین و ذمہ دار ہونا اور عالمی سطح پر مسلمانوں کے حقوق کا دفاع کرنا بھی شامل ہے۔ لہٰذا جب اس قسم کے حاکم کی موجودگی میں بین الاقوامی غیر مسلم ممالک کو اسلامی دنیا میں اپنے مکروہ اغراض و مقاصد پورے ہوتے نظر نہ آئے تو انہوں نے مختلف طریقوں اور سرگرمیوں کے ذریعے خلافتِ اسلامیہ کو گرا کر اسلامی دنیا میں حاکم اور حاکمیت کیلئے نئے معیار مسلمانوں پر تھوپ دیے جسکے نتیجے میں ایسا نظام اسلامی دنیا پر مسلط ہوگیا جو عالمی کفری ممالک کے مقاصد کو ملک

کے فائدوں پر ترجیح دیتا ہے، ان غیر اسلامی حکومتوں کی مختلف قسمیں ہیں :

پہلی قسم: خاندانی اور شاہی حکومتیں

شاہی حکومتیں اگر اسلامی نظام نافذ کریں تو جمہوری حکومت سے بہت بہتر ہوگا اس لیے کہ ہر حاکم کے مرنے پر ملک میں نئی نئی شورشوں اور افراتفریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن آج جو شاہی نظام بعض اسلامی ممالک میں موجود ہے اس میں حاکم اور بادشاہ استعماری ممالک کی طرف سے لوگوں پر مسلط کیے ہوئے ان کے اپنے ایجنٹ ہیں اسی وجہ سے وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہر پالیسی میں استعماری ممالک کی رعایت کر کے ان کو خوش رکھیں تا کہ زیادہ عرصہ کیلئے حکومت میں رہیں چاہے یہ کام کرنے میں انکو قتل و غارت گری، ظلم و زیادتی اور اسلام دشمنی کا ارتکاب ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

دوسرا یہ کہ اسطرح کے شاہی گھرانوں میں حکومت موروثی شکل میں ایک سے دوسرے کی طرف خود بخود بالترتیب منتقل ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آنے والے حاکم میں حکومت چلانے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں؟ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ استعماری قوتیں شاہی خاندانوں میں سب سے نااہل غیر صالح شخص کو منتخب کر لیتی ہیں جو اس منصب کا کسی صورت اہل نہیں ہوتا جو بالکل لاپرواہی کیساتھ اپنے ملک اور عوام کے مفاد کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور پوری طاقت سے اغیار کے اشاروں پر چلتا رہتا ہے۔ موجودہ شاہی نظاموں میں بادشاہ مسلمانوں کی طرف سے حاکم نہیں بنائے گئے بلکہ یہ مغرب کی طرف سے مسلمانوں پر مسلط کیے گئے ان کے ایجنٹ ہیں، یہ حاکم اپنے ممالک اور عوام کو زبردستی اور طاقت کے بل بوتے پر اُن طریقوں پر چلاتے ہیں جو مغرب نے ان کے لیے متعین کر دیئے ہیں اور اگر کوئی اس قسم کے مفسد حاکموں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اس کی آواز کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ دبا دیا جاتا ہے، کبھی تو اسے قید کر دیا جاتا ہے اور کبھی جلاوطن یا جان سے ہی مار دیا جاتا ہے، مغرب کے انسانی حقوق کے علم بردار بھی اس طرح مسلط کردہ حاکموں کے ظلم اور قتل و غارت گری پر چشم پوشی کرتے ہیں اور اس طرح کے اقدامات کی مختلف عنوانات اور بہانوں سے حفاظت اور دفاع کرتے

رہتے ہیں۔

شاہی گھرانوں کے افراد اور ولی عہد اکثر مغرب کے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ ہوتے ہیں اور ان کا نظریاتی معیار بھی مغرب کے طرز پر ہی ہوتا ہے اور وہ اپنے ملک کے عوام سے اتنے اجنبی ہوتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے ملک کی عوام سے مختلف نظر آتے ہیں، ان کے نزدیک اپنا دین، قوم کے اخلاق اور طور طریقے مغربی طرز زندگی اور مغربی فکر کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

دوسری قسم : بغاوت کے ذریعے مسلط کردہ حکومتیں

دوسری قسم کی حکومتیں اسلامی دنیا میں وہ بغاوت والی حکومتیں ہیں جو غیروں کے تربیت یافتہ اور ان کی گود میں پلے ہوئے بااثر لوگوں کی طرف سے وجود میں آئی ہیں۔ اس طرح کی حکومتوں کی پشت پناہی کے لیے استعماری ممالک کی فوجی اور سیاسی مدد ہمیشہ تیار رہتی ہے، یہ حکومتیں چونکہ غیروں کی جانب سے ان کے خاص مقاصد کی تکمیل کیلئے وجود میں آتی ہیں اس لئے ان کے مقاصد کی تکمیل اور ان کی ایجنٹ حکومت کی بقاء کیلئے ایسے نظام اور قوانین بنائے جاتے ہیں جن کے ذریعے ہر حال میں اور ہر ممکن طریقے سے اس حکومت کی حفاظت کی جا سکے۔

ان حکومتوں کو اس بات سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس طرح کے نظام اور قوانین لوگوں کے دین، اخلاق، قومی، سماجی اور معاشرتی زندگی اور دیگر طبعی ضروریات کے لیے فائدہ مند ہیں یا نہیں۔ سب سے پہلے ان تمام لوگوں سے قید خانے بھر لیے جاتے ہیں جن سے حکومت کو اپنے زوال کا خطرہ محسوس ہوتا ہے اور جب کبھی پوری قوم ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو پھر اسلحے اور قوت کے بے دریغ استعمال کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر بیرونی افواج کو دعوت دے کر حکومت کے تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اسلامی دنیا بیسویں صدی میں اس قسم کی حکومتوں سے بہت پامال ہو چکی ہے، اب بھی مسلم ممالک انہی حالات کی چکی میں پس رہے

ہیں، یہ تمام حالات اس لیے پیش آتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں حاکمیت اور حکومت حاصل کرنے کے غیر اسلامی معیار نافذ العمل ہیں۔

تیسری قسم : فوجی حکومتیں

جب کبھی ''ملکی'' یا مغرب کی اصطلاح میں ''جمہوری حکومتیں'' استعماری حکومتوں کے مصالح اور مفاد کی حفاظت میں ناکام ہو جاتی ہیں، اور اسلام کے خلاف بھیانک فیصلوں کے نافذ کرنے سے عاجز آ جاتی ہیں اور انہیں یہ خوف دامن گیر ہونے لگتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کہیں حکومت اسلامی تنظیموں یا قومی حلقوں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے۔ ایسی صورت میں ان کے سارے مفادات خطرے میں پڑ جاتے ہیں لہٰذا فوجی بغاوت کے لیے راہ ہموار کی جاتی ہے تا کہ فوجی حکومت وجود میں لائی جائے۔

لہٰذا یہ فوجی حکومت برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ سارے قوانین اور نظام ختم کر دیتی ہے جن کے ہوتے ہوئے کسی حد تک اسلامی یا قومی مصالح حاصل ہوسکتے ہوں، استعماری قوتیں اس طرح کی فوجی حکومتوں کو یہ ذمہ داری سونپتی ہیں کہ وہ عوام کے خلاف لڑیں اور عوام کے سامنے اپنے اُن ہم وطنوں کو جو استعمار اور غلامی کی مخالفت کرتے ہیں، غیر ملکی اور امن کے دشمن کے طور پر متعارف کرائیں اور 'استعمار' کی بغاوت کرنے والوں اور مداخلت کرنے والوں کو ''دہشت گرد'' کا لقب دیں اور ان کے ساتھ روشن خیالی، امن اور اعتدال پسندی کے نام پر معاہدے کریں جو اپنی شرائط اور حقیقت کے اعتبار سے غلامی اور ذلت کے معاہدے ہوں اور ان لوگوں کو بالکل ختم کرنے کی کوشش کریں جو ان سے آزادی مانگتے ہیں یا ملک میں اس قسم کے فوجی حاکموں کی مخالفت کرتے ہیں۔

ایسے فوجی حکام ملک کے قومی ادارے، فوج، اقتصادی وقومی ذرائع اور دیگر تمام وسائل اغیار کی غلامی میں اپنی بقا کیلئے حاصل کرتے ہیں اور عوام کو حساب دینے سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھتے ہیں۔

اکثر اس طرح کی فوجی حکومتیں ان ہی ممالک میں وجود میں آتی ہیں جہاں عوام اسلامی جذبے سے سرشار ہوں اور اسلامی اور جہادی تحریکیں اقتدار کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں، یہ عمل

استعماری قوتوں کے حق میں پچھلے سو برسوں میں کئی بار مختلف مسلم ممالک میں بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔

چوتھی قسم : جمہوری اور انتخابی حکومتیں

جمہوری اور انتخابی حکومتوں کو اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ان حکومتوں سے بہت بہتر نظر آتی ہیں جو شاہی خاندانوں میں موروثی چلی آ رہی ہیں یا فوجی بغاوت کے نتیجے میں تشکیل دی گئی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ یہ حکومتیں سب سے زیادہ خطرناک ہیں اور ان کا منفی اثر سب سے زیادہ تسلسل اور دوام رکھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حکومتیں جمہوری اصولوں اور مغربی سیاسی اقدار سے وجود میں آئی ہیں جو اسلامی دنیا کے دینی، قومی، اخلاقی اور سیاسی اصولوں اور ترجیحات کے برعکس ہیں، جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

☆ جمہوریت کی بنیاد پر مبنی انتخابات انسانوں کو علم، تجربے، عقل، دینداری اور امانت داری کے معیار پر نہیں پرکھتے بلکہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں، مثال کے طور پر حاکم کے انتخاب اور قانون سازی میں ایک بڑے ماہر قانون کی رائے اور ایک ایسے شخص کی رائے میں جو گندگی اٹھاتا ہے اور بیت الخلاء صاف کرتا ہے، کوئی فرق نہیں ہوتا یا بالفاظ دیگر ایک شیخ الحدیث یا مفتی اعظم اور ایک ایسے شخص کی رائے میں کوئی فرق نہیں جو قومی سطح پر خیانت، غداری اور ہر طرح کی بداخلاقی سے پہچانا جاتا ہے، دونوں قسم کے انسانوں کا ووٹ برابر ہے، اس باطل نظام میں اس بات کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی کہ ایک تو وہ عالم اور مفتی اعظم یا قاضی جو ملک کی اجتماعی مصلحتوں کی تشخیص میں مہارت رکھتا ہے اور دوسرا بداخلاق اور فاسق انسان ہے جو ان امور کی بالکل صلاحیت ہی نہیں رکھتا، یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

☆ جمہوریت ملک کے ہر ہر فرد کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ ملک کے کسی بھی عہدے کے لیے اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر پیش کر سکتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، بالفاظ دیگر جس طرح

قیادت کے اہل صالح لوگوں کیلئے امیدوار بننے کا دروازہ کھلا ہے بالکل اسی طرح مفسدوں اور بدکردار لوگوں کیلئے بھی یہ دروازہ کھلا ہے بلکہ آج کی اسلامی دنیا میں تو نوے فیصد صالح لوگوں پر انتخابی امیدوار بننے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور اسی طرح اسلامی جماعتوں پر مختلف بہانوں سے پابندیاں لگائی جا رہی ہیں اور صحیح معنوں میں کام کرنے والوں کو کام کرنے سے روکا جا رہا ہے، کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ اسلامی جماعتیں انتخابات میں جیت گئیں پھر ان کی حکومتیں فوجی بغاوت کے ذریعے ختم کر دی گئیں اور ان جماعتوں کے ذمہ داروں سے قید خانے بھر دئے گئے۔

☆ جمہوریت کی بنیاد پر قائم حکومتوں کے فیصلے جائز و ناجائز کے معیار پر نہیں کیے جاتے بلکہ وہاں اکثریت کی رائے کو دیکھا جاتا ہے جو اکثریت نے پسند کر لیا وہی جائز اور صحیح ہوتا ہے اگرچہ وہ اللہ جل شانہ کے دین کے احکامات کے بالکل مخالف ہی کیوں نہ ہو مثال کے طور پر اگر اکثریت یہ رائے دے کہ مرد مرد سے شادی کر سکتا ہے عورت عورت سے شادی کر سکتی ہے یا مثلاً سود جائز ہے، عورت اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے، اللہ جل شانہ کی شریعت کو زندگی اور حکومت کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں تو یہ سب کچھ جمہوری حکومت میں بطور قانون مانا جاتا ہے اور اس کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت یہ نہیں مانتی کہ شریعت اور قانون بنانا اللہ جل شانہ کا حق ہے بلکہ جمہوریتِ قانون سازی کو اپنا حق مانتی ہے اور کسی چیز کو جائز یا ناجائز کرنا انسان کا حق سمجھتی ہے اور حق و ناحق کے لئے معیار بھی خود متعین کرتی ہے۔

تجربے اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی دنیا میں وہ حکومتیں جو اپنے آپ کو جمہوری یا ڈیموکریٹک حکومتیں کہتی ہیں، مغرب کے شانہ بشانہ اور اسی کے نقشِ قدم پر چلتی ہیں اور اپنی عوام میں مغربی نظام اور قوانین نافذ کرتی ہیں اور اس نظام کی مخالفت کرنے والوں سے طاقت اور بزور بازو دفاع کرتی ہیں، یہ حکومتیں اللہ جل شانہ کے دین کے خلاف علانیہ طور پر جنگ میں

ملوث ہیں۔ ان کی مسلسل یہ کوشش رہتی ہے کہ ملک کے کسی بھی قانون میں کوئی اسلامی شق باقی نہ بچے اور اگر بچ بھی جائے تو اس کے عملی طور پر نافذ ہونے کے خلاف اتنی رکاوٹیں اور شرائط کھڑی کی جائیں کہ عملی زندگی میں اس کی افادیت ہی ختم ہو جائے اور وہ محض ایک نظریہ بلکہ افسانہ ہو کر باقی رہے اس طرح کی جمہوری اور ڈیموکریٹک حکومتوں کے حاکم ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مغربی ثقافت اپنے لوگوں پر مسلط کر دیں اور اس راہ میں وہ اپنی ہی قوم کا بے دریغ خون بہانے کی بھی پروا نہیں کرتے، یہ حکومتیں عوام کے خلاف اتنا کچھ کرنے کے باوجود اپنے آپ کو قومی اور عوامی نمائندوں کی حکومتیں کہتی ہیں لیکن اگر عوام کی اکثریت کبھی ان سے دین اور ملک کے قومی اور مصنوعی اقدار کی حفاظت کا مطالبہ کرے تو اس پر تنگ نظر، بنیاد پرست اور دیگر دقیانوسی قسم کے فرسودہ الزامات لگائے جاتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ اسلامی دنیا میں یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ مسلمان حاکمیت کے میدان میں اپنے مذہبی معیاروں کا پاس رکھنے سے محروم کر دیئے گئے لہٰذا سب کچھ دوسروں کے معیار اور ترازو سے تولنے پر مجبور ہیں۔

۲۔ تعلیم کا میدان

عوام کی ترقی اور زوال کا راز ان کی تعلیم و تربیت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ قوم جو تعلیم و تربیت کے میدان میں دیگر اقوام سے آگے ہو وہ ترقی کے میدان میں بھی دوسروں سے آگے ہوتی ہے اور جب تعلیم و تربیت کا نظام، عوام کے عقائد، افکار، نظریات اور اجتماعی ثقافت سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو پھر اقوام کو اسے ماننے اور اپنانے میں کوئی رکاوٹ اور مشکل پیش نہیں آتی۔ حالات اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں وہ تبدیلیاں لائی جاتی ہیں جو عوام، ملک اور سیاسی حاکمیت کی ترقی کا سبب بنتی ہیں۔

لیکن اگر تعلیم اور تربیت کا نظام ملک کے لوگوں کے دین، اخلاق، سیاسی اور اجتماعی ثقافت کا

ترجمان نہ ہو بلکہ دوسروں کی طرف سے غیروں کے اہداف و مقاصد پورا کرنے کے لئے غیروں ہی کی قومی، دینی، سیاسی، نظریاتی اور معاشرتی بنیادوں پر استوار ہو اور مسلم معاشرے پر زبردستی مسلط کیا گیا ہو تو اس طرح کے تعلیمی نصاب اور نظام کی گود میں پلنے والی نسل نے عملاً یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے دین اور عقائد کے بارے میں نہ صرف یہ کہ بے توجہی کرتے ہیں بلکہ کھلم کھلا دشمنی بھی کرتے ہیں۔ ان کے کردار سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک اور عوام کے مفاد پر دوسرے استعماری ممالک کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں، اپنے نظامِ تعلیم سے نفرت اور مغرب کی تاریخ پر فخر کرتے ہیں اور اپنے لوگوں کو زبردستی کفریہ ممالک کی غلامی پر مجبور کرتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ہوگا تو اس کے ردعمل میں لازمی بات ہے کہ اسلامی فکر اور ثقافت کی حفاظت کرنے والے نوجوانان اسلام اس طرح کے برآمد شدہ حکمرانوں، مغربی گمراہ کن تعلیمی نصاب اور کفریہ نظاموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور ان سے نجات حاصل کریں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہو کہ موجودہ مغربی طرز تعلیم کو اس وجہ سے اپنانا چاہئے تاکہ مسلمان مادی میدان میں آگے بڑھیں اور مغرب کی تعلیم اور ٹیکنالوجی اور تجربات سے فائدہ حاصل کریں۔ یہ بات بہ ظاہر کافی حد تک معقول ہے لیکن اس بارے میں درج ذیل دو اہم باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ا۔ ہمیں اگر ضرورت ہے تو مغرب کے علوم اور ٹیکنالوجی کی ہے نہ کہ ان کی ثقافت، اخلاق، نظریات، دین اور زندگی گذارنے کے فلسفے کی لیکن عالم اسلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری وزارت تعلیم مغرب کے علوم اور تجربات حاصل کرنے کی بجائے ان کی ثقافت کی طرف زیادہ متوجہ ہوتی ہے اور اس کام پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ مصارف اس کی بجائے علوم کے رائج کرنے، تجربہ گاہوں اور لیبارٹریوں کے بنانے اور تعلیمی ساز و سامان، آلات اور وسائل خریدنے پر صرف کیے جاتے تو نتائج موجودہ حالات سے کافی مختلف ہوتے۔

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ مغرب کے تعلیمی نظام اور نصاب کو اپنانا ترقی کا سبب بنتا ہے اور ترقی کرنے کے نتیجے میں یہ ممالک آزاد، خود مختار اور اس کی عوام اپنی حکومت کی مالک ہو جائے گی تو یہ بات بھی تجربے کے خلاف ہے کیونکہ کئی اسلامی ممالک ایسے ہیں جو بہت بلند صنعتی معیار تک پہنچ چکے ہین، بھاری بھر کم ہتھیار اور فوجی آلات بھی بنا چکے ہیں اور بعض نے تو ایٹم بم بھی بنا لئے لیکن پھر بھی حقیقی معنوں میں آزادی حاصل نہ کر سکے اور نہ ہی ان کی عوام اپنی خود مختار حکومت کی مالک بن سکی۔ یہ ممالک اپنے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود بھی استعماری ممالک کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلیمی نصاب اپنے پڑھنے والوں کیلئے اپنی سیاسی اور قومی آزادی کا پیغام نہیں رکھتا۔

اسلامی دنیا کی تعلیمی وزارتوں نے تعلیمی نصاب اس طرح تشکیل دیا ہے اور اس کا معیار ایسا رکھا ہے کہ اس کا پڑھنے والا صرف مغرب کی غلام حکومت کے ہی کام آ سکے، اس بات کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ تعلیمی معیار اتنا بلند ہو کہ اس کے پڑھنے والے نظام سلطنت چلانے کی غیر معمولی صلاحیت حاصل کر کے علم کو نظریے سے عمل کی طرف منتقل کرنے کے قابل ہو سکیں، یہی وجہ ہے کہ کروڑوں مسلم نوجوان اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں دنیاوی علوم جیسے کیمیا، فزکس، ریاضی، بیالوجی، جیالوجی اور دیگر علوم حاصل کر رہے ہیں لیکن ان میں بمشکل ایک فیصد بھی ان علوم کے عملی میدان میں نہیں آتے جس کے نتیجے میں اپنا سیکھا ہوا علم بھول جاتے ہیں۔ اگر بیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں عصری علوم کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر عصری علوم کا دامن پھیلتا جا رہا ہے اتنا ہی اس کے حاصل کرنے والے دین، روحانی صفات، اسلامی اخلاق اور تہذیب سے دور ہوتے جا رہے ہیں، یہ بات تو صحیح ہے کہ عصری علوم رکھنے والوں میں بھی اسلامی فکر کے بڑے بڑے دانشور پیدا ہوئے ہیں لیکن وہ عصری علوم کے مضامین کے نتیجے میں نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اس نصاب اور نظام سے باہر دوسرے کسی دینی ماحول میں رہے نیز ان کو مسلمان مفکرین سے استفادہ اور ان سے دین لینے کا موقع بھی ملا اگر بیسویں

صدی میں اسلامی دنیا کی سیاسی اور تحریکی شخصیات پر نظر ڈالیں تو انمیں ایک چیز جو بہت واضح نظر آتی ہے وہ یہ کہ سیکولر (بے دین) نظام کی طرف داعی تمام جماعتیں اور ان کے ہم نوا اکثر لوگ اسی عصری تعلیم کے ماحول میں پیدا ہوئے جو کہ دینی روح سے خالی ہے اور یہ بات بھی سب مسلمانوں نے دیکھ لی ہے کہ اسلامی دنیا کو ان جماعتوں اور ان کے ہم نوا لوگوں نے کتنا نقصان پہنچایا ہے، انہی بے معنی عصری علوم سیکھنے والوں نے اسلامی دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کو وسطی ایشیا، افغانستان، عرب اور افریقی ممالک میں صرف اس لئے جان سے مار دیا یا قید خانوں میں بند کر دیا کہ انہوں نے باہر سے مسلط کردہ جاہلانہ قوانین اور فرسودہ نظاموں کو نہیں مانا اور اپنے اسلامی اور قومی اقدار کے تحفظ پر مصر رہے اور اس راستے میں کسی قسم کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اگر گہری نظر سے اسلامی دنیا کے تعلیمی ماحول کو دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ تعلیم کے میدان میں ہر چیز مغرب کی طرف سے ڈیزائن شدہ ہے، اور ہر چیز اسی مغربی انداز سے چل رہی ہے جسکے نتائج بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے سامنے آ رہے ہیں جو مغرب چاہتا ہے۔ اس طرح کا تعلیمی انحراف مسلمان دانشوروں سے ایک اجتماعی سوچ کے تحت لاگو کروایا گیا، یہ فساد ایک انقلابی علاج کا تقاضا کرتا ہے لیکن اس علاج کی راہ میں وہ نام نہاد مسلمان حکمران رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جو اسلامی دنیا پر بزور قوت مسلط کئے گئے ہیں۔ اس فساد کا ایک فطری اور طبعی تقاضا یہ ہے کہ امت کے سچے اور مجاہد نوجوان اس رکاوٹ کو ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس مزاحمت کے نتیجے میں کسی حد تک اسلامی ممالک میں کچھ اضطراب، بے چینی اور مشکلات تو پیدا ہونگی لیکن تدبیر، ثابت قدمی اور استقامت سے یہ رکاوٹیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

۳۔ قانون سازی اور نظام حکومت کا محاذ

نظام اور قوانین وہ چیزیں ہیں جو معاشرے اور افراد کے حقوق، لوازمات اور ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں اور معاشرے سے فساد اور بے چینی کا راستہ روکتے ہیں لیکن نظام بنانے اور قوانین کو

حتمی شکل دینے میں معاشرے کے دین، ثقافت، اخلاقی اور معنوی اقدار، سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، تاریخی اور طبعی حالات اور معاشرے کے مجموعی رجحانات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں معاشرے کی ضروریات اور تقاضوں کا نظام اور قوانین کیساتھ تصادم ہو جائے کیونکہ ایسی ناموافق صورتحال میں معاشرے اور قوانین میں کشمکش ایک طبعی نتیجہ ہوتا ہے۔ تصادم کی صورت میں ایک طرف تو لوگ اپنے دینی، اخلاقی اور اجتماعی اقدار کی حفاظت کے لئے کوشاں ہوتے ہیں تو دوسری طرف نظامِ حکومت لوگوں سے قوانین پر عمل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے لئے ضرورت پڑنے پر طاقت سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا فطری اور طبعی فارمولے کی روشنی میں اسلامی دنیا کی موجودہ حالت پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ تقریباً پوری اسلامی دنیا میں عوام اور نظاموں کے درمیان گذشتہ ایک صدی سے نہایت تلخ اور نہ ختم ہونے والی جنگ جاری ہے اس جنگ کے ایک جانب تو مسلمانوں کی وہ عوامی تحریکیں ہیں جو انسان کو اللہ کے بندے شمار کرتے ہیں اور اس کے لئے اللہ جل شانہ کے قانون کو جاری کرنا پوری انسانیت کی سعادت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو اللہ جل شانہ نے پیدا کیا ہے اور وہی ان کی زندگی کے تقاضوں اور ضروریات سے زیادہ واقف ہے اسی لیے اسلام میں یہ ایک طبعی خوبی ہے کہ وہ انسان کے تمام کاموں کو سب سے بہتر اور منظم انداز میں سنبھال سکتا ہے۔ اس رحمانی نظام کی عملی تطبیق کے لئے عوام اور اسلامی تحریکیں اپنے تن من دھن کی قربانی دے رہی ہیں۔

اس جنگ کی دوسری جانب وہ جابر اور سیکولر نظام ہے جو دین اور مسلمانوں کے معاشرے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ان جابر نظاموں نے مغرب اور مغربی استعماری قوتوں کی فتح اور اسلامی قوانین کو مٹانے کے لئے ایسے قوانین بنائے ہیں جو معاشرے کے فطری اور طبعی تقاضوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے اور اس کیساتھ ساتھ اپنی پوری قوت اور دباؤ کو استعمال کرتے ہوئے مسلم عوام پر اپنے نظاموں کی حاکمیت اور اپنے بنائے ہوئے قوانین کے نفاذ کو ایک عرصہ سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس راہ میں لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور آزادی چاہنے والوں کو جان سے مارنے کے لئے بھی ان خودساختہ

قوانین کا سہارا لیتے ہیں۔

مسلم دنیا کے ممالک کے تقریباً تمام بنیادی قوانین، شہری، اقتصادی اور دیگر قوانین گذشتہ ایک یا ڈیڑھ صدی سے مغربی فکر کی بنیادوں پر کھڑے ہیں جو کہ مغرب کی استعماری کوششوں کا نتیجہ ہیں اسلامی دنیا کے ممالک میں تقریباً سارے قومی اور بین الاقوامی فیصلے ان ہی قوانین اور معاہدوں کی روشنی میں پورے کیے جا رہے ہیں جو مغرب کے مفادات کے تحفظ کے لئے وضع کیے گئے ہیں پھر قوانین کے میدان میں نہ صرف یہ کہ علاقائی طور پر ان ممالک میں مغربی طرز کے قوانین نافذ ہیں بلکہ اسلامی ممالک کی حکومتوں سے سختی کیساتھ ان عالمی اور انسانی حقوق کے ضوابط اور اقوام متحدہ کی طرف سے بنائے گئے قوانین کے ماننے کا وعدہ لیا گیا ہے، ان قوانین کو بناتے وقت اسلامی شریعت اور اسلامی معاشرے کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود مغربی ممالک، اقوام متحدہ کے ادارے، امن کونسل اور دیگر مغربی اداروں نے ان قوانین کو ایسی اہمیت دی ہے کہ قرآن وسنت بھی ان کے مقابلے میں ذرہ برابر اہمیت نہیں رکھتے، چنانچہ شرعی قوانین کے نفاذ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں اور اگر کوئی ملک اسلامی نظام حکومت رائج کرنے پر اصرار کرے تو اسے طرح طرح کی تعزیرات اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا پھر کسی ملک میں شرعی قوانین نافذ ہوں تو اُس شرعی نظام کا خاتمہ کرنے کے لئے بغاوتیں اٹھائی جاتی ہیں یا داخلی انتشار پیدا کرنے کے لئے بعض اقلیتیں حقوق مانگنے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور پھر اقوام متحدہ ان کی ہر قسم کی مدد کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ اس قسم کے غیر فطری اور بالجبر مسلط کردہ نظاموں اور قوانین سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے طویل عرصے سے مختلف تدابیر کو بار بار آزمایا گیا، لیکن مسلسل صبر اور برداشت کے بعد مسلمان مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سے چھٹکارے کا بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے مسلح جہاد اور انقلاب کے لئے کھڑے ہونے کا راستہ جس کے کامیاب ہونے کی صورت میں ان کے خود ساختہ قوانین اور نظامہائے زندگی مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے اور اس کی جگہ اسلامی قوانین نافذ ہو جائیں

گے پھر دوسرے مرحلے میں ان سے دفاع کے لئے سیاسی ،نظریاتی ،اجتماعی ،عسکری اور علمی میدانوں میں ان تھک کوششیں بروئے کار لائی جائیں۔

۴۔ عسکری میدان اور امن وامان

ہر ملک کی فوج اور دیگر عسکری ادارے جو اس غرض سے بنائے جاتے ہیں کہ اس ملک کے باشندوں کے لئے ایک اطمینان بخش فضا قائم کریں، ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کریں، ملک اور اس کی عوام پر بیرونی حملے کا راستہ روکیں اور بوقت ضرورت حق کو نافذ کرنے اور اس کے دفاع کے لئے بہادری سے لڑیں نیز عوامی امن سے متعلق اداروں کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ ملک کے آئین میں نافذ شدہ قوانین کو عملی طور پر جاری کروائیں، ہر قسم کے ظلم اور فساد کا راستہ روکیں اور امن قائم کرنے کے لئے جرائم پیشہ افراد کا تعاقب کریں، معاشرے میں ان کے ٹھکانے تلاش کر کے انہیں ختم کریں اور بوقت ضرورت فوج کیساتھ مل کر دشمن کے خلاف لڑیں، ایک بااختیار فوج اور امن عامہ سے متعلق اداروں کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے دین، عقیدے، ملک اور اس کی ثقافت کو ایک مثالی نظام اور بے مثل لائحہ عمل کی حیثیت سے پہچانیں اور اس کو عملی شکل دینے میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے پر عزم رہیں تاکہ وہ اپنی ذات کو چند ٹکوں کی تنخواہ کے بدلے ایک مزدور کی حیثیت سے نہ جانے بلکہ انہیں اپنی ذات میں ہمہ وقت ملک وملت کی خاطر قربانی دینے والا ایک مجاہد نظر آئے اور اپنی ذمہ داری کو اللہ جل شانہ کے خوف اور اخروی باز پرس پر یقین رکھتے ہوئے پورے جذبے سے سرانجام دیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی فوج کو اسی جذبے کے تحت تیار کیا تھا اور اس محمدی لشکر کا تا آخر یہی جذبہ رہا اسی لئے تو انہوں نے بہت کم وقت میں جزیرۃ العرب اور اس کے آس پاس سے کفر وشرک کا ایسا خاتمہ کر دیا کہ وہ دنیا کی ایک بڑی طاقت بن گئے اور اتنی عسکری قوت حاصل کر لی کہ اس وقت کی عالمی قوتیں ’فارس‘ اور ’روم‘ بھی اپنی سالمیت کے بارے میں فکرمند ہونے لگیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور تابعین کے اسلامی عقیدے سے سرشار لشکر نے نہ صرف

یہ کہ بہت تھوڑے عرصے میں ایک بڑی بااختیار حکومت تشکیل دی جس کی سرحدیں چین اور تو قاز سے لیکر مراکش تک پھیلی ہوئی تھیں یہاں تک کہ ہند اور بحر متوسط کے سمندروں پر ان کا راج تھا بلکہ اس دور میں دنیا کی عالمی طاقتیں اور بڑی مملکتیں یہ کوشش کرتی تھیں کہ اپنی بقا کے لئے اسلامی مملکت کی حمایت حاصل کریں لیکن اس کے برعکس اگر دور حاضر کے اسلامی ممالک کی فوجوں کو دیکھیں تو نظر آئے گا کہ ان کی ہر چیز اپنے ماضی کے برعکس غیروں کے معیاروں پر قائم ہے جن میں سے چند اہم امور کو ہم درج ذیل ترتیب سے بیان کرسکتے ہیں:

۱۔ آج کی اسلامی دنیا کی فوجیں دین اور دینی اقدار سے بہت دور رکھی جاتی ہیں ان کی تربیت اور نصاب میں دین، عقیدہ، آخرت، اسلامی تاریخ اور اسلام کی فوجی تاریخ کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کے برعکس اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ افواج اور امن عامہ سے متعلق اداروں کو سیکولرزم (بے دینی) کے اصولوں کے مطابق ترتیب دی جائے تا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لئے کسی قسم کی احساس ذمہ داری اور اس سے وفاداری کا خیال تک باقی نہ رہے اور وہ کبھی بھی اپنے جابر حاکم کے حکم کی جگہ شرعی اوامر اور احکام کو ترجیح نہ دیں۔

۲۔ اسلامی دنیا کی فوجوں کو عملاً استعماری ممالک کے فوجی ماہرین اور استاذوں کی طرف سے مغربی یا روسی نصاب اور معیار کے مطابق ترتیب دی جاتی ہے اور فوجی افسران اعلی تعلیم و تربیت کے لئے استعماری ممالک (امریکا، برطانیہ، فرانس وغیرہ) میں بھیجے جاتے ہیں تا کہ وہ ان کے فوجی کالجوں میں تعلیم حاصل کریں جس سے ان کے دل و دماغ کو ہر قسم کے اسلامی افکار اور نظریات سے خالی کر دیا جائے، چنانچہ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مغرب نے اپنے ان ہی تربیت یافتہ فوجی افسران کے ذریعے اُن کے اپنے ممالک میں مغربی مفادات کے تحفظ کی خاطر بغاوتیں کھڑی کیں اور اُن افسروں نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے اپنے ممالک کے قوانین کو پامال کیا اور اس کے بعد فوج اور دیگر عسکری ادارے بھی انہی باغیوں کے حکم پر چلتے رہے۔

اسلامی دنیا کے ممالک کی فوجیں مختلف قسم کے معاہدوں اور قراردادوں کے ذریعے ایسے انداز سے مغربی ممالک کیساتھ جڑی ہوئی ہیں کہ ان کی اجازت اور مشورے کے بغیر کوئی اقدام بھی نہیں کرسکتیں، ہر قسم کا اسلحہ، جہاز، فوجی ساز و سامان، آلاتِ حرب اور لاجسٹک وسائل ایسی قراردادوں کے بعد استعماری ممالک کی طرف سے ان کو مہیا کیے جاتے ہیں کہ کسی بھی طرح سے ان سے اسلام کے دفاع کے لئے کام نہ لیا جاسکے۔

آج کی فوجوں میں وہی افسر بلند مرتبے تک پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے مکمل طور پر دین اور دینی اقدار کو پس پشت ڈال دیا ہو اور استعماری قوتوں کے قابل اعتماد ساتھی بن گئے ہوں، ترقی اور تنزل کے لئے ایسے معیار اور شرائط مقرر کئے گئے ہیں کہ دینی فکر رکھنے والے افسر کبھی بھی ان پر پورے نہیں اتر پاتے اگر کہیں کوئی مسلمان اپنی فوجی قابلیت، لیاقت اور فرائض نبھانے کے قابل ہونے کی وجہ سے بلند رتبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اسے بھی مختلف بہانوں کے ذریعے قیادت کے رتبے سے دور رکھا جاتا ہے اور اسے مختلف طریقوں سے بدنام کیا جاتا ہے مثلاً بغاوت یا کسی اور جرم کے بہانے اسے معزول یا گرفتار کر کے زندہ لاپتہ کر دیا جاتا ہے۔

آج کی اسلامی دنیا کی عسکری قوتیں بجائے اس کے کہ اپنے ملک اور مقدس مذہبی شعائر کا دفاع کریں اور معاشرے کے جرائم پیشہ اور فسادی لوگوں کا راستہ روکیں اور معاشرے کے پاک باز لوگوں کو شریر اور ظالم لوگوں کے ظلم سے بچائیں وہ خود ہی اپنی عوام کے خلاف لڑتے ہیں، غیروں کی خواہش پر اپنے ہی لوگوں کے خلاف عسکری قوت استعمال کرتے، ان پر بم برساتے اور اپنے ہی لوگوں سے اپنے قید خانے بھرتے ہیں۔ اپنے ہی ہم وطنوں کو گھربار چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں، دین داروں کی بجائے پولیس مجرموں، مفسدوں، قومی غداروں اور فحاشی پھیلانے والوں کا ساتھ دیتی اور ان کی حفاظت کرتی ہے لیکن اس کے برعکس معاشرے کے نیک سیرت، علماء، مجاہدین، قومی نمائندوں اور اسلامی شخصیتوں کو ڈرایا جاتا ہے، قتل کیا جاتا اور قید خانوں کی تاریکیوں میں پھینک دیا جاتا ہے، یہی

ادارے لوگوں کو اسلحے اور طاقت کے زور پر اسلام کے قریب آنے سے روکتے ہیں، اسلام پسندوں اور مجاہدین کو پکڑ کر ان کو کوڑیوں کے مول کفریہ ممالک کے ہاتھوں بیچتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ جن کے ہاتھوں میں زمام کار ہے وہ دوسروں کی فکر اور اہداف واغراض کے حصول کے لئے تربیت دیئے گئے اور تیار کیے گئے ہیں۔

کئی بار یہ دیکھا گیا ہے کہ مسلم ممالک کی فوجیں دشمن سے دفاع کی بجائے ان کا ساتھ دیتی ہیں، اپنی ہی ملت کے خلاف لڑتی ہیں اور استعمار کی بقا کے لئے قربانی دیتی ہیں۔ اس کی واضح مثال دیکھنا ہو تو افغانستان کو دیکھیں کہ اس کی فوجیں روسی حملے کے وقت اس کیساتھ کھڑی ہوئیں اور اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت کے بچے ہوئے افغانی فوجی آج امریکہ کے شانہ بشانہ اپنی ملت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

جب مسلم ممالک کی فوجوں اور امن عامہ کے اداروں کا یہ حال ہو تو اس کا طبعی ردعمل یہی ہوگا کہ مسلم ملتوں کے باشعور، غیرت دین سے سرشار اور آزادی سے محبت رکھنے والے نوجوان ایک مثبت تبدیلی کے لئے اس قسم کی فوجوں اور عسکری اداروں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دیں چاہے یہ جدوجہد انہیں کتنی ہی مہنگی کیوں نہ پڑے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا رستہ ایسا نہیں جس سے یہ مسئلہ حل ہو سکے کیونکہ سیکولر (بے دین) فوج، غیروں کے ٹکڑوں پر پلے ہوئے جنرل اور غیروں کی مسلط کردہ حکومتیں اور ان کے حاکم زبان کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں اپنے استعماری آقاؤں کی طرف سے انصاف پر مبنی بات سننے کی اجازت ہوتی ہے۔

۵۔ میڈیا کا میدان

کسی معاشرے میں میڈیا کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں میں عام سمجھ داری اور ان کو اجتماعی طور پر صحیح راہ پر گامزن کرے۔ لہٰذا اس سلسلے میں میڈیا کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان تفریق کا سبب نہ بنے بلکہ تمام طبقات زندگی اور معاشرے

کے ہر سطح کے لوگوں کے نظریاتی شعور کو بلند کرنے کے لئے کام کرے، لوگوں کے حالات سے باخبر رہے اور ان کے دینی، قومی، ثقافتی اور اجتماعی اقدار کی خود بھی حفاظت کرے اور اس کا دفاع کرنے والے افراد اور اداروں کو بھی اپنی ذمہ داری کی طرف متوجہ رکھے، حکام اور با اختیار لوگوں کے کاموں کی مثبت انداز میں نگرانی کرے، نظریاتی اور ادبی کاوشوں کے لئے معاشرے کے با استعداد لوگوں کو سامنے لانے کا کردار ادا کرے اور معاشرے کے تفریحی ذوق کو پورا کرنے کے لئے ایسا ادبی مواد وجود میں لائے جو معاشرے کے افراد میں احساسات خیر اور اونچے انسانی اہداف کو حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کرے اور ہر قسم کی ظلم و زیادتی اور شرانگیزی سے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرے۔

اس وقت میڈیا اپنی تاریخ کے سب سے بلند مقامِ عروج کو پہنچا ہوا ہے جس کو عموماً تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

الف۔ اشاعتی میڈیا

مثلاً کتابیں، رسائل، اخبارات اور اس طرح کے دیگر جرائد جو کثیر تعداد میں رنگین اور دلکش ڈیزائن میں چھاپے جاتے ہیں اور معاشرے کے تقریباً تمام پڑھے لکھے طبقوں تک پہنچتے ہیں لیکن چونکہ ان پڑھ لوگ مطبوعات نہیں پڑھ سکتے اس لئے ان کے لئے صوتی (سننے والا) اور تصویری میڈیا سے کام لیا جاتا ہے۔

(ب) صوتی میڈیا

مثلاً ریڈیو، کیسٹ، سی ڈیز، ایم پی تھری وغیرہ جو آسانی سے ہر ہر فرد کو ہر جگہ باآسانی پہنچائے جا سکتے ہیں اور اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ریڈیو سب سے اہم ذریعہ ہے جو کسی علاقے کے دور دراز پہاڑوں اور صحراؤں تک اپنی آواز پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(ج) تصویری میڈیا

تصویری میڈیا جیسے ٹیلی ویژن، سینما، تھیٹر اور دیگر ذرائع وغیرہ ہر واقعے کو لوگوں کے سامنے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں اور دیکھنے والوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ جس قدر میڈیا کی صورتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور اس کی کیفیت میں ترقی ہوتی جا رہی ہے، ساتھ ساتھ اس کی تاثیر کا دائرہ کار بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کل بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کے میڈیا کا کنٹرول یہود اور استعماری ممالک کے ہاتھوں میں ہے اور تقریباً تمام اسلامی ممالک کا میڈیا بھی انہی کے زیر اثر ہے، عالمی یہودی منصوبوں کے بارے میں سب سے خطرناک کتاب ''یہودی پروٹوکولز'' جو پوری دنیا پر کنٹرول کے لئے یہودی ماہرین کے نظریات اور منصوبوں کا مجموعہ ہے، اس کتاب میں وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

> ''دنیا کا پورا میڈیا ہمارے ہاتھوں میں ہے اگر کہیں کوئی ایک آدھ رسالہ آزاد رہ بھی جائے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ بھی کسی نہ کسی طرح ہمارے مقاصد کے حصول کے لیے کام پر لگا دیا جائیگا''

اسی طرح دوسری جگہ لکھا ہوا ہے کہ:

> ''یہ ضروری اور لازمی ہے کہ دنیا کے تمام نشریاتی اور فکر و نظریات پھیلانے والے ادارے ہمارے کنٹرول میں ہوں۔ اگر کہیں کوئی ادارہ ہماری مخالفت کرے تو ہم اس کو بند کرنے کے لیے قانونی راستوں سے کام لینگے۔''

اسی طرح لکھتے ہیں:

> ''دنیا میں بہت سارے رسالے اور اخبار ایسے ہونگے جو بظاہر دوسرے افکار اور نظریات پھیلا رہے ہونگے لیکن در پردہ سب ہمارے اہداف کے لئے ہی کام کر رہے ہونگے۔''(۱)

---

۱) دنیا کے موجودہ ادیان اور مذاہب کا مختصر انسائیکلو پیڈیا، یہودیت کی بحث ۱/۲۶-۵۲

اگر ہم اسلامی ممالک میں میڈیا کی ہر قسم کی موجودہ عملی حالت کو دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ یہ میڈیا اسلامی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی بجائے مغرب کے مفاد اور مغرب کے سیاسی، فکری، اجتماعی اور اقتصادی اہداف کے لیے کام کر رہا ہے، مثال کے طور پر مسلمانوں کے پاس اپنے ٹی وی چینلز تو ہیں لیکن بجائے اس کے کہ ان کے ذریعے لوگوں کے سامنے اسلامی اور ملی اقدار کا تعارف کرایا جائے، الٹا دن رات مغربی طرز پر زندگی گزارنے کی تلقین کی جاتی ہے، ایسے واقعات اور پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مسلمان ناظرین کے دلوں میں اسلامی اقدار اور اپنے قومی اور تاریخی اقدار اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمان خواہش پرستی، فیشن اور مغربی معاشرے کی تقلید پر آمادہ ہو جاتے ہیں، نوجوان مردوں اور عورتوں کو مسلم معاشرے اور اس کے طور طریقوں کے خلاف آزادی کا نام لے کر بغاوت پر آمادہ کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اسلامی ممالک کے پاس ریڈیو چینلز تو ہیں لیکن اس کی نشریات ٹیلیویژن کی نشریات کی طرح زندگی کے ہر انداز میں غیروں کے مقاصد اور اہداف نشر کرتی ہیں، اگر کہیں ایک آدھ پروگرام اسلام کے لیے ہو بھی تو نامکمل، سطحی اور صوفیانہ طرز کا ہوتا ہے، اسلام کی حاکمیت، اسلامی نظام اور صحیح عقیدے کے پرچار کے لئے ان میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی، مزید برآں یہ کہ اس طرح کے برائے نام اسلامی پروگراموں کے ذریعے اسلامی مفاہیم کی مسخ شدہ تصویر پیش کی جاتی ہے اور وہ چیز اسلام کے نام پر متعارف کرائی جاتی ہے جو حقیقت میں اسلام تو کیا اسلام کے مخالف ہوتی ہے۔

ریڈیو اور ٹیلیویژن کی طرح مطبوعاتی میڈیا (پرنٹ میڈیا) کے وسائل جیسے اخبار، رسالے، ناول اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، تقریبا ۹۵ فیصد ایسے اداروں اور مصنفوں کی طرف سے شائع ہوتی ہیں جو مغرب کے یا تو تربیت یافتہ ہوتے ہیں یا مغربی افکار و نظریات سے متاثر اور سیکولرزم (بے دینی) کو اپنی زندگی کے لئے بطور لائحہ عمل کے قبول کیے ہوتے ہیں، ایسے لوگ سیکولرزم کے اصولوں کی بنیاد پر ملک اور عوام کی اجتماعی زندگی میں شریعت اور دین کی موجودگی پر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ مغربی طرز

کی آزادی اور ان کے معیار کے مطابق انسانی حقوق لوگوں کو دلانے کے لئے تگ و دو میں لگے رہتے ہیں اور دن رات اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح ان اجنبی مفاہیم اور اقدار کو مسلمانوں کے ذہنوں پر تھوپیں۔

اس سلسلے میں اس قسم کے لوگوں کو تمام اسلامی شعائر اور شرعی اقدار پر حملہ کرنے کے لیے ایک خطرناک اسلحہ جو مغربی دنیا نے ان لوگوں کو دے رکھا ہے وہ ''آزادی اظہار رائے'' کا نظریہ ہے وہ لوگ جو مغرب کے نظریات اور مغربی تعلیمی نصاب کے تربیت یافتہ ہیں اور میڈیا ان سے اسلامی شعائر کے خلاف کام لے رہا ہے، جب بھی ان کے مذہبی جرائم کے خلاف لوگوں میں نفرت ابھرتی ہے تو مغربی دنیا اور اسلامی دنیا میں ان کے مسلط کردہ حاکم ان مجرموں کو ''آزادی اظہار رائے'' کے قانون کے تحت نا قابل مؤاخذہ قرار دیتے اور ان مجرموں کا ہر طرح سے دفاع بھی کرتے ہیں۔

میڈیا کے میدان میں نہ صرف یہ کہ خود اسلامی دنیا کے اندر فساد اور تباہی کا دور دورہ ہے بلکہ بیرونی دنیا کی طرف سے بھی ہر روز ہزاروں ریڈیو اور ٹیلیویژنوں کی نشریات مسلم ممالک پر اثر انداز ہو کر امت مسلمہ کی نظریاتی تباہی کا باعث بن رہی ہیں۔ انٹرنیٹ اور کیبل نے اسلامی ممالک کی نظریاتی اور اخلاقی فضا پر مغرب کے تسلط کو اور بھی آسان کر دیا۔

اسلامی دنیا میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے میڈیا کے میدان خالی پڑے ہیں بلکہ ان کو پُر کرنے کے لیے مؤثر کوششیں بھی نہیں کی جاتیں پھر اس کے علاوہ اسلامی تحریکوں کے لیے ایک دوسری فکر کی بات یہ بھی ہے کہ میڈیا اور مطبوعات کے میدان میں امت مسلمہ کو اس لیے بھی برے وقت کا سامنا ہے کہ اس میدان میں مسلمان غیروں کا معیار اپنائے ہوئے ہیں۔

۶۔ معاشرتی زندگی اور ثقافت کا میدان

دنیا میں ہر قوم اور ہر ملت کی اپنی ایک جداگانہ، ثقافت اور معاشرت ہوتی ہے جو اس قوم کی اجتماعی پہچان کا مظہر ہوتی ہے اور ہر قوم جس دین کا عقیدہ رکھتی ہے وہ اس پر عمل کے ساتھ ساتھ مسلسل

یہ کوشش کرتی رہتی ہے کہ ان کا ملی تشخص برقرار رہے اور کسی دوسری قوم اور ملت کی تہذیب میں خلط ملط نہ ہو جائے۔

اگر کسی مذہب کے لوگ اپنے قومی لباس، اپنی ثقافت، پہچان اور دیگر تشخصات سے ہاتھ دھو بیٹھیں تو پھر وہ جتنے بھی پڑھے لکھے، ہوشیار اور مادی لحاظ سے ترقی یافتہ ہوں پھر بھی وہ ایک مستقل ملت نہیں کہلاتے، بلکہ دنیا میں مذہبی اعتبار سے ان کا تشخص ہی ختم ہو جاتا ہے۔

مسلمان بھی دنیا کی دیگر قوموں کے درمیان اپنی علیحدہ ثقافت اور اجتماعی زندگی میں الگ پہچان رکھتے ہیں اور اگر یہ فرق (الگ حیثیت) ختم ہو جائے تو پھر ان کے اور کافروں کے درمیان ظاہری طور پر کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ہر قوم کی ثقافت، زندگی کا انداز، لباس، عادات رسم ورواج اور خاص تہوار اس قوم کے دین، اعتقاد، اخلاق، تاریخ، طبیعی اور جغرافیائی محل وقوع کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں جن کا چھوڑنا حقیقت میں اپنی جان اور اپنی قوم سے اجنبی ہونے کے مترادف ہے۔

جس دن سے اسلامی دنیا کے ممالک مغربی استعمار کے زیر تسلط اور اس کی ذہنی غلامی میں آئے ہیں اسی دن سے مغرب کی یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی وہ مغربی طور طریقوں کے مطابق ہو۔ اس کوشش سے ان کا مقصد اپنے تین اہم ہدف حاصل کرنا ہے، جو کہ درج ذیل ہیں:

الف: مسلمانوں کی ثقافت جو ایک اسلامی ثقافت ہے اور ہر لحاظ سے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار اسلامی شریعت ہے، مغرب چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اسلامی ثقافت اور معاشرتی طرزِ زندگی سے ہٹا دے اور اسلامی ثقافت اور اسلامی معاشرے کو دنیا کے سامنے پس ماندہ، رجعت پسند اور دورِ حاضر کے مزاج سے گرا ہوا ظاہر کرے اور اس کی جگہ انہیں مغربی ثقافت، عادات، رسم ورواج، لباس اور اپنی طرزِ زندگی کی طرف مائل کرے تاکہ اس کے ذریعے وہ مسلمانوں اور اسلام کے درمیان تفریق

پیدا کر دے۔ یہ مغرب کا ایک بنیادی ہدف ہے تاکہ جب مسلمانوں اور مغرب کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی یکساں ہو جائیں اور مغرب معاشرتی اور ثقافتی میدان میں مسلمانوں کے لیے ماڈل اور نمونے کے طور پر متعارف ہو جائے تو پھر یہ ایک طبعی بات ہوگی کہ مسلمانوں کے دل سے مغرب کے مسیحی اور یہودی معاشرے کی نفرت خود بخود نکل جائے گی اور پھر انھیں یہ لوگ اپنے دشمن نہیں بلکہ دوست اور تہذیب و تمدن کے قابل تقلید نمونہ نظر آئیں گے لہٰذا مسلمان ان کی پیروی کو ضروری سمجھیں گے اور ان سے دشمنی کو برا جانیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں کے سامنے دشمن کے طور پر متعارف کروایا ہے اور مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ چنانچہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (المائدۃ:۵۱)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! یہودیوں اور نصاریوں کو یار و مددگار نہ بناؤ یہ خود ہی ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں اور تم میں سے جو شخص ان کی دوستی کا دم بھرے گا تو پھر وہ انہیں میں سے ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

ب: مغرب یہ چاہتا ہے کہ ثقافت اور تہذیب میں مسلمانوں کو اپنے پیچھے چلائے اسی لیے مغربی میڈیا امت مسلمہ کو مغربی ثقافت اور مغربی معاشرت پر ابھارتا ہے بلکہ مغرب نے اپنے قومی یادگار دنوں، قومی عادتوں، قومی جشنوں اور رسوم و رواج کو اقوام متحدہ، یونیسکو اور دیگر عالمی اداروں کے ذریعے ”عالمی دن“ قرار دیا ہے تاکہ دنیا کی تمام اقوام ان دنوں کا احترام کریں اور ان دنوں کو قومی سطح پر منائیں، اسی لئے مغرب جن کا سرخیل امریکہ ہے، اپنی ثقافت کو عالمی ثقافت اور اپنے نظام کو عالمی نظام کا نام دیتا ہے۔ بدنصیبی سے مسلمان اپنی ثقافت اور اپنے معاشرتی رسم و رواج بھی غیروں کے

معیار پر چلا رہے ہیں یہ امت مسلمہ کا ایک دوسرا المیہ ہے۔

ج: مسلمانوں کو مغربی طرزِ زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش سے مغرب کا تیسرا ہدف یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں مغربی ثقافت، فیشن اور عادتوں کو نشر کر کے مسلمانوں میں مغربی زندگی کی ضروریات پیدا کرے اور ان خود ساختہ ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے اپنی صنعتوں اور کارخانوں کو کام پر لگائے اور اس طرح اسلامی ممالک کو اپنے لیے ایک نئے منافع بخش بازار میں تبدیل کر دے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جب تک مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں واپس اپنے اسلامی طور طریقوں اور معیاروں کی طرف نہیں لوٹیں گے اور مغرب کی اندھی تقلید سے اپنے آپ کو نہیں نکالیں گے اس وقت تک مسلمان اچھا دن نہیں دیکھ سکتے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کی حالت میں مثبت تبدیلی اس وقت تک نہیں لاتے جب تک کہ وہ قوم اپنے کردار، عقائد، نظریات، ثقافت، عادتوں اور رواجوں میں خود ایک مثبت تبدیلی لانے کا پکا عزم نہ کر لے۔

جمہوریت کفر ہے

یا اسلام؟

الله
بسم الله الرحمن الرحيم

جمہوریت کفر ہے یا اسلام؟

افغانستان پر امریکی حملے کے بعد اس کی سیاسی اور نظریاتی تہذیب میں جن اصطلاحات نے سب سے زیادہ رواج پایا ان میں سے ایک ''جمہوریت'' بھی ہے۔ افغانستان میں سرگرم مغربی میڈیا نے مغرب کی سیاسی بنیادوں پر قائم مغرب کی کٹھ پتلی افغان حکومت اور اس کے تمام اداروں اور نظریاتی شخصیتوں نے سب سے زیادہ جمہوریت کا پرچار کرنے اور اس کو نافذ کرنے کے لئے کام کیا۔

افغان عوام کو جمہوریت کے اصل مفہوم اور فلسفے سے بے خبر رکھا گیا بلکہ مغربی جمہوریت کی اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے ایسی خوشنما اصطلاحات ایجاد کی گئیں کہ جن کے ظاہری الفاظ سے عقل دھوکے میں آجائے جیسے آزادئ اظہارِ رائے، عدالت، مساوات، انسانی حقوق، سول سوسائٹی، قانون، ترقی اور اس جیسے دوسرے ناموں کا پرچار۔ ان بظاہر خوشنما اصطلاحات کی وجہ سے افغان عوام نے جمہوریت کو قبول کرنے میں کچھ حرج محسوس نہیں کیا بلکہ جمہوریت کی تشہیر اور اس کو نافذ کرنے کے کام کو کفر اور عیب سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔

جمہوریت کے اصل مفہوم اور اس کی حقیقت کی وضاحت اور تشریح نہ ہونے کی دوسری بنیادی وجہ جس کی وجہ سے مسلمانوں کی جمہوریت سے نفرت اور الرجی (حساسیت) کم ہو رہی ہے وہ ان مولویوں، شیخوں، پیروں اور سابقہ جہادی مرتد لیڈروں کا کردار ہے جنہوں نے چند ڈالروں کے عوض اپنے ایمان، غیرت، جہاد، قومی خودمختاری اور آزادی کو امریکہ کے ہاتھ بیچ دیا اور ابھی تک اپنا قبلہ درست نہیں کیا بلکہ امریکہ نے انہیں اسی خدمت پر لگایا ہوا ہے تاکہ ان کے مذہبی رنگ اور روحانی وجاہت کی وجہ سے جمہوریت کی اصل کفری حقیقت لوگوں سے مخفی رہے۔

اس سے پہلے روسی کمیونسٹوں نے بھی افغان عوام میں کمیونزم کو اجتماعی عدالت، انسانی مساوات، ترقی اور روزگار کے نام سے متعارف کرایا اور انہوں نے بھی کمیونزم، الحاد اور دین سے انکار کو اس جیسے مفاہیم اور اصطلاحات کے ذریعے چھپائے رکھا۔ اگر کل کمیونزم کی حاکمیت سے پہلے علماء کرام

اور اسلامی فکر رکھنے والوں نے عام لوگوں کو کمیونزم کا اصل مفہوم بڑے پیمانے پر اور موثر طریقے سے سمجھایا ہوتا تو سینکڑوں افغان عوام اور نوجوان اس طرح کمیونزم کے پرچم تلے کھڑے نہ ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے بھائیوں اور مجاہدین کے خلاف کمیونزم کے مفاد کے لئے لڑتے۔

آج امریکہ اور اس کے موالی پوری اسلامی دنیا پر زبردستی جمہوریت تھوپ رہے ہیں اور اس راہ میں اربوں ڈالر صرف کر رہے ہیں، ہزاروں این جی اوز، لاکھوں فوجی اور درجنوں مسلّط کی ہوئی حکومتوں کو اپنا ہدف پورا کرنے کے لئے لگائے ہوئے ہیں تاکہ اسلامی مملکتوں میں جمہوریت کو پروان چڑھایا جائے، اسی جمہوریت کو نافذ اور مضبوط کرنے کے لئے عراق میں سات لاکھ سے زیادہ، افغانستان میں ایک لاکھ سے زیادہ اور صومالیہ میں سینکڑوں لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا اور ابھی تک اس جمہوریت کے لئے قتل عام جاری ہے تاکہ جمہوریت حاکم ہو جائے اور اس کی مخالفت کرنے والے عناصر راستے سے ہٹ جائیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جمہوریت کے لئے کردار ادا کرنے والوں کے اتنے بڑے جرائم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم مغربی جمہوریت کا بغور گہرا مطالعہ کریں، اس فلسفے کو اچھی طرح جان لیں اور یہ معلوم کر لیں کہ جمہوریت کفر ہے یا اسلام؟ اس لئے کہ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن امریکہ اس سرزمین سے چلا جائے گا لیکن جمہوریت پرست اور جمہوری افکار کو اپنے نائب یا خلیفہ کے طور پر چھوڑ جائے گا اور پھر یہ علاقائی جمہوریت پرست اسلام کی حاکمیت روکنے کے لئے مختلف طریقوں سے کوششیں جاری رکھیں گے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ مجاہدین میں ایسے لوگ پیدا کرنے میں لگا ہوا ہے جو اعتدال پسند ہوں اور جمہوری عناصر کے ساتھ ایک مشترکہ نظام میں گزارہ کریں اور معمولی اختیار اور معمولی فائدے حاصل کرنے کے بدلے ان مخلص مجاہدین پر حاکمیت کا دروازہ بند کر دیں جو کہ افغانستان میں خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے کام کر رہے ہیں اس لئے درج ذیل بحث میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ جمہوریت کو دو نقطوں میں محدود کر کے اس کی وضاحت کریں۔

۱۔ جمہوریت کیا چیز ہے؟

۲۔ جمہوریت کفر کیوں ہے؟

کسی بھی نظریے اور عقیدے پر کوئی حکم لگانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس نظریے کو اُس کے ہر رُخ سے پہچانا جائے اور سارے تاریخی، فلسفی، واقعی اور عملی زاویوں کو سمجھا جائے تاکہ صحیح نتیجہ حاصل ہو جائے اور دلائل کی روشنی میں اس پر حکم لگایا جا سکے۔ اُصولی لحاظ سے یہ بات بھی ضروری ہے کہ کسی نظریہ کو چھیڑنے اور اس پر حکم لگانے کے لئے اسے اس کی اصلی شکل میں واضح کیا جائے، مثال کے طور پر اگر کوئی اسلام پر بحث کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس اسلام پر بحث کرے جو کہ اللہ کی طرف سے محمد ﷺ پر مکہ اور مدینے میں نازل ہوا جو کہ قرآن کریم، احادیث نبوی اور اس زمانے کے مسلمانوں کے فہم کی صورت میں محفوظ ہے نہ کہ وہ اسلام جو مغرب کے نشریاتی اداروں نے مرتب کیا ہے۔ اسی طرح اگر جمہوریت پر بحث کی جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اُسی جمہوریت کو زیر بحث لایا جائے جسے مغرب نے خود ایجاد کیا، اس کے لئے اُصول وضع کئے اور اسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ وہ جمہوریت نہیں جسے مغرب نے اپنے ہم نوا مذہبی علماء اور دانش وروں کے ذریعے اسلام کی پیوند کاری کر کے متعارف کرایا ہے۔ اگر اس طرح نہ کیا جائے تو ہر چیز اپنی اصلی حقیقت میں نظر نہیں آئیگی اور اس کو سمجھنے میں کوئی نہ کوئی تشنگی اور اشکال باقی رہ جائے گا۔

لہٰذا اس بحث کو واضح اور مرتب انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لئے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ جمہوریت کے تعارف پر مشتمل ہے جو کہ مختصر ہے اور دوسرا حصہ قدرے تفصیل کے ساتھ ہے جو جمہوریت کے محاکے اور اس کی تکفیر (کفر ہونے) کے دلائل پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: جمہوریت کا تعارف

جمہوریت کی تعریف

لغوی اعتبار سے لفظ ''جمہوریت'' ایک انگریزی لفظ Democracy کا ترجمہ ہے جو کہ دو یونانی الفاظ پر مشتمل ہے۔

پہلا: (ڈیموس) Demos جو کہ عوام کے معنی میں ہے اور دوسرا حصہ (کراتوس) Cratos اختیار اور حکم کے معنی میں ہے چنانچہ ان دونوں کو ملا کر جمہوریت کا مطلب، عوامی اختیار یا عوامی حاکمیت ہے۔

اصطلاح میں علمائے مغرب نے جمہوریت کی تعریف اس طرح کی ہے:

Governement of the People by the People for the People

یعنی ''عوام کی حکومت عوام کے ذریعہ عوام کے لئے۔''

حکومت یا حاکمیت کی دو صورتیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک تو ملک کے لئے قوانین اور نظام بنانے کی صورت ہے اور دوسری صورت ان کی عملاً تنفیذ کی ہے، جمہوریت کا حاصل یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ اور زاویے پر پیش آنے والے ہر ہر مسئلے کے حل کے لئے قوانین لوگوں کی طرف سے وضع کئے جائیں اور حاکم بھی لوگوں ہی کی طرف سے منتخب کیا جائے اور فیصلہ بھی لوگوں کی طرف سے منتخب شدہ نمائندہ کرے، دین، وحی یا آسمانی رسالت کے لئے جمہوریت میں کوئی جگہ نہیں۔

مندرجہ بالا لغوی اور اصطلاحی تعریفوں کے تناظر میں جمہوریت کی مکمل تعریف کی مندرجہ ذیل شکل حاصل ہوتی ہے:

''جمہوریت زندگی گزارنے کے ایک ایسے سیاسی اور اجتماعی نظام کا نام ہے جو ہر قسم کی دینی قیدو بند سے آزاد ہو اور اُس میں حاکمیت، تشریع اور فیصلے لوگوں کی طرف سے اور لوگوں کی اکثریت کے مفاد کے لئے انجام پاتے ہوں۔''

جمہوریت کی نظریاتی بنیاد

عصری جمہوریت نے مغرب میں جنم لیا ہے، یہ بات ایک حقیقت ہے کہ مغربی اقوام نے آج تک کوئی الٰہی دین سالم اور غیر تحریف شدہ حیثیت سے نہیں دیکھا، یہودیت صرف بنی اسرائیل کا دین تھا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دیں عیسائیت بھی اس وقت مغرب میں پہنچی کہ جب پاول کے ہاتھوں تحریف ہو چکی تھی اور توحید کی جگہ تثلیث نے لے لی تھی، تحریف شدہ مسیحیت انسان کے رابطے کے لئے کچھ ہدایات اپنے اندر رکھتی تھی لیکن انسانوں کے درمیان معاملات کے لئے کوئی شریعت اور قوانین ان کے پاس نہیں تھے چنانچہ اہل مغرب نے زندگی کے سیاسی، اجتماعی، اور اقتصادی معاملات کے لئے پرانے رومن اور یونانی قوانین اور رواجوں کو اپنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے مغرب کے اکثر ذہنوں میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ عملی زندگی کے معاملات میں دین بالکل دخل نہیں دیتا۔ مسیحی دین میں عملی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں قوانین نہ پائے جانے کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلا کو بادشاہوں، سرداروں، اور سرمایہ داروں نے اپنی طرف سے قوانین وضع کر کے پُر کیا تھا۔ انہوں نے ایسے قوانین بنائے تھے کہ مغربی عوام کی اکثریت کو چند بادشاہوں کی خدمت میں مختلف ناموں اور بہانوں سے مُسخر کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ لوگوں پر حاکمیت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنا حق سمجھتے تھے، ملت اور قوم کی طرف سے کسی معاہدے یا بیعت کے تحت ان کو اقتدار نہیں ملا تھا، کلیسا کے پاس ایک طرف تو زندگی کے معاملات کے لئے قانون اور شریعت نہیں تھی تو دوسری طرف علم، دین، تفکّر اور عقل کو بھی اپنے تک محدود رکھا ہوا تھا، نظریات کی بنیاد پر ظلم ایسے مرحلے میں پہنچا ہوا تھا کہ کوئی بھی شخص اگر ایسا نظریہ پیش کرتا جو کلیسا کو پسند نہیں ہوتا تو فوراً اس شخص کو کافر اور اللہ جل شانہ کی رحمت سے محروم شمار کیا جاتا اور دین سے بغاوت کے جرم میں اس سے معاشی بائیکاٹ کر دیا جاتا۔

کلیسا کی طرف سے دین کے تحریف شدہ اور غیر معقول تصور اور بادشاہوں کے جابرانہ نظام

نے یورپ میں لوگوں کو دین، رسالت اور ملوکیت (بادشاہت) سے متنفر کر دیا اور اس نے یورپ کے نئے دور کے مفکرین کے لئے الحاد (دین سے انکار) کا دروازہ کھول دیا جنہوں نے دین کی بجائے لوگوں کی خواہشات کو قوانین کا ماٴخذ بنا لیا اور حق و ناحق اور جائز و ناجائز کا معیار وحی کی بجائے عقل کو بنایا۔

①

دین کے بارے میں اہل یورپ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ نے دین، رسالت، اور روحانیت سے بالکل ہی انکار کر دیا، یہی انکار کا نظریہ بعد میں لبرل ازم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا اور دوسرے گروہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ کوئی بھی دین اپنانا انسان کا اپنا ذاتی اور نجی معاملہ ہے جس میں اسے آزادی حاصل ہے کیونکہ دین انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ایک رابطہ ہوتا ہے لیکن زندگی کے معاملات میں دین کا کوئی دخل نہیں، انسان اپنی زندگی کے لئے قوانین بنانے میں بالکل آزاد ہے۔ یہ نظریہ ''سیکولرازم'' یا بالفاظ دیگر ''دین سے زندگی اور امور سلطنت کے الگ ہونے'' کے نام سے پہچانا گیا اور یہی نظریہ جمہوریت کے لئے نظریاتی بنیاد تشکیل دیتا ہے، جمہوریت کے مشہور فلسفیوں 'توماس'، 'ھوبز'، 'جان لاک' اور 'جان جاک روسو' نے جمہوریت کے لئے اس بنیاد کو سماجی معاہدے کے فلسفے کی شکل میں پیش کیا جس کا خلاصہ درج ذیل سطور میں پیش خدمت ہے:

> ''انسان پچھلے زمانے میں فطری زندگی پر رہتے تھے، زندگی بالکل غیر منظم تھی قانون اور حکومت ان کے پاس نہ تھے کہ وہ معاملات کو منظم کریں بعد میں لوگوں نے قانون اور حکومت کے لئے ضرورت محسوس کی اور نظام اور قانون بنانے کے لئے اکٹھے ہو گئے اور اپنے درمیان ایک Social Contract (سماجی معاہدہ) کیا جس نے بعد میں حکومت اور قانون کی شکل اختیار کر لی، اس بنیاد پر قانون اور حکومت کا تصور لوگوں کے ارادے سے وجود میں آیا''

مندرجہ بالا نظریہ اللہ جل شانہ اور اس کے رسولوں اور الٰہی دینوں سے انکار پر مبنی ہے اور وہ اس طور پر کہ نعوذ باللہ نہ اللہ جل شانہ وجود رکھتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کو پیدا کیا ہے اور نہ ہی نظام، قوانین

اور رسول بھیجے یا پھر یہ کہ اللہ جل شانہ خالق تو ہیں مگر پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا نہ تو رسولوں کو بھیجا ہے، نہ ادیان کو نازل کیا ہے اور نہ انسانوں کو زندگی کے معمولات کے نظم وضبط سے آشنا کیا ہے کیوں کہ اگر یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو پھر فلاسفروں کے جمہوری Social Contract (سماجی معاہدہ) کی کیا ضرورت تھی؟

جمہوریت کے اصول

مغربی جمہوریت دو بنیادی اصولوں پر قائم ہے ان دونوں اصولوں میں سے کسی ایک کے بھی نہ پائے جانے کی صورت میں کسی نظام یا معاشرے کو جمہوری نہیں کہا جا سکتا وہ اصول یہ ہیں:

۱) سیادت (حاکمیت اعلیٰ)۔ اقتدار ـــ کو اہم [illegible]

۲) حقوق اور آزادی۔

مندرجہ بالا دونوں اصولوں میں سے ہر ایک اپنی الگ خصوصیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ جس کو مختصر طور پر درج ذیل سطروں میں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ سیادت (حاکمیت اعلیٰ)

سیادت کی تعریف

''سیادت'' یا ''حاکمیتِ اعلیٰ'' اس مطلق العنان اور مکمل اختیار کو کہتے ہیں کہ جس میں حاکم کو اکیلے ہر معاملے میں حکم صادر کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

ایک دوسری تعریف یہ ہے:

''سیادت اور حاکمیت'' امر اور نہی کا وہ مطلق العنان اور مکمل اختیار ہے کہ جس میں نہ تو حاکم کے برابر کوئی دوسرا حاکم ہو اور نہ ہی اس سے برتر۔''

سیادت اور حاکمیت کے بارے میں اصل جمہوریت میں مندرجہ ذیل شقیں قائم ہیں:

الف: تقنین (قانون سازی) یا تشریع: کس قانون کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا؟

ب: تنفیذ : قانون نافذ کرنے والا (حاکم) کون ہوگا اور کس طرح حاکمیت تک پہنچے گا؟

شق اول کی تشریح:

حاکمیت ①

جمہوریت میں سیادت (حاکمیت اعلیٰ) مطلقاً یعنی مکمل طور پر عوام کی ہوگی یعنی وہ حاکمیت جس سے بالاتر کوئی اور حاکمیت وجود نہ رکھتی ہو، عوام کا حق ہے نہ کہ اللہ جل شانہ کا (نعوذ باللہ)

جمہوریت میں عوام کی رائے مقدس ہوتی ہے یعنی کوئی رائے عوام کی رائے کو رد نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس پر اعتراض کر سکتی ہے جو کچھ عوام چاہتی ہو وہی حق ہوتا ہے۔ عوام کی کثرتِ رائے حق کے پہچاننے کا سچا اور حقیقی معیار ہے پوری عوام کا ایک رائے پر اتفاق ضروری نہیں بس اکثریت جس رائے پر اتفاق کرلے یہی حق کا معیار ہے۔

عقل قوانین کے بنانے کا اکیلا مصدر ہے یعنی قوانین کے بنانے اور احکام کے جاری کرنے میں 'وحی' کو کوئی دخل نہیں۔ جمہوریت میں جس چیز کو عقل بہتر کہے وہی حق ہے اور جس چیز کو عقل برا شمار کرے وہ باطل ہے پھر چونکہ تمام لوگ بیک وقت حاکم نہیں بن سکتے اس لئے عوام لوگوں کی ایک جماعت کو حاکمیت اور قانون بنانے کے لئے انتخابات کے طریقے سے حکومت اور پارلیمان کے لئے متعارف کرواتی۔ ہے جو عوام کی وکالت کرتے ہوئے قوانین بناتے اور حکومت چلاتے ہیں اس ترتیب سے عام انتخابات حکومت چلانے والوں اور قانون بنانے والوں کے لئے حاکمیت کی دوسری یعنی تنفیذ کی شق تشکیل دیتے ہیں۔

مضبوط جمہوری حکومت کی خصوصیات

☆ یہ حکومت لوگوں کی اکثریت کی طرف سے عام انتخابات کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔

☆ انتخابات ایسے قانون کی رو سے ہوتے ہیں جس میں دین کو کوئی دخل نہ ہو۔

☆ انتخابات میں ملک کے تمام عوام یکساں سیاسی حقوق رکھتے ہیں یعنی ہر دین اور مذہب کے

لوگ سب یکساں سیاسی حقوق کے مالک ہوتے ہیں، دین کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی برتری اور فضیلت نہیں ہو سکتی، لہٰذا حق رائے دہی میں مسلمان اور کافر نیز مرد و عورت سب یکساں حقوق رکھتے ہیں۔

☆ انتخابات میں عقل، علم، تجربہ، تقویٰ اور صالح ہونے کی کوئی قیمت نہیں اسی طرح جاہل اور عالم کی رائے مساوی شمار کی جاتی ہے، ایک نہایت سمجھ دار ہوشیار انسان اور نہایت غبی اور احمق انسان کی رائے میں کوئی فرق نہیں ہوتا اسی طرح ایک تجربہ کار سچے وفادار اور سیاسی شخص کی رائے اور اُس شخص کی رائے میں کوئی فرق نہیں ہوتا جو شخص کچھ بھی نہیں جانتا، انتخابات میں ایک صالح، متقی، باعفت اور محسن انسان ایک رشوت خور، زانی، قاتل، چور اور ولد الزنا انسان کے ساتھ بالکل یکساں مساوی حقوق رکھتا ہے

☆ انتخابات کے لئے ممبر کئی مہینوں اور سالوں تک مسلسل لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے کام کرتا ہے تاکہ لوگوں کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے رائے دینے پر آمادہ کرے۔

☆ انتخابات کے نتیجے میں کسی بھی نظریہ کے لوگ جب ایک بار حاکمیت تک پہنچ جائیں تو باقی لوگوں کو ان کی حکومت کو تسلیم کرنا ہوتا ہے اور اس کے خلاف کسی کو بغاوت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا البتہ حسب اختلافِ رائے حکومت کے بعض احکامات پر اعتراض کر سکتے ہیں۔

۲۔ حقوق اور آزادیاں

2

جمہوریت میں حاکمیت کے بعد دوسری بنیاد حقوق اور آزادیوں کی بنیاد ہے جو کہ جمہوریت کی دوسری اصل شمار کی جاتی ہے۔ اس اصل کو عملی جامہ پہنائے بغیر جمہوریت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یعنی وہ تمام حکومتیں جو یہ چاہتی ہیں کہ انہیں جمہوری حکومتیں تسلیم کیا جائے تو ان پر یہ لازم ہے کہ جمہوریت کے تمام حقوق کا قانونی طور پر اعتراف کریں اور ایک جمہوری معاشرے کی آزادیوں کو تحفظ دیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو اس حکومت کو جمہوری حکومت ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

جمہوریت میں حقوق اور آزادیوں کی تفصیل

۱) عقیدے کی آزادی

جمہوریت میں انسان کا کسی عقیدے پر پختگی اور استقامت کوئی ضروری اور قابلِ مؤاخذہ عمل نہیں بلکہ یہ ایک اختیاری عمل ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان حتماً مسلمان رہے اور صرف اللہ جل شانہ ہی کی عبادت کرے جو اس کا خالق مالک ہے بلکہ جمہوریت میں انسان عقیدے کے باب میں بالکل آزاد ہوتا ہے اس کی مرضی ہوتی ہے کہ جس دین کو چاہے اختیار کرے اور جسکا چاہے برملا انکار کردے۔

اسی طرح انسان یہ حق رکھتا ہے کہ ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے مثلاً آج مسلمان ہے تو کل عیسائی ہو جائے، اگلے روز ہندو، یہودی، کمیونسٹ یا کوئی اور دین اختیار کرلے تو کوئی قانون دین کی تبدیلی پر اس کا مؤاخذہ نہیں کر سکتا کیونکہ جمہوریت میں یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ معاشرے اور نظام کو اس کے عقیدے سے کوئی سروکار نہیں اور اگر کوئی اس سے یہ حق چھیننے کی کوشش کرتا ہے تو جمہوریت اسے اس کا حق دلانے کے لئے پوری قوت سے اس کا ساتھ دیتی ہے۔

۲۔ نظریے اور رائے کی آزادی

جمہوریت میں نظریے یا رائے کی آزادی کا حق بھی ان حقوق میں سے ہے جس پر کسی قسم کی قید و بند لگانے کی اجازت نہیں ہوتی یعنی ہر انسان ہر چیز میں اپنی رائے دے سکتا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ دیکھا جائے کہ انسانی رائے کے لیے دین میں کوئی جگہ ہے بھی یا نہیں؟ نیز یہ رائے دین کے احکام اور قوانین کی بنیاد پر کھڑی ہے یا نہیں؟ وہ دین جو کہ انسان سے مکمل تابعداری مانگتا ہے، لیکن جمہوریت میں کیونکہ انسانوں کی رائے وحی اور دین سے بالاتر ہوتی ہے اس لئے اس میں دینی احکام لوگوں کی رائے کی بنیاد پر تبدیل ہو سکتے ہیں۔

۳۔ شخصی آزادی

جمہوریت میں دوسری آزادی شخصی آزادی ہے یعنی انسان کو اپنی ذات کے بارے میں مکمل آزادی حاصل ہے وہ اپنی ذات کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ آیا اس کا یہ عمل شریعت محمدی کی نظر میں جائز ہے یا ناجائز، جمہوریت میں زنا، ہم جنس پرستی اور اس سے بالاتر دیگر فعال انسان کے ذاتی حقوق ہیں جس میں وہ آزاد ہے اور ان کے کرنے نہ کرنے میں کوئی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔

۴۔ بیان یعنی اظہارِ خیال اور تبلیغ کی آزادی

جمہوریت میں بیان کی آزادی ایک مکمل حق کی حیثیت رکھتی ہے ہر شخص ہر چیز کے بیان کرنے کا حق رکھتا ہے اور کوئی دوسرا اس کو اپنا نظریہ بیان کرنے سے نہیں روک سکتا۔ چاہے اس کا یہ نظریہ اللہ کے بارے میں ہو یا اللہ کے دین کے بارے میں یا کسی پیغمبر کے بارے میں ہو اور چاہے اس کا یہ نظریہ کتنی ہی بے ادبی پر مشتمل ہو جمہوریت میں اس کا اظہار اس شخص کا قانونی حق ہے۔ اسی دلیل نے یورپ میں لوگوں کو حضورﷺ کے کارٹون بنانے کا حق دیا۔ (نعوذ باللہ من ذلک!)

۵۔ رہائش کا حق

جمہوریت ہر انسان کو حق دیتی ہے کہ جہاں جی چاہے رہے اس جگہ اس کی ذات اور شخصیت کا احترام کیا جائے گا یعنی ایک کافر اگر چاہے کہ مکہ یا مدینہ میں رہے اس کو منع نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ ملکیت کا حق

جمہوریت میں انسان ہر چیز کی ملکیت رکھ سکتا ہے کسی بھی طریقے سے مال کمانے اور ہر طریقے سے اسے خرچ کرنے کا حق رکھتا ہے جمہوریت مال کے کمانے اور خرچ کرنے میں کسی بھی خارجی مداخلت کو برداشت نہیں کرتی چاہے وہ مداخلت دینی ہو یا کوئی اور، بلکہ جمہوریت اس کو خالص

انسان کا انفرادی اور نجی حق گردانتی ہے کہ وہ کسی بھی طریقے سے مال کمائے اور اسے جہاں چاہے استعمال کرے۔

۷۔ پیشہ اختیار کرنے کا حق

جمہوریت ہر انسان کو ہر قسم کا پیشہ اختیار کرنے کا حق دیتی ہے اس بات سے بالکل قطع نظر کہ آیا وہ پیشہ حلال ہے یا حرام۔

۸۔ مرد و زن میں مساوات اور برابری کا حق

جمہوریت میں عورت اور مرد دونوں برابر کے حقوق اور آزادی رکھتے ہیں یعنی جو کام مرد کر سکتا ہے عورت کو بھی اس کی اجازت ہونی چاہئے مرد عورت پر نگرانی اور حاکمیت کا حق نہیں رکھتا بلکہ دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلنے کے مساوی حقوق رکھتے ہیں۔

یاد رہے ان حقوق میں جمہوریت کے وہ خاص حقوق بھی شامل ہیں جس کی ادائیگی کے لیے اہلِ مغرب حقوق نسواں کی رٹ لگائے رکھتے ہیں جیسے سیاسی جماعتوں میں شرکت، مرد کے شانہ بشانہ کمانے کا حق اور ہر وہ حق جس میں عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر معاشرے کی تعمیر میں حصہ لے اور گھر بیٹھ کر قوم پر بوجھ نہ بنے۔

۹۔ سیاسی گروہ بندی

جمہوریت کی بنیادی چیزوں میں سے ایک سیاسی گروہ بندی بھی ہے یعنی جمہوری معاشرے میں لوگ مختلف سیاسی جماعتیں بنا سکتے ہیں۔ یہ سیاسی جماعتیں الگ الگ قومی اور نظریاتی ایجنڈوں کو آگے بڑھانے کے لئے بنائی جاتی ہیں پھر اختیارات تک رسائی کے لئے ہر جائز اور ناجائز مختلف وسیلوں اور طریقوں سے کام لیتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرت رکھنے والے استعماری ممالک دوسرے ممالک میں اپنے اہداف اور مقاصد کو پورا کرنے کے لئے جماعتیں بناتے ہیں اور پھر ان

جماعتوں کو مختلف طریقوں سے مضبوط کرتے اور حکومت تک پہنچاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے آزاد ممالک کو اپنا ماتحت بنائیں اور اپنی اصلاحات اور اپنی مرضی کی تبدیلیاں اس میں نافذ کریں۔

١٠۔ دینی گروہ بندی

جمہوریت میں اگرچہ دین کو ممالک کے اجتماعی کاموں میں کوئی کردار حاصل نہیں ہوتا مگر چونکہ لوگوں کو فطری طور پر ادیان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ فطری تقاضہ دین کے علاوہ دیگر چیزوں سے پورا نہیں ہوسکتا اس لئے جمہوریت بھی عقیدے اور عبادت کی حد تک انسان کی ذاتی زندگی میں دین کی اجازت دیتی ہے اسی لئے جمہوریت میں دینی جماعتوں کو بھی اپنا کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے مگر اس شرط پر کہ سیاسی اور اجتماعی کاموں میں جمہوریت کو مانا جائیگا۔ اسی بنیاد پر جمہوریت میں ہر شخص اور ہر جماعت کو اپنے دین اور عقیدے کے پرچار کا حق حاصل ہوتا ہے جیسے کہ مسلمان تبلیغی حضرات ہر جگہ تبلیغ کا حق رکھتے ہیں اسی طرح جمہوریت میں ہر دین اور ہر مذہب کے لوگوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسلامی ممالک میں اپنے دین کے پرچار کے لئے آزادی کے ساتھ کام کرسکتے ہیں۔ اس حق کے حصول میں اگر کوئی رکاوٹ آتی ہے تو جمہوریت کی محافظ قوتیں فوری طور پر حرکت میں آجاتی ہیں اور اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتی ہیں۔

جمہوریت کے یہ حقوق اور آزادی جو کہ مغربی مسیحی معاشرے کے روحانی، اجتماعی، سیاسی اور استعماری مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے گئے ہیں، ان کو پوری دنیا میں ایک قانون کی شکل دی گئی ہے اور انسانی حقوق کے عالمی قوانین کے تحت درج کیا گیا ہے اور اقوام متحدہ میں شامل ملکوں پر حتمی طور پر اس کی تابع داری لازم کی گئی ہے اور اس سے روگردانی کسی صورت بھی قبول نہیں کی جاتی۔

انسانی حقوق سے متعلق اس قانون میں یہ بات صراحت سے لکھی ہوئی ہے کہ:

"کسی بھی صورت یہ بات جائز نہیں کہ ان حقوق کے ساتھ ایسی صورت میں معاملہ کیا جائے جو اقوام متحدہ کے اصولوں اور اہداف سے متصادم ہو۔"

یعنی آزادی اور حقوق انسانی کے اس قانون کو بالکل اسی شکل میں عملی جامہ پہنایا جائے جس طرح اقوام متحدہ چاہتی ہے کسی ملک کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اس قانون کے خلاف عمل کرے، اقوام متحدہ کا یہ حکم اور فیصلہ ان لوگوں یا حکومت کے قول کو بالکلیہ رد کر دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ:

''ہم انسانی حقوق کی وہی تعبیر کرتے ہیں، جو اسلام نے کی ہے''۔

دوسرا حصہ: جمہوریت کا مناقشہ

ا۔ جمہوریت کفر کیوں ہے؟

جمہوریت ایک کفریہ دین ہے جو کہ اپنا مذہب، اپنے قوانین، اپنے اخلاق اور زندگی گذارنے کا اپنا وضع کردہ ایک لائحہ عمل رکھتا ہے۔ اس کفریہ دین کے فلاسفر اور اس کے پیروکار یہ چاہتے ہیں کہ عقل کا بنایا ہوا یہ دین باقی تمام آسمانی مذاہب پر غالب آجائے اور زندگی کے ہر موڑ پر مقدم رہے اور تمام انسانوں کو جبری طور پر اس نئے دین کے ماننے پر آمادہ کیا جائے اور اگر کوئی جمہوریت کو نہ مانے تو وہ انسان کہلانے کا بھی مستحق نہ رہے مثلاً امریکا مسیحی مذہب ماننے والوں کا ملک ہے لیکن اگر وہاں کا کوئی باشندہ دینِ مسیحیت کا انکار کرتا ہے تو حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی مشکلات نہیں پیدا ہوتیں لیکن اگر کوئی جمہوریت کا انکار کرے تو وہ امریکا میں کہیں بھی رہنے کا حق نہیں رکھتا بالکل یہی حال دوسری مسیحی ریاستوں مثلاً برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور اسٹریلیا کا بھی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی اسرائیل میں یہودیت کو نہیں مانتا تو وہ وہاں رہ سکتا ہے لیکن اگر جمہوریت کو نہیں مانتا تو وہ وہاں نہیں رہ سکتا آج کل دنیا کے تمام ممالک میں اسی پر عمل کیا جا رہا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے اسلامی ملک میں جہاں جمہوریت پر عمل کیا جا رہا ہو، اسلام کو نہیں مانتا یا مرتد ہو جاتا ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر کوئی جمہوریت کو نہیں مانتا تو وہ ہر طرح کے انسانی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جینے کا حق بھی اس سے چھین لیا جاتا ہے۔

حال ہی میں افغانستان میں دیکھا گیا کہ حکومت بھی اگر کوئی قانون اسلامی احکامات کے مطابق بنانے کی کوشش کرتی ہے تو اگر چہ وہ قانون معاشرے کے افرد کے ذاتی احوال سے ہی کیوں نہ متعلق ہو اور جمہوریت کے اصولوں کے مطابق تمام قانونی مراحل سے گزر چکا ہو پھر بھی پورا مغرب بیک آواز اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے بدلنے کے لئے حکومت پر ہر طرح کا دباؤ ڈالتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک اسلامی حکم بھی جمہوریت کے باطل دین کے مقابلے میں کھڑا نہیں رہ پاتا۔

اسی طرح یہ بھی دیکھا گیا کہ جب بھی پاکستان میں پارلیمان اور حکومت ایک علاقے کے لئے جمہوری انداز سے ایسا قانون پاس کرتی ہے جس میں اسلامی احکامات کی رعایت کی گئی ہو تو سارا مغرب اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے اور حکومت کو اس بہانے کا سہارا لیکر اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ قانون یا شق جمہوریت کے نئے دین کے قوانین کے خلاف ہے۔

حال ہی میں مغرب نے اس نئے دین کی ترویج اور فروغ کے لیے کئی ملین ڈالر خرچ کر کے اپنے سینکڑوں ادارے اور این جی اوز دنیا میں پھیلائے ہیں اور وہ ملک جو اس نئے دین کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو اس پر جمہوریت تھوپنے کے لئے جمہوریت ہی کے قوانین کے ذریعے اس کے خلاف لڑنے کے لئے قانونی راستہ تراشا جاتا ہے اور اس مقصد کے لئے اقوام متحدہ سے اس پر حملے کے رسمی اور قانونی فتوے بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔

ذیل میں اب ہم جمہوریت کے کفر ہونے کے شرعی دلائل پیش کریں گے، جس ترتیب سے جمہوریت کا تعارف پیش کیا گیا تھا تکفیر کے دلائل بھی اسی ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں تا کہ پڑھنے والے کے لیے سمجھنا آسان ہو۔

۲۔ جمہوریت کی تکفیر کے دلائل

جمہوریت میں سیادت (حاکمیتِ اعلیٰ) کا کفریہ نظریہ

جیسا کہ جمہوریت کے تعارف میں پہلے واضح کیا گیا تھا کہ جمہوریت میں سیادت یعنی حاکمیت اعلیٰ عوام کا حق ہوتا ہے جبکہ اسلام میں یہ حق صرف اور صرف اللہ جل شانہ کا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں صرف اسی نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کے فوائد کے لئے ہر چیز اسی اللہ نے پیدا کی ہے اور وہی انسان کی تمام ضرورتوں اور مصلحتوں کے بارے میں صحیح آگاہی رکھتا ہے اور اسی ازلی آگاہی کی روشنی میں اس نے ہر زمانے میں ہر قوم کو ان کے حال کے مطابق شریعت اور قانون دیے، لہٰذا ضروری ہے کہ صرف اسی کی اطاعت کی جائے۔ اور اس کی حاکمیت کے مقابلے میں کسی کو بھی حاکمیت اور قانون سازی کے قابل نہ سمجھا جائے۔ اسی وجہ سے پوری انسانیت اس بات کی مکلف ہے کہ اللہ جل شانہ کے نازل کردہ قوانین ہی کو مانے اور اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں صرف اور صرف اسی قانون کی طرف رجوع کرے نہ یہ کہ انسانی سمجھ اور عقل کی بنیاد پر بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرے۔

اسلام کے قطعی دلائل اس شخص سے ایمان کی نفی کرتے ہیں جو اللہ کے قانون کے علاوہ دوسروں کے قانون پر فیصلہ کرتا ہے اور اللہ جل شانہ کے مقابلے میں کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرتا ہے یا یہ کہ اللہ جل شانہ کے قانون کے مطابق فیصلہ تو کرتا ہے لیکن دل سے اس پر راضی نہیں ہوتا، ذیل میں صریح آیات اس بات کے قطعی دلائل ہیں کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے لائق ہے اور صرف اسی کا قانون مانا جائے گا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ

وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴾ (النساء ۵۹)

ترجمہ: ’’اے مؤمنو! اللہ اور رسول اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے امر اور حکم والے ہیں اور اگر کسی چیز میں نزاع یعنی اختلاف یا جھگڑا پیدا ہو تو اللہ اور رسول اور قرآن و سنت کے سامنے پیش کرو اگر تم اللہ جل شانہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہ کام اعلیٰ اور انجام کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔‘‘

یہ آیت صراحت کے ساتھ اس بات کا حکم دیتی ہے کہ باہمی جھگڑے کے وقت فیصلے کا مرجع صرف اور صرف اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان ہیں۔

۲. ﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوکَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً﴾ (النساء:۶۵)

ترجمہ: ’’قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ آپ کو حَکَم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنالیں ان تنازعات میں جو ان کے درمیان واقع ہوئے ہیں اور پھر وہ اپنے دلوں میں ناراضی بھی نہ پائیں آپ کے فیصلے سے اور آپ کی بات کو دل سے تسلیم کرلیں۔‘‘

اس آیت میں بھی ان اشخاص سے ایمان کی نفی ہوئی ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے یا آپ ﷺ کے فیصلے پر دل سے راضی نہیں ہوتے۔

۳. ﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْکَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاکَ اللّهُ وَلاَ تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيماً﴾ (النساء:۱۰۵)

ترجمہ: ’’بیشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے محمد) قرآن حق کیساتھ تاکہ آپ اللہ جل شانہ کی راہنمائی کی روشنی میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خائن لوگوں کی طرفداری کرنے والے نہ بنیں۔‘‘

اس آیت میں بھی قرآن کے نازل کرنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کی

بنیاد پر لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور خائن لوگوں کی طرف داری نہ کریں۔

۴. ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُّبِيناً﴾ (الاحزاب: ۳۶)

ترجمہ: ”اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کر دیں تو نہ کسی مؤمن مرد کے لئے یہ گنجائش ہے اور نہ کسی عورت کے لئے کہ ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔“

اس آیت میں مومنوں کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مقابلے میں اپنے طرف سے کوئی دوسرا حکم اپنائیں۔

۵. ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاء اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى الله مَرْجِعُكُمْ جَمِيعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ (المائدہ: ۴۸)

ترجمہ”: اور ہم نے نازل کیا ہے (اے محمد) آپ ﷺ پر قرآن حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے تھی اور اس کے مضامین کی حفاظت کرنے والا ہے، تو فیصلہ کریں ان کے درمیان اس کتاب کے مطابق جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے اور ان کی خواہشوں اور آرزوں کی پیروی نہ کریں اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آیا ہے، ہم نے تم میں سے ہر اُمت کے لئے الگ الگ شریعت اور راستہ متعین کیا ہے۔“

اس آیت میں بھی رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کتاب کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ جل شانہ نے آپ پر نازل کی ہے اور لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کریں۔

۶. ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ

يُرِيْدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيْداًط وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ إِلَى مَا أَنزَلَ اللّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُوداً﴾ (النساء ۶۰۔۶۱)

ترجمہ: ”کیا آپ نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جو گمان کرتے ہیں کہ اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی ہیں، چاہتے ہیں کہ فیصلے کے لئے طاغوت (کعب بن اشرف یہودی) کے پاس جائیں حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس (طاغوت) کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ طاغوت انہیں دور کی گمراہی میں لیجائے اور جب ان کو کہا جائے کہ اللہ کی طرف آؤ تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافقین آپ سے اپنے چہرے پھیر لیتے ہیں۔“

یہ آیت بھی ان لوگوں کو مسلمان شمار نہیں کرتی جو قرآن پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر فیصلے کے لیے کسی اور قانون کی طرف جاتے ہیں اور قرآن کے قانون کے پاس فیصلہ لیجانے سے روگردانی کرتے ہیں۔

۷. ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (النور: ۵۱)

ترجمہ: ”مومنوں کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ جل شانہ اور رسول ﷺ کی طرف تاکہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان فیصلہ کردیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا اور مان لیا اور ایسے ہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔“

یہ آیت اس بات کو واضح کررہی ہے کہ مومنوں کی صفت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو بغیر کسی قید اور شرط کے تسلیم کرتے اور مانتے ہیں۔

۸. ﴿وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهِ مَا

تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا﴾(النساء: ۱۱۵)

ترجمہ: ''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ ہدایت کی راہ اس کے لئے واضح ہو جائے اور وہ مومنوں کی راہ کے علاوہ کسی اور کی راہ پر چلے تو ہم بھی اسے اس راہ پر پھیر دیں گے جس کی طرف یہ مڑا ہے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔''

اس آیت میں اللہ جل جلالہ اس شخص کو جہنم میں داخل کرنے کی خبر دے رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قانون کی مخالفت کرتا ہے۔

۹. ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ﴾(الشوری ۱۰)

ترجمہ: ''اور جس چیز میں آپ لوگ اختلاف کریں اس کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے۔''

مندرجہ بالا تمام آیات اور درجنوں دیگر آیات سے صراحت کے ساتھ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیادت (حاکمیت اعلیٰ) صرف اللہ جل شانہ اور اس کے بھیجی ہوئی شریعت کو ہی حاصل ہے اور فیصلہ صرف اور صرف اس ہی قانون کے مطابق ہونا چاہیے جو اللہ جل شانہ نے نازل فرمایا ہے اور جو کوئی اللہ جل شانہ کے قانون کے مقابلے میں اپنی عقل اور ارادے کی بنیاد پر انسان کے لئے ایسا قانون بنائے جو اللہ جل شانہ کے قانون سے متصادم ہو تو وہ مومن نہیں ہو سکتا بلکہ وہ یقینی طور پر اسلام کے دائرے سے نکل جائیگا۔

جمہوریت میں حاکمیت اعلیٰ کو عوام کا حق شمار کیا جاتا ہے لیکن اسلام میں یہ صرف اور صرف اللہ جل شانہ کا حق ہے۔ جمہوریت میں انسان کی مشکلات کے حل اور فیصلے کے لئے قوانین بشر کی طرف سے صرف عقل کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں اور پارلیمان کی اکثریت کی منظوری کے بعد صدرِ مملکت کی منظوری سے عقل کی بنیاد پر بنا ہوا یہ قانون ملک کی عوام پر لاگو کر دیا جاتا ہے۔

شریعت میں اسلامی قوانین کو پارلیمان میں پیش کرنا ہی کفر کے مترادف ہے کیونکہ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کو پارلیمان میں منظوری کے لیے پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمان کو اللہ

کے حکم پر فوقیت حاصل ہے اور یہ نظریہ اور اس پر عمل صریح کفر ہے۔

جمہوریت میں عوام کی رائے اللہ احکم الحاکمین کے قانون سے زیادہ مقدس ہوتی ہے جس قانون کو عوام کی اکثریت رد کر دے اس کی کوئی قانونی اور شرعی حیثیت نہیں رہتی۔ اگر اللہ جل شانہ نے اپنے قانون اور شریعت میں کوئی چیز نازل کی ہوئی ہو لیکن عوام کی اکثریت کچھ اور چاہے تو جمہوریت حکم دے گی کہ شریعت کو چھوڑ دیا جائے اور عوام کی اکثریت کے اتفاق سے حاصل شدہ قانون پر عمل کیا جائے۔

جمہوریت میں عوامی رائے کے ذریعے ایک بنیادی قانون تشکیل دیا جاتا ہے جسے دستور بھی کہتے ہیں پھر اسے قانونی شکل دینے کے لیے کسی مجلس یا بڑے جرگے یا کسی دوسرے عوامی مرجع جیسے کہ پارلیمان کے ذریعے منظور کیا جاتا ہے پھر شریعت یا عرف اور دیگر قوانین کو اسی دستور کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اگر کوئی قانون اس دستور کے موافق ہو اور اسے قبول کر لیا جائے تو اس کی منظوری کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ یہ اللہ احکم الحاکمین کا بنایا ہوا قانون ہے بلکہ اس کی وجہ دستور کے موافق ہونا ہوتی ہے اور اگر کوئی قانون اس دستور کے موافق نہ ہو تو کسی صورت اسے عملی شکل نہیں دی جا سکتی اگرچہ صریح آیت یا صحیح حدیث یا امت کے علماء کا اس قانون کے صحیح ہونے پر اجماع ہو، لوگوں کی رائے اور ارادے کو شریعت پر فوقیت کا حق دینا وہ کفر ہے جس سے اللہ جل شانہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا ہے اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ﴾ (المائدہ: ۴۹)

ترجمہ: "اور فیصلہ کرو ان کے درمیان اس قانون کے مطابق جو اللہ جل شانہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشات کی اتباع نہ کرو اور اپنے آپ کو اس بات سے بچاؤ کہ وہ تم کو اللہ جل شانہ کے تمھاری طرف نازل کردہ بعض احکام سے ہٹا نہ دیں۔"

لیکن اس کے برعکس جمہوریت میں عوام کی رائے پر فیصلہ کرنا ایک ایسا لازمی جز ہے کہ جس کے بغیر جمہوریت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ جمہوریت میں اکثریت کی رائے حق کا معیار ہوتی ہے:

جمہوریت میں اکثریت کی رائے حق کا معیار سمجھی جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ کسی بھی شخص یا کسی بھی چیز کے حق میں جب اکثریت رائے دیدے تو وہی حق شمار ہوتا ہے اور وہی لوگ حاکمیت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں کہ جنہیں عوامی اکثریت کی تائید حاصل ہو۔

مگر اسلام میں رائے دینے والوں کی تعداد کا زیادہ ہونا حق کا معیار نہیں ہوتا بلکہ اسلام میں حق وہ ہے جس کی تائید قرآن وحدیث اور شرعی دلائل کریں اگر چہ اس کے پیچھے ایک آدمی یا کم تعداد میں لوگ کھڑے ہوں اور اس کے مدمقابل اور مخالفت میں عوام کی اکثریت ہو مثال کے طور پر اگر ایک ملک کے اکثر لوگ آپس میں زنا، ہم جنس پرستی یا سود کے جائز ہونے کے حق میں رائے دے دیں اور اس کے بالمقابل ایک آدمی مخالف رائے دے یا کوئی بھی مخالفت میں رائے نہ دے تو پھر بھی یہ کام جائز نہیں ہو سکتے بلکہ ہمیشہ کے لئے حرام ہی رہیں گے جبکہ جمہوریت میں اکثریت کی رائے حلال کو حرام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اسلام میں حق اور جائز وہ ہے جس کو شریعت نے حق اور جائز کہا ہو اور باطل اور ناجائز وہ ہے جس کو شریعت نے ناجائز کہا ہو۔ اسلام میں نہ صرف یہ کہ اکثریت کو حق کا معیار نہیں مانا گیا بلکہ قرآنی آیات نے اس بات کی صراحت بھی کر دی کہ ہر دور میں تھوڑے لوگ ہی حق کے ماننے اور شکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ (الانعام: ۱۱۶)

ترجمہ: ''اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے

گمراہ کرڈالیں گے وہ تو وہم وگمان کے سوا کسے کے پیچھے نہیں چلتے اوران کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔"

اسی طرح فرماتے ہیں:

﴿وَلَـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف ۱۸۷)

ترجمہ: "لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے۔"

اوردوسری جگہ فرماتے ہیں:

﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ (سبا ۱۳)

ترجمہ: "اور میرے بندوں میں سے بہت کم لوگ شکر گزار ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بہت دفعہ اکثریت کی رائے کے مقابلے میں (حق ہونے کی وجہ سے) اقلیت کی رائے مانی ہے، جیسے کہ بدر کی لڑائی میں صرف حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے پر آپ نے ایسے حال میں عمل کیا کہ خود رسول اللہ ﷺ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جنگ کے میدان کے بارے میں دوسری رائے رکھتے تھے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی اکثریت کی رائے نہیں مانی اوران کی رائے کے خلاف قریش سے صلح کرلی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارتداد کے فتنے کا مقابلہ کرنے میں انتہائی مشکل موقف اختیار کرتے ہوئے اکثریت کی رائے کی مخالفت کی اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو شام کی طرف روانہ فرمایا۔

مندرجہ بالا دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں رائے دینے والوں کی 'اکثریت' حق وباطل اور جائز وناجائز کے انتخاب میں کوئی اثر نہیں رکھتی جبکہ جمہوریت میں 'اکثریت' کی رائے کو اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت کی جگہ پر رکھا گیا ہے جو کہ ایک واضح کفر ہے۔

۴۔ قانون کا مصدر و ماخذ عقل ہے یا شریعت؟

جمہوریت اساسی طور پر سیکولرزم کی بنیاد پر کھڑی ہے، وہ سیکولرزم جس کا نظریہ یہ ہے کہ دین کو انسانوں کی اجتماعی زندگی اور نظام میں کوئی دخل نہیں، اس بنیاد پر جمہوریت میں قانون کا مصدر لوگوں کی عقل ہے نہ کہ آسمانی وحی، جمہوریت میں ہر اس چیز کو اچھا کہا جاتا ہے جس کو لوگوں کی عقل اچھا جانے اور ہر اس چیز کو برا کہا جاتا ہے جس کو لوگوں کی عقل برا مانے اور پھر اسی نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے قانون وضع کیے جاتے ہیں جمہوریت نواز مسلم ممالک میں تو کئی بار ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ اگر اس ملک کے کفریہ قوانین میں کوئی قانون شریعت کے مشابہ نظر آیا تو اسے بھی عقل کے ترازو سے تولنے کی کوشش کی گئی اور اس قانون کو لوگوں کے سامنے بحث کے لیے پیش کیا گیا تا کہ وہ اپنی عقل کی روشنی میں اس پر حکم لگائیں جیسے کہ پاکستان میں کچھ عرصہ قبل حدود آرڈیننس کی شرعی حدود کے فرمان کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں کو متحرک کرنے کے لئے امریکی خرچے پر بعض ٹی وی چینلز اور اخبارات میں پورے چھ مہینے تک ”ذرا سوچئے“ کے عنوان سے کیمپین (Campaign) چلائی گئی جس کے نتیجے میں پارلیمان کی اکثریت نے اپنی عقل کی بنیاد پر ان قوانین کو انسانی حقوق کے خلاف قرار دے کر اس میں تبدیلیاں کر کے اسے ایک غیر اسلامی قانون بنا دیا۔

۵۔ کیا صرف عقل کی بنیاد پر کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا درست فیصلہ ہو سکتا ہے؟

یہ بات تو مسلّم ہے کہ تمام لوگوں کی عقلیں اور سوچیں کبھی بھی ایک طرح کی نہیں ہوتیں اگر بعض لوگ ایک کام کو اچھا جانتے ہیں تو بعض دوسرے اُسی کام کو برا مانتے ہیں، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ بعض لوگ ایک کام کرنے کی وجہ سے اس کے کرنے والے کو نوازنے کے قابل سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے میں وہی لوگ سزا کے قابل ہوتے ہیں اسی لئے صرف عقل صحیح حکم کے صادر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی جب تک کہ وحی سے رہنمائی نہ حاصل کی جائے۔

انسانوں کی عقل خواہشات اور فطری اغراض سے بھی متاثر ہوتی ہے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ

لوگوں کی خواہشات اور اغراض مختلف ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ہر شخص کی عقل اشیاء اور افعال پر اپنی خواہشات اور اغراض کے مطابق الگ الگ حکم لگاتی ہے اور اسی وجہ سے حقیقی اور جائز مصلحت کی تشخیص کرنا ایک ناممکن کام بن جاتا ہے۔

انسانوں کی عقلوں کا معیار حالات، شرائط اور زمانے کے گذرنے کیساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے انسانوں کی عقل اگر آج کسی چیز کو اچھا سمجھتی ہے تو کل مختلف حالات اور اس دور کے تقاضوں کی بنیاد پر اس چیز کو ناپسند کرتی ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ عقل کا فیصلہ غیر پائیدار اور ناقص ہوتا ہے اور ہر دور کے لئے یکساں افادیت نہیں رکھتا جبکہ آسمانی وحی آنے والے ہر دور کے حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ثابت اور پائیدار حکم لگاتی ہے۔

اسلام میں کسی چیز پر حلت وحرمت (حلال یا حرام ہونا) کا حکم لگانا اور اس پر اخروی سزا و جزا کا مرتب ہونا صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے شایان شان ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

﴿ان الحکم الا للہ﴾ (الانعام: ۵۷)

ترجمہ: ”حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں چلتا۔“

اور اسی طرح ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

(الجاثیہ: ۱۸)

ترجمہ: ”پھر (اے پیغمبر) ہم نے تمہیں دین کی ایک خاص شریعت پر رکھا ہے لہٰذا تم اس کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔“

رسول اللہ ﷺ نے ہر اس حکم کے رد کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے جو دین کی کسی دلیل پر قائم نہ ہو اور انسانوں نے اپنی عقل کی بناء پر اسے وضع کیا ہو چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من أحدث فى امرنا هٰذا ما ليس منه فهو رد وفى رواية ليس عليه امرنا فهو رد))

(رواه الشيخان)

ترجمہ: ”جو کوئی ہمارے دین میں ایسا کچھ ایجاد کرے جو دین میں سے نہ ہو تو وہ مردود (ناقابل قبول) ہے“

اور دوسری روایت میں یوں آیا ہے کہ:

”کوئی شخص اگر ایسا کام کرے کہ اس پر ہمارا امر (دلیل) نہ ہو تو وہ مردود ہے۔“

لیکن مندرجہ بالا تمام دلائل کے ہوتے ہوئے بھی جمہوریت میں قانون سازی عقل کا کام ہے جس میں وحی کو کسی قسم کے دخل کی اجازت نہیں، گویا کہ جمہوریت میں تشریع (شریعت بنانا) اور قانون سازی کا حق اللہ جل شانہ سے لے کر بالکلیہ انسان کے حوالے کیا جاتا ہے جو اسے اپنی عقل کی بنیاد پر جیسے چاہے استعمال کرتا ہے جو کہ حقیقت میں سب سے بڑا کفر ہے۔

٦۔ انتخابات

جمہوریت میں انتخابات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اُن کے بغیر کسی بھی نظام کو صحیح جمہوری نظام نہیں کہا جا سکتا لیکن اس طرز کے انتخابات جو جمہوریت میں پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہیں اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام جیسا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے خاص اصول وضوابط رکھتا ہے اسی طرح اسلام میں حکومت اور سیاست کے لئے بھی اپنے اصول وضوابط ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:

اسلامی نظامِ حکومت کی خصوصیات

پہلی خصوصیت

اسلام میں حاکمیت یا حکمرانی کوئی غنیمت یا موروثی مال نہیں جسے کسی بھی طرح ممکن ہو سکے حاصل کرلیا جائے بلکہ اسلام میں حکومت اور گورنری ایک بھاری بھرکم ذمہ داری ہے جو صرف اسی شخص کو سونپی جاتی ہے جس میں امامت کی اہلیت کی چھ شرائط پائی جاتی ہوں جو کہ درج ذیل ہیں:

پہلی شرط: مسلمان ہونا

امام مسلمان ہو، کافر اسلامی حکومت کا حکمران یا بڑا نہیں بن سکتا چاہے وہ کسی بھی قسم کا کافر ہو، چاہے اہل کتاب میں سے ہو جیسے یہودی یا نصرانی یا کسی دوسرے دین کا ماننے والا ہو یا ملحد ہو جو کسی بھی آسمانی دین کو ماننے والا نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا حاکم نہیں بن سکتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ (النساء ۱۴۱)

ترجمہ: ’’اور اللہ کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کا ہرگز کوئی راستہ نہیں رکھے گا۔‘‘

قرآن کریم میں مسلمانوں کے ’’اولوا الامر‘‘ کے ساتھ ہر جگہ یہ قید لگائی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے ہو اور اس شرط پر اسلام کے تمام علماء کا اجماع ہے اور کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی اسی بناء پر مسلمانوں پر کافر کا حاکم ہونا حرام ہے۔ لیکن جمہوریت میں حاکم کے بارے میں دین کا کوئی اعتبار نہیں اس نظام میں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص حکمرانی کے لئے منتخب ہوسکتا ہے بلکہ آج تو پوری اسلامی دنیا کے لئے عملی لحاظ سے دنیا کے کافروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ صحیح مسلمان شخص کسی بھی ملک میں حاکمیت تک نہ پہنچنے پائے اور اگر کسی طرح پہنچ جائے تو اگرچہ وہ انتخابات کے راستے سے ہی کیوں نہ پہنچا ہو پھر بھی حاکمیت سے اسے ہٹا دیا جائے اور کسی صورت اسے حاکم نہ رہنے دیا جائے کہ کہیں وہ اپنی

مضبوط حکومت نہ بنالے۔ اس کی مثالیں ترکی، الجزائر اور دیگر اسلامی ممالک کے ماضی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

دوسری شرط: مرد ہونا

اسلام میں حاکمیت کے لئے دوسری شرط مرد ہونا ہے، عورت کا حاکم ہونا اسلام میں حرام ہے اس کی بنیاد وہ حدیث ہے جس کو امام بخاری، ترمذی، نسائی اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ ایران کے لوگوں نے ایران کے بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی کو اپنا حاکم بنایا ہے تو آپ نے فرمایا:

((لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ))

ترجمہ: ”وہ قوم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنا اختیار عورت کے سپرد کرے۔“

لیکن جمہوریت میں اس کے برعکس مرد و عورت دونوں برابری کے طور پر انتخابات لڑنے اور حاکم بننے کا حق رکھتے ہیں اور یہی بات افغانستان کے موجودہ بنیادی قانون میں بھی ان الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے:

”افغانستان کی خواتین انتخابات میں حصہ لینے اور منتخب ہونے کا حق رکھتی ہیں۔“ (مادہ: ۳۳)

حالانکہ یہ اسلام سے کھلی بغاوت ہے

تیسری شرط: بالغ ہونا

اسلام میں حاکم کے لیے تیسری شرط بلوغ ہے، نابالغ بچہ مسلمانوں کا حاکم نہیں بن سکتا۔

چوتھی شرط: عاقل ہونا

شریعت محمدی میں حاکم کے لیے چوتھی شرط عقل ہے یعنی حاکم بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ذہنی توازن درست ہو، حاکم پاگل اور مجنون نہ ہو۔

پانچویں شرط: آزاد ہونا

پانچویں شرط آزاد ہونا ہے کیونکہ غلام خود اپنے ذاتی تصرفات میں آزاد اور خود مختار نہیں ہوتا تو کسی اور پر کیا اختیار رکھے گا۔

چھٹی شرط: عادل ہونا

چھٹی شرط عدالت ہے، یعنی حاکم فاسق نہ ہو اگر چہ بعض علماء باوجود فاسق ہونے کے کراہت کیساتھ حاکم بننے کے جواز کے قائل ہیں۔

دوسری خصوصیت

اسلام میں حاکم ان لوگوں کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے جو ذی رائے اور بصیرت والے لوگ ہوں اور جو امت کے اچھے برے سے واقف ہوں اور حاکم کے انتخاب میں پوری احتیاط اور باریک بینی سے کام لیں پھر جب یہ شخصیات حاکم کو منتخب کر لیں تو اس کے بعد پوری امت اس کے ہاتھ پر اطاعت کی عمومی بیعت کرتی ہے لیکن جمہوریت میں ہر کافر، فاسق، مجرم، بے عقل اور جاہل کو حاکم کے انتخاب میں وہی حق حاصل ہوتا ہے جو ایک مؤمن صالح، سمجھ دار اور عالم کو حاصل ہوتا ہے جمہوریت میں انسانوں کو صالح حکمران اور فاسق حکمران کے زاویے سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہاں تو صرف ووٹ دینے والے لوگوں کو شمار کیا جاتا ہے، جس کے حق میں زیادہ لوگ رائے دیں اسی کو حاکمیت کا حقدار سمجھا جاتا ہے مثال کے طور پر ایک طرف ۴۹ علماء، مجاہدین، صالح اور تجربہ کار سیاست دان ہوں اور دوسری طرف ۵۱ فاسق، شرابی، اور جاہل ہوں تو جمہوریت میں دوسری جماعت پہلی جماعت کے مقابلے میں حکمرانی کے لئے برتر اور زیادہ حقدار سمجھی جاتی ہے اسی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبالؒ نے جمہوریت پر اپنے شعروں میں یوں تبصرہ کیا ہے:

متاع معنی بیگانہ زادون فطرتان جوئی زموران شوخی طبع سلیمانی نمی آید

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کاری شوی   کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

(کلیات اقبال، افکار)

تیسری خصوصیت

اسلام اللہ جل جلالہ کی طرف سے نازل شدہ دینِ حق ہے جو تمام ادیان اور نظریات سے اعلیٰ ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے مقابلے میں کسی بھی دوسرے نظریے اور دین کی برتری کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اپنے اتباع کرنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ اس وقت تک کافروں سے جنگ کرتے رہیں کہ جب تک کفر کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اللہ جل شانہ کا کلمہ سب سے بلند حیثیت سے نہ مان لیا جائے۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّه فَإِنِ انتَهَوْاْ فَإِنَّ اللّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (الانفال 39)

ترجمہ: ”اور (مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر یہ باز آ جائیں تو ان کے اعمال کو اللہ خوب دیکھ رہا ہے۔“

لیکن اس کے برخلاف جمہوریت تمام ادیان کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے اور کفر اور اسلام میں فرق کی قائل نہیں، اسی وجہ سے جمہوریت میں مسلمان اور کافر کو ایک طرح کے انتخابی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور کافر کو اس کے کفر کی وجہ سے حکمرانی سے محروم نہیں کیا جاتا بلکہ جمہوریت میں تو یہ بات عملاً نظر آتی ہے کہ مسلمان کو مسلمانی کی وجہ سے حکمرانی سے محروم رکھا جاتا ہے لیکن کافر کو مسلمان پر فوقیت دی جاتی ہے۔ جمہوریت میں اسلام اور کفر کے درمیان فرق نہ ہونا بذاتِ خود اسلام کی نظر میں ایک بڑا کفر ہے۔

کیا انتخابات کے راستے سے اسلام نافذ ہوسکتا ہے؟

اسلامی دنیا میں بعض اسلامی تنظیمیں جو مغرب کے سیاسی اور اطلاعاتی فلسفے سے متاثر ہیں اور نفاذ اسلام کا طریقہ کار نبی ﷺ کی سیرت سے نہیں لیتیں بلکہ مغرب کے جمہوری نظام کے ذریعے اسلامی نظام لانا چاہتی ہیں اور اپنے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے دوسری سیکولر اور لادین جماعتوں کی طرح جمہوری وسائل کو بروئے کار لاتی ہیں چنانچہ انتخابات کے موقعہ پر دین کے نام پر لوگوں سے ووٹ لیتی ہیں۔ ان دینی جماعتوں کی اس غلط فہمی کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں:

پہلی وجہ:

یہ لوگ جمہوریت کو صحیح طرح سے نہیں سمجھے اس لیے کہ جمہوریت میں تو حاکمیتِ مطلقہ (مکمل حاکمیت) اور قانون سازی کا حق لوگوں کا ہے نہ کہ اللہ جل شانہ کا یعنی جمہوریت میں لوگوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ جس طرح کا نظام قانون اپنے لئے چاہیں بنالیں جبکہ اسلامی نظام میں حاکمیتِ مطلقہ اور شریعت سازی کا حق صرف اور صرف اللہ جل شانہ کا حق ہے لیکن جمہوریت میں آخری فیصلہ لوگوں کا ہے نہ کہ اللہ جل شانہ کا تو یہ لوگ (اسلامی تنظیمیں) کس طرح جمہوریت کے ذریعے اللہ کا نظام نافذ کرسکتی ہیں۔

دوسری وجہ:

یہ لوگ اسلام کا مزاج نہیں سمجھتے، اسلامی علوم اور شریعت کی طرف منسوب تو ہیں لیکن اسلامی روح کے تقاضے اور خصوصیات کو نہیں سمجھتے یہ لوگ نہ تو حقیقی اسلام سے واقف ہیں اور نہ ہی اسلام میں حاکمیت کا نظریہ ان کو معلوم ہے۔ اسی وجہ سے اسلام اور جمہوریت کے مابین فرق نہیں کر پاتے۔

تیسری وجہ:

یہ لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت دو الگ الگ نظام ہیں لیکن چونکہ اسلامی نظام کا قیام جہاد، قربانی اور تکالیف کا تقاضا کرتا ہے جن کے سہنے کے لئے یہ لوگ تیار نہیں بلکہ اپنے دنیاوی مقاصد اور مصلحتوں کا حصول ان کو جمہوریت کے ذریعے آسان نظر آتا ہے، لہذا اس اندرونی

منافقت کی وجہ سے جمہوریت پر اسلام کا لیبل لگا دیتے ہیں تا کہ لوگ انہیں اسلامی جماعت سمجھتے رہیں اور عوام کا ان پر اعتماد بحال رہے اور ساتھ ساتھ طاغوت کی پیروی کرتے ہوئے با آسانی اور بغیر قربانی کے حاکمیت میں سیکولر جماعتوں کے ساتھ ایک ہو کر اقتدار کے مزے لوٹ سکیں۔

لیکن شریعت کے ساتھ ساتھ عقل، تاریخ اور تجربہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ انتخابات کے طریقے سے اسلامی نظام کبھی بھی نافذ نہیں ہو سکتا اس دعوے کے بعض دلائل درج ذیل ہیں:

انتخابی نظام کے ذریعے نفاذ اسلام کے ناممکن ہونے کے دس دلائل:

پہلی دلیل:

جمہوریت میں نظامِ حکومت اور قوانین لوگوں کی طرف سے لوگوں کے ہاتھوں لوگوں کے لئے بنتے ہیں پھر اسی بنیاد پر جمہوری نظام میں شامل ہر جماعت کے لئے سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہوتا ہے کہ جو بھی نظام آئے گا تو وہ اس بنیاد پر نہیں آئے گا کہ وہ اللہ جل شانہ کی طرف سے دی گئی ایک ذمہ داری ہے کہ جسے پورا کرنا ہم پر لازم ہے بلکہ وہ نظام اس بنیاد پر آئے گا کہ اس میں لوگوں کی مرضی ہے۔ جمہوریت میں لوگوں کو پورا پورا اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اسلام مانگتے ہیں یا غیر اسلام؟ جبکہ اسلام میں لوگوں کو یہ حق دینا اسلام کی فکر اور شریعت سے واضح مخالفت رکھتا ہے لہٰذا جمہوریت کے ذریعے اسلام کا نفاذ ناممکن ہے۔

بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی اسلامی تنظیم جو انتخابات میں حصہ لیتی ہے اس پر لازم ہے کہ سب سے پہلے وہ یہ سوچے کہ جس طرح اُن کو اجازت ہے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں اسی طرح دیگر غیر اسلامی تنظیموں (NGO) کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ مسلمانوں کو کفر کی طرف دعوت دیں۔ اسکے بعد جمہوری اصولوں کے مطابق مذہبی جماعتوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کفر کی دعوت دینے والی این جی اوز کی مخالفت کریں۔

دوسری دلیل

پارلیمان میں اکثریت رکھنے والی جماعت کو ہر قسم کے قوانین بنانے اور منظور کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے لہٰذا جب تک اسلامی جماعتیں پارلیمان میں اکثریت حاصل نہ کرلیں اس وقت تک انہیں اسلامی قوانین کے پاس کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا کیونکہ پارلیمانی اصولوں کے مطابق پارلیمان کی اقلیت پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ قانون کے بنانے میں اکثریت کے حق کو مانے اگرچہ وہ اسلام کے خلاف قوانین بنائے۔ ایک مسلمان ملک میں اسلام کے خلاف قوانین بنانے کے حق کو تسلیم کرنا اسلام کے خلاف بہت بڑا اقدام ہے، مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی کو بھی یہ اجازت ہرگز نہ دیں کہ وہ ملک میں غیر اسلامی قوانین کو آئین کا حصہ بنا کر عملی شکل دے۔

تیسری دلیل

انتخابی نظام کے ذریعے اسلام کا نفاذ اس لیے بھی ناممکن ہے کہ انتخابات جیتنے والی تنظیم کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ چار یا پانچ سال کے لئے حکومت کرے اور باقی لوگ ان کی حکومت کے ماتحت رہیں۔ اس طرح بالفرض اگر کوئی اسلامی تنظیم اکثریت حاصل کرلے اور اسلام کو نافذ بھی کرلے تو پھر بھی اسلام کا نفاذ چار پانچ سالوں کے لئے ہوگا اور اپنا وقت پورا کرنے کے بعد حکومت کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام بھی ختم کر دیا جائے گا حاکم کا اس طرح محدود مدت کے لیے منتخب ہونا ایک تو اجماع کے خلاف ہے اسلئے کہ اسلام میں حاکم اسوقت تک حکومت کا حق رکھتا ہے جب تک وہ زندہ ہے اور حاکمیت کی شرعی اہلیت رکھتا ہے چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حاکم اگر شرعی اہلیت رکھتا ہے تو پھر کیوں ہٹایا جاتا ہے اور اگر شرعی اہلیت نہیں رکھتا تو پھر دوبارہ انتخابات میں حاکمیت کا حق اسے کیوں دیا جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ اسلام تو ہمیشہ کے لیے نافذ ہونا چاہیے لیکن اس جمہوری صورت میں چار پانچ

سال بعد اسلامی نظام خود بخود غیر نافذ ہو جاتا ہے اور لوگوں کو ایک بار پھر یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی نظام چاہتے ہیں یا غیر اسلامی نظام؟ اس صورت میں سیکولر (بے دین) جماعتوں کو ایک بار پھر حاکمیت تک پہنچنے کا حق دیا جاتا ہے۔

چوتھی دلیل

جمہوریت کے راستے پر چل کر نفاذِ اسلام کے ناممکن ہونے کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ اسلام اور جمہوریت دو الگ الگ نظام ہیں اس لئے جمہوریت میں شامل ہونا جمہوریت کی تائید اور توثیق کے معنی میں ہے۔

اسلامی جماعتوں کا جمہوریت میں شامل ہونا اس کفریہ نظام کی تائید و توثیق کرتا ہے۔ عام لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ علماء بھی جمہوریت میں حصہ لیتے ہیں اور انتخابات کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہوسکتا ہے جمہوریت بھی ایک حق نظام ہو کیونکہ اگر حق نہ ہوتا تو دینی علماء اس میں حصہ نہ لیتے۔ علماء اگرچہ اپنی شرکت کے لئے عذر میں دعوت اور مصلحت کی تاویلیں اور دلائل لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن عوام انہیں نہیں سمجھتے کیونکہ پارلیمانی نظام میں علماء اور سیکولر (بے دین) اشخاص سب ایک جیسے اصولوں پر چلتے ہیں اور عمل میں بھی دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔

پانچویں دلیل

ہر نظام ایک خاص فکر اور لائحہ عمل رکھتا ہے اور اس نظام تک رسائی کے لئے ذرائع اور اسباب بھی اسی فکر سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ جمہوریت سیکولرزم (دین سے آزادی) کی بنیاد پر قائم ہے اور اسی طرح انتخابات بھی۔ کیونکہ انتخابات کے لئے بنیادی شرط سیاسی مساوات (برابری) ہے اور یہ مساوات اس وقت قائم ہوسکتی ہے کہ جب تمام جماعتیں جمہوریت کے لئے اپنا دین بالائے طاق رکھ دیں کیونکہ دین انسانوں کو ایک دوسرے پر فضیلت کا درس دیتا ہے مثال کے طور پر اسلام کہتا ہے کہ مسلمان کافر

سے برتر ہے لیکن جمہوریت کہتی ہے کہ دونوں برابر ہیں، لہٰذا مساوات صرف اسی صورت ممکن ہے کہ جب کفراور اسلام کی حدفاصل درمیان سے نکل جائے۔

اسی وجہ سے انتخابات صرف جمہوریت کیساتھ خاص ہیں اس کے ذریعے صرف جمہوریت آسکتی ہے نہ کہ اسلام جس طرح جمہوریت اسلام سے ایک الگ دین ہے اسی طرح اس کے نافذ کرنے کے لئے راستہ اور وسائل بھی جمہوریت سے جدا ہیں جس طرح جمہوریت کا دین کمیونزم، عیسائیت، یہودیت اور دوسرے دینوں کیساتھ نہیں مل سکتا اسی طرح اسلام بھی دیگر ادیان اور طریقوں کی آمیزش کو قبول نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا نفاذ کسی غیر اسلامی طریقے سے ہوسکتا ہے۔

اسلام صرف اور صرف اسی طریقے سے زندہ ہوسکتا ہے جس ترتیب سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوا تھا اسی لیے باطل طریقوں سے اسلام کے نفاذ کی کوششیں کرنا شرعاً بھی ناجائز ہے اور عقل وفطرت کے بھی خلاف کام ہے۔

چھٹی دلیل

جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام (کیپٹل ازم) سے پیدا ہونے والے نظام کا عملی نمونہ ہے جتنا بھی اسلامی دنیا میں جمہوریت مضبوط ہوتی ہے اتنا ہی سرمایہ داری، سود اور احتکار (ذخیرہ اندوزی) پر کھڑا نظام جو اسلام سے متصادم اقتصادی نظام ہے مضبوط ہوتا ہے، اس لئے اگر کہیں جمہوریت کے راستے سے کوئی اسلامی جماعت اقتدار تک پہنچ بھی جاتی ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ جمہوریت ہی کا حصہ بن جاتی ہے اور اسلام کے اقتصادی نظام سے خارج ہو جاتی ہے اس وجہ سے جمہوریت کے ذریعے اسلام نافذ کرنے کا خواب صرف ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

ساتویں دلیل

انتخابی سیاست ایک ایسا جوہڑ ہے جس میں کوئی اسلامی جماعت ایک دفعہ گر جائے تو پھر اس

کے لیے اس سے نکلنا انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ ایک تجربے کی بات ہے کہ وہ تمام اسلامی جماعتیں جنہوں نے ایک دفعہ جمہوریت میں حصہ لیا تو انہوں نے اسلام کے غلبے کے لیے اسلامی انقلابی جہادی کوششوں سے ہاتھ کھینچ لیا اس لیے کہ جمہوری سیاست میں مسلح جدوجہد کو چھوڑنا ضروری ہوتا ہے حالانکہ مسلح جدوجہد کو چھوڑنا، جمہوریت اور انتخابات سے اسلام کے غلبے کی امید وابستہ کرنا اور اس کام کو اسلامی مبارزے کا نام دینا اسلام کے نفاذ کے راستے میں ایک خطرناک رکاوٹ ہے، اس راستے میں مسلمانوں کے دلوں سے جہاد اور اس کے نتائج سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مصر کے اخوان، افغانستان کی سابق جہادی تنظیموں اور پاکستان کی اسلامی جماعتوں کے ناکام تجربے سب سے واضح مثالیں ہیں یہ لوگ نہ صرف یہ کہ طویل عرصہ گذرنے کے باوجود اسلامی نظام نافذ نہیں کر سکے بلکہ اسلام کے دشمنوں نے بڑے مکر اور مہارت کے ساتھ انھیں مجاہدین کے خلاف اپنی صفوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے علاوہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ صرف نام کی اسلامی جماعتیں رہ گئیں اور دشمن نے بڑی مہارت سے ان کے تمام وسائل اور کوششیں جہاد اور مجاہدین کے خلاف صلیبیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیں۔

آٹھویں دلیل

جمہوریت کے ذریعے نفاذ اسلام کی کوششوں کے کارگر نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جمہوریت ایک ایسا نظام ہے کہ اس میں اسلامی تنظیمیں اکثریت نہیں حاصل کر سکتیں جیسا کہ پچھلے ساٹھ سال میں پاکستان میں دیکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت میں نظریاتی اور سیاسی بناوٹ ایسی ہے کہ وہاں صرف سرمایہ دار لوگ، جاگیردار، وڈیرے، چوہدری، نواب، خان، ملک، صنعت کار، بڑے بڑے تاجر، خاندانی بیوروکریٹس اور مالی بدعنوانیوں میں ملوث لوگ ہی اقتدار تک پہنچ سکتے ہیں کیوں کہ جمہوریت میں حکومت تک پہنچنے کے لیے سب سے بڑا اور اہم وسیلہ مال خرچ کرنا، رشوت دینا، لوگوں کی رائے (ووٹ) مال کے ذریعے خریدنا، لوگوں کیساتھ حیران کن اور بلند بانگ جھوٹے وعدے کرنا

اور اپنے فائدے اور سیاسی مد مقابل کے خلاف بڑے پیمانے پر پروپیگنڈا کرنا بھی انتخابات کی وہ ضرورتیں ہیں کہ جس کے بغیر انتخابات میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ انتخابات کے لیے یہ راستہ اپنانا، نہ اسلامی طریقہ ہے اور نہ ہی یہ حقیقی معنوں میں اسلامی جماعتوں کے بس کی بات ہے۔

نویں دلیل

اگر کبھی کوئی اسلامی جماعت ان سب رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود انتخابات میں اکثریت حاصل کر بھی لے اور حکومت تک پہنچ بھی جائے تو پھر بھی وہ اسی آئین کی پابند ہوگی جو جمہوریت کی بنیاد ہے، یہ آئین انتخابات جیتنے والی جماعت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ مکمل شریعت نافذ کرے نہ ہی بے دین قوتیں اس آئین کو بدلنے کی اجازت دیتی ہیں اور اگر آئین کو چھوڑ کر بلاواسطہ شریعت نافذ کر دیں تو پھر حکومت میں رہنے کا جواز ہی ختم ہو جائے گا کیونکہ وہ جماعت اسی آئین کی بنیاد ہی پر تو انتخابات کے ذریعے اقتدار تک پہنچی ہے لہٰذا جب آئین جائے گا تو ان کی حاکمیت کا جواز بھی ختم ہو جائے گا اور حکومت بھی جائے گی۔

دسویں دلیل

جمہوریت کے ذریعے نفاذ اسلام کا خواب اس لیے بھی جھوٹا ہے کہ انتخابات کے ذریعے قدرت تک پہنچنے والی اسلامی تنظیم اگر اسلام نافذ کر بھی لیں تو پھر بھی وہ مکمل اسلام نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری "امر بالمعروف" اور "نھی عن المنکر" (یعنی اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) کا فریضہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اسلامی ملک میں غیر اسلامی جماعتیں موجود ہوں اور غیر اسلامی اقدامات سرانجام دینے کی انہیں اجازت بھی ہو تو ایسی صورتحال میں اسلامی حکومت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام سیکولر اور مرتد جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی لگائے، ان کے افراد کو اسلام کی طرف دعوت دے اور انکار کی صورت میں انہیں ختم

کر دے جبکہ جمہوریت میں انتخابی حکومت یہ کام ہرگز نہیں کر سکتی کیوں کہ جمہوریت ہر کسی کو اپنے ہر قسم کے عقیدے کے بیان اور اظہار کی آزادی دیتی ہے اس لئے جمہوریت میں 'آزادیٔ رائے' ایک بنیادی عقیدہ ہے۔

اسی طرح ایسی اسلامی حکومت کفار کے خلاف اقدامی جہاد کا فریضہ بھی پورا نہیں کر سکتی بلکہ اس کے برخلاف ہر جمہوری حکومت کے لیے تمام کفریہ ممالک کے ساتھ امن، باہمی تعاون اور اچھے تعلقات کے روابط رکھنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جمہوری انتخابی حکومت اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل (امن شوریٰ) اور دیگر عالمی معاہدوں کی پوری پوری پاسداری کرے ورنہ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں اسے عالمی پابندیوں اور سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ تمام وہ دلائل ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا عملی نفاذ اور جمہوریت دونوں آپس میں متصادم ہیں۔

اسلام کے آنے کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ دوسرے باطل دینوں پر غالب ہو جائے نہ یہ کہ ان کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے برابری کی بنیاد پر زندگی گزاری جائے، اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىٓ أَرۡسَلَ رَسُولَهُۥ بِالۡهُدَىٰ وَدِينِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُونَ﴾ (الصف : ۹)

ترجمہ: ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت وسچائی کا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اسے تمام دوسرے دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرکین کو یہ بات کتنی ہی بری لگے۔''

اس بنیاد پر ضروری ہے کہ اسلام ہی جمہوریت پر غالب ہو نہ یہ کہ اسلام کو جمہوریت کے دائرے اور قالب میں ڈھالا جائے۔

جمہوریت کے حقوق اور آزادیوں کی تحقیق:

جمہوریت کی دوسری اصل جمہوری حقوق اور آزادیاں ہیں یہ حقوق اور آزادیاں اصل میں جمہوریت کے نظریے اور فلسفے کا حاصل اور ثمرہ ہیں جس نظام میں بھی یہ حقوق اور آزادیاں لوگوں کے لیے نہ ہوں تو وہ نظام جمہوری نہیں کہلا سکتا۔

ا۔ دین اور عقیدے کی آزادی کی تحقیق

جمہوری حقوق اور آزادی میں سب سے پہلے دین کے انتخاب اور عقیدے کی آزادی کا نمبر آتا ہے۔ جمہوریت میں ہر انسان کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ اپنی مرضی سے جب چاہے نیا دین اپنا لے، مثال کے طور پر ایک انسان یہ حق رکھتا ہے کہ آج یہودی ہو، کل نصرانی ہو جائے اگلے روز ہندو بن جائے اور اس سے اگلے روز مسلمان ہو جائے پھر دوبارہ اسلام چھوڑ دے اور بدھ مت مذہب اختیار کر لے یا تمام آسمانی دینوں کا انکار کر کے ملحد اور کمیونسٹ بن جائے، تو کوئی اس کا محاسبہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی اس سے عقیدے کی آزادی کا حق چھین سکتا ہے۔

جمہوریت میں دین اور عقیدہ ایک ایسا شخصی معاملہ ہے جس کے ساتھ ملکی قانون اور نظام کا کوئی سروکار نہیں وہ جمہوریت میں کپڑوں کی حیثیت رکھتا ہے ہر شخص کی اپنی مرضی ہے کہ جس رنگ اور انداز کے کپڑے چاہے پہن لے، لیکن اسلام میں دین اور عقیدہ ایک شخصی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ جس کا سوال ہر شخص سے ہوگا اور قرآن میں اسی کو انسانوں اور جنات کے پیدا کرنے کا مقصد بتایا گیا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاريات: ٥٦)

ترجمہ: ”اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔“

صفحہ ان الدین عند اللہ الاسلام

اللہ جل شانہ نے جنات اور انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور پھر انھیں عبادت کی کیفیت اور طریقے بتانے کے لیے دین نازل کیا ہے اور نبی بھیجے ہیں جن میں سب سے آخر میں دینِ اسلام اور سب سے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں اور آپ ﷺ کے آنے کی وجہ سے پچھلے سارے دین منسوخ ہو گئے اور اللہ جل شانہ کے ہاں اکیلا مقبول دین دینِ اسلام رہ گیا۔ جو کوئی اللہ جل شانہ کی عبادت کے لیے دینِ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین منتخب کریگا تو اللہ تعالیٰ بالکل اسے قبول نہیں فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

(آل عمران : ۸۴)

ترجمہ: ”جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شمار ہوگا جو سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔“

دینِ اسلام میں مذہب چھوڑنا ارتداد ہے اگر توبہ کر کے اخلاص کیساتھ اسلام کی طرف نہ لوٹ آئے تو اس کی سزا قتل ہے کیونکہ ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا پرانے دین کو باطل کہنے کے مترادف ہے یعنی جو کوئی اسلام سے کسی اور دین میں جاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے اسلام کے باطل ہونے کا حکم لگاتا ہے اور نئے دین کی حقانیت کا اعتراف کرتا ہے۔

لیکن جمہوریت میں دین کے بدلنے کی کوئی سزا نہیں کیونکہ یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ افغانستان میں امریکیوں نے جو جمہوری نظام رائج کیا ہے اس میں بھی یہی ارتداد کا حق قانون کے لحاظ سے ہر فرد کے لیے ہے کیونکہ آئین کی دفعہ ۶ میں صراحت کے ساتھ جمہوریت اور انسانی حقوق کی مدد کو مملکت کی ذمہ داری بتلایا گیا ہے۔

اسی طرح انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی دفعہ ۱۸ میں صراحت کے ساتھ یہ لکھا گیا ہے کہ ہر انسان کو نظریے کی آزادی اور دین کے انتخاب کا حق حاصل ہے، اور یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنے دین و

عقیدے کی تبلیغ کرے، اجتماعی تعلیم اور میڈیا کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کرے اور کھل کر اپنے دینی شعائر پر جس طرح چاہے عمل کرے اس کے دینی شعائر کو تحفظ بھی حاصل ہوگا۔

اسی آئین کی دفعہ ۱۹ میں ارتداد کے حق کو مزید صراحت سے اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

> ''ہر انسان کو اپنی رائے اور اپنی راہ متعین کرنے میں انسانی حقوق آزادی کے تحت اپنا حق حاصل ہے۔''

یہ آزادی اس کو بھی شامل ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے افکار اور نظریات بغیر کسی مداخلت کے مانے اور یہ بھی کرسکتا ہے کہ آپنے افکار اور نظریات ہر ممکن ذریعے سے ہر جغرافیائی قید و بند کے بغیر اپنائے اور اس کا پرچار کرے، چونکہ افغانستان کا موجودہ آئین جو جمہوریت کے استحکام اور انسانی حقوق کے فروغ کو مملکت کی ذمہ داری سمجھتا ہے اور ان دونوں میں دین اور عقیدے کا انتخاب ہر شخص کا ذاتی حق شمار کیا جاتا اور اس حق میں کسی دوسرے کی دخل اندازی کو ناجائز کام شمار کرتا ہے۔ اس لیے اس آئین میں غیر اعلانیہ اور ضمنی طور پر ہر ایک کو مرتد ہونے کا حق حاصل ہے، اب لوگوں اور ملک کے حالات پر موقوف ہے کہ کون 'عبدالرحمٰن پنجشیری' کی طرح جمہوریت کے اس حق سے استفادہ کرتے ہوئے اعلان کرنے کی جراءت کرتا ہے اور کون اس کو مخفی رکھتا ہے۔

بعض نام نہاد اسلامی حکومتوں نے اپنے آئین میں یہ لکھ رکھا ہے کہ مملکت میں اسلام کے خلاف قوانین نہیں بنائے جائیں گے لیکن دوسری جانب یہ بھی صراحت سے لکھا ہے کہ ہم اقوام متحدہ، عالمی معاہدوں اور انسانی حقوق کے قوانین کی پاسداری کرنے کا عہد کرتے ہیں جیسے کہ افغانستان کے موجودہ آئین کی دفعہ ۷ میں لکھا گیا ہے۔

افغانستان کے آئین کی دفعہ ۷ ملاحظہ ہو:

> ''ملک اقوام متحدہ کے منشور، عالمی معاہدوں، وہ معاہدے جو افغانستان نے کسی ملک کیساتھ کیے ہیں اور انسانی حقوق کے عالمی ضابطوں کی پاسداری کریگا۔''

افغانستان کے آئین کے مطابق انسانی حقوق کے عالمی آئین کی پاسداری افغانستان پر لازم ہے، چنانچہ افغانستان کے آئین کی دفعہ ۲۹ میں لکھا ہے :

”کسی بھی صورت میں یہ جائز نہیں کہ انسانی حقوق کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جائے جو اقوام متحدہ کے اصولوں اور اغراض و مقاصد کے خلاف ہو۔“

یعنی انسانی حقوق کا خیال اور اس کی سمجھ صرف اقوام متحدہ میں ہے اور جو ملک انسانی حقوق کی ادائیگی کرنا چاہیں تو انہیں چاہیے کہ ان کے انسانی حقوق کے قوانین اقوام متحدہ کے اصولوں کے مطابق ہوں نہ کہ اپنے دین اور مذہب کے مطابق، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کسی اسلامی ملک میں کہ جس میں جمہوریت رائج ہو اسلام بھی عملاً نافذ ہو جائے اور اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کا آئین بھی عملی شکل میں موجود رہے، تو یہ ایک خام خیالی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اسلام کا عملی نفاذ اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق وغیرہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔

اسلام میں عقیدے اور دین پر زبردستی مجبور کر کے مسلمان نہیں بنایا جا سکتا صرف دعوت اور اچھے طریقے سے ان کے ساتھ مناقشہ اور مناظرہ کیا جا سکتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّکَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾

(النحل ۱۲۵)

ترجمہ: ”اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو اور (اگر بحث کی نوبت آئے تو) ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔“

اسلام میں زبردستی نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرة: ۲۵۶)

ترجمہ: ”دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔“

اسلام غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی حقانیت اور فضیلت بیان کرتا ہے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی وصیت کرتا ہے لیکن زبردستی نہیں منواتا اور اگر پھر بھی وہ اسلام کو نہیں مانتے تو ان کو اپنے دین اور طریقے پر اس شرط پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو کفر کی طرف دعوت نہیں دیں گے، معاشرے اور اجتماعیت سے متعلق اسلامی نظام، انتظامی اصولوں اور ضوابط میں دخل نہیں دیں گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے لے کر آج تک پوری اسلامی دنیا میں عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام نے ان کو اپنے ساتھ رہنے کا حق دیا ہے لیکن اسلام میں کسی طرح بھی کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں کہ مذہب سے پھر جائے کیونکہ مرتد ہونے کے عمل سے وہ بزعم خود اسلام پر باطل ہونے کا حکم لگاتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر وہ اسلام سے کیوں نکلتا، چونکہ اس کے اس عمل سے معاشرے میں مذہب کے بارے میں اضطراب اور عدم اطمینان کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس لئے مرتد ہونے کے بعد اگر وہ واپس اسلام میں نہ لوٹ آئے تو مار دیا جاتا ہے جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

((من بدّل دينا فاقتلوه))(رواه البخاري)

ترجمہ: ”جس نے اپنا دین (اسلام) بدل لیا اسے قتل کر دو۔“

اسلام میں عقیدے کی آزادی اور جمہوریت میں عقیدے کی آزادی کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن وہ مغرب زدہ علماء جو چاہتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے اسلام اور جمہوریت کے درمیان فرق ختم کر کے دونوں کو ایک ہی چیز بنا دیں، وہ منافقانہ انداز میں دونوں آزادیوں کو ایک ہی طرح کا بتاتے ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے اسلام کے لبادے میں کفر کو خوبصورت شکل میں پیش کریں۔

۲۔ آزادیٔ اظہارِ رائے کی تحقیق

پس منظر

جمہوریت کی آزادیوں میں سے ایک آزادی ”اظہارِ رائے کی آزادی“ ہے۔ جمہوریت میں ہر کوئی یہ حق رکھتا ہے کہ اپنا ہر قسم کا نظریہ آزادی کے ساتھ بیان کرے اگرچہ اس کا نظریہ وحی اور دینی

شعائر کے خلاف ہو، اس آزادی کے حصول کا تصور مغرب میں اس لیے پیدا ہوا کہ مغرب انقلاب فرانس سے پہلے کلیسا کے دینی اور نظریاتی استبداد کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا چونکہ کلیسا ہٹ دھرمی اور نظریاتی انفرادیت میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا لہٰذا کسی کو دینی، اخلاقی، اجتماعی امور یہاں تک کہ سائنسی امور میں بھی اظہار رائے کا حق حاصل نہیں تھا اور اگر کوئی رائے کے اظہار کی جرأت کرتا بھی تو اسے طرح طرح کی سزائیں دی جاتیں اسی لئے یورپ والوں نے کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی اور تحریف شدہ مسیحیت کے تسلط کو ختم کر دیا اور زندگی کے تمام امور میں اظہارِ رائے کی آزادی حاصل کر لی۔

اہل یورپ نے اس وقت یہ اقدام ایک باطل اور تحریف شدہ دین کے خلاف اٹھایا تھا لیکن بعد میں یہ آزادی ایک مقدس حق کی حیثیت سے دینِ حق کے خلاف بھی استعمال ہونے لگی یہاں تک کہ اسلام کے مقدسات پر اس غیر محدود آزادی کی یلغار کی گئی اور اسلام، شریعت، قرآن اور پیغمبر ﷺ کے خلاف اپنی رذیل حرکتوں کو ''آزادیٔ اظہار رائے'' کے حق کے نام سے سند جواز فراہم کیا گیا۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقدامات کو ماضی قریب میں ساری دنیا نے دیکھا۔

☆ ہندوستان میں مرتد سلمان ① رشدی جو برطانوی شہریت رکھتا ہے نے مغرب کے برانگیختہ کرنے پر اسلام کے خلاف اپنی مشہور کتاب ''شیطانی آیات'' لکھی۔ جس سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو نفسیاتی طور پر تکلیف پہنچی لیکن جب مسلمانوں نے مغرب سے اس کے محاسبے کا مطالبہ کیا تو پورے مغرب نے بیک آواز اس کے اس اقدام کا دفاع کرتے ہوئے اس کے کام کو آزادیٔ اظہار رائے کے ضمن میں داخل کر کے جائز قرار دیا، چنانچہ اس کو پناہ بھی دی اور آج تک اس کو اپنی حفاظت میں رکھے ہوئے ہے۔ مغرب نے نہ صرف یہ کہ اس کی حفاظت کی بلکہ اسے برطانیہ کے بڑے شاہی اعزاز سے بھی نوازا گیا اور مسلمانوں کے تحفظات کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ ②

☆ ② سلمان رشدی کے بعد بنگلہ دیش کی مرتدہ مصنفہ ''تسلیمہ نسرین'' بھی رشدی کے نقشِ قدم پر چلی۔ اس کو بھی مغرب نے اپنی گود میں پناہ دی اور اس کے اقدام کو رائے کی آزادی سے تعبیر کیا۔

☆ ہالینڈ کے صحافی نے قرآن کی توہین پر مشتمل فلم بنائی، جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ہالینڈ کے صدر نے مذکورہ صحافی کے اس کام کو اظہار رائے کی آزادی قرار دے کر اس کا دفاع کیا۔

☆ قرآن کریم کی دوسری توہین وہ تھی کہ جب مغرب ''سچے قرآن'' کے نام سے الحاد اور توہین سے بھری ہوئی ایک کتاب جس میں قرآن کریم کی سورتوں کے مشابہ سورتیں درج تھیں، منظر عام پر لے کر آیا اور اسے انٹرنیٹ پر شائع کیا، اس گھناؤنے اور شرمناک فعل کو بھی اظہار رائے کی آزادی کا حق قرار دیا۔

☆ ڈنمارک کے ایک مصور نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب توہین آمیز کارٹون بنا کر شائع کیے، جس پر مسلمانوں نے ساری دنیا میں احتجاج کیا اور جب اس کے محاسبے کا مطالبہ کیا تو ڈنمارک کے صدر نے کارٹون بنانے والے کی طرف سے حکومتی سطح پر دفاع کیا اور اس کے کام کو رائے کی آزادی کا حق جانا، جب مسلمانوں نے احتجاج میں شدت لا کر پہلے یورپی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تو نیٹو کے اتحادی صدر نے ڈنمارک کے مؤقف کو پورے یورپ کا مؤقف ہونے کا اعلان کیا چنانچہ اس کے بعد وہ کارٹون یکے بعد دیگرے تمام یورپی ممالک نے بھی شائع کیے۔

☆ افغانستان میں جب امریکا کی کٹھ پتلی حکومت کی حمایت میں مرتد 'پرویز کامخش' نے اسلام کے خلاف مضامین چھاپے اور شائع کیے اور مسلمانوں کے شدید دباؤ کے نتیجے میں عدالت نے اس پر مقدمہ چلا کر سزائے موت اور قید کا فیصلہ کیا تو پورا مغرب اور مغربی میڈیا اس کی حمایت میں کھڑا ہو گیا اور اس کے موقف کو رائے کے اظہار کی آزادی کے نام سے تعبیر کیا۔ اور اسے آزاد کرانے کی کوششیں شروع کر دیں جس کے نتیجے میں سزائے موت کا حکم قید میں تبدیل ہو گیا اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ رہا ہو کر ایک ہیرو میں تبدیل ہو جائے (۱)

---

۱) کرزئی نے دوسری دفعہ صدر منتخب ہوتے ہی اسے ایک صدارتی فرمان کے تحت آزاد کر کے باعزت طریقے سے ناروے کے حوالے کر دیا

وہ رائے جو حق کے بیان اور کفر سے آزادی کے لئے ہو اسلام نہ صرف اس کی حمایت کرتا ہے بلکہ اسے ایک عبادت سمجھتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے لوگوں کو ابھارتا اور تیار کرتا ہے اگر چہ وہ ایک ظالم حاکم کے سامنے ہی کیوں نہ ہو اس حدیث شریف میں جسے حضرت ابو سعید خدریؓ نے روایت کیا ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں:

((انّ من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر))

ترجمہ: ”بڑے جہاد میں سے ایک یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے عدل کی بات کہی جائے۔“

اور اگر کوئی حق کہنے کی وجہ سے مار دیا جائے تو وہ اسلام میں شہید شمار کیا جاتا ہے جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خير الشهداء حمزة بن عبد المطلب و رجل قام الى رجل فأمره و نهاه في ذات الله فقتله على ذالک)) (رواه المستدرک الحاكم)

ترجمہ: ”شہیدوں میں اعلیٰ شہید حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور وہ آدمی ہے جو اللہ جل شانہ کے لئے کسی کو نیکی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے اور اس کام پر اسے مار دیا جائے۔“

معلوم ہوا کہ اسلام میں ہر کوئی دوسرے کو حق بول سکتا ہے اور نصیحت کر سکتا ہے کیونکہ دین نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے لیکن جمہوریت میں انسان کو ہر چیز کے کہنے اور اظہار کی اجازت ہے چاہے وہ حق ہو یا باطل۔

اُن اسلامی مملکتوں میں جن میں مغربی جمہوریت حاکم ہے واضح نظر آتا ہے کہ وہاں لوگ صرف باطل کے اظہار کا حق رکھتے ہیں اور جو کوئی حق رائے کا اظہار کرے اسے جان سے مارنے، قید یا جلا وطن کرنے اور طرح طرح کی دھمکیاں دی جاتی ہیں، کفر کے نظریات کی اشاعت کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں لیکن حق کے اظہار کے لئے کسی ریڈیو، ٹیلیویژن، رسالہ، اخبار، اور

دیگر نشریات کی اجازت نہیں دی جاتی اور اگر کہیں ایک آدھ جگہ اجازت مل بھی جائے تو اس کی پالیسی اور حدود وضوابط اور موضوعات حکومت کی طرف سے پہلے ہی متعین کر دیئے جاتے ہیں جن کے علاوہ نشریات جرم شمار کی جاتی ہے۔

۳۔ شخصی آزادی کی تحقیق

وہ آزادی جو جمہوریت کی روح رواں شمار کی جاتی ہے، شخصی آزادی ہے جسے اخلاقی آزادی بھی کہا جاتا ہے۔

شخصی آزادی کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے بارے میں مکمل آزادی رکھتا ہے اور وہ بغیر کسی قید کے سب کچھ کر سکتا ہے، چنانچہ اس نظریہ کی رو سے زندگی کے مزے لوٹنے میں اجماعی اور عرفی رسم و رواج، آداب و اخلاق پر مشتمل قوانین مانع نہیں بن سکتے اور معاشرے کا کوئی فرد اس بارے میں کسی کے زیر تسلط نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کی آزادی کا مطالبہ بھی اہل مغرب کی طرف سے کلیسا کے پادریوں کی طرف سے اجتماعی اور اخلاقی زندگی پر شدید پابندیوں کا ردعمل تھا چنانچہ جس طرح لوگوں کے دین، عقیدے اور عبادت میں کلیسا کا تسلط ختم کر دیا گیا اسی طرح کلیسا کی اخلاقی نگرانی کو بھی ختم کر دیا گیا۔

فرانس کے انقلاب نے دین کو حکومت سے جدا کر دیا اور سیکولرازم نظریے کو ایجاد کیا اور اس کے بعد دین اور اخلاق کے درمیان بھی جدائی پیدا کر دی اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اخلاق پر اچھے اور برا ہونے کا حکم لگانا دین کا کام نہیں بلکہ یہ انسان کے اپنے ذوق اور سلیقے کا کام ہے اس طور پر کہ ہر وہ چیز جو کسی شخص کو اچھی نظر آئے وہ اچھا اخلاق ہے اور اس پر لوگوں کو اعتراض کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ اسی شخصی آزادی کے فلسفے کے ماننے کی وجہ سے زنا، ہم جنس پرستی، مرد کا مرد سے اور عورت کا عورت سے شادی کرنا اخلاق کے خلاف شمار نہیں کیا جاتا، مغربی ممالک کے قوانین ان تمام کاموں کی اجازت دیتے ہیں تاہم یہ تمام کام جمہوریت میں اس وقت تک جرم شمار نہیں کیے جاتے جب تک کہ باہمی

رضامندی کے ساتھ ہوں اور اگر زبردستی کی شکل میں کیے جائیں تو پھر بھی یہ کام اس وجہ سے جرم نہیں ہیں کہ یہ کام حرام ہیں بلکہ ان کاموں کو اس وجہ سے جرم شمار کیا جاتا ہے کہ یہ زبردستی اور بغیر رضامندی کے کیے جا رہے ہیں۔

شخصی آزادی کے مغربی معیار کی بنیاد پر جمہوریت میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اسی وجہ سے جس ملک میں جمہوریت نافذ ہوتی ہے خود بخود ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا اسلامی فریضہ وہاں سے نکل جاتا ہے، یعنی کسی ملک میں یا تو جمہوریت ہوگی یا ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا فریضہ زیادہ تر اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے اور جمہوریت میں یہ دونوں شخصی امور ہیں جس میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں۔

جمہوریت میں شخصی آزادی اور اخلاق کا فلسفہ انگریز فلاسفر ہوبز کے (۱۵۸۸۔۱۶۷۹) نظریات پر قائم ہے جو کہتا ہے کہ خیر کا معنی شہوت (مزہ) ہے یعنی ہر وہ چیز جسمیں شہوت (مزہ) موجود ہو وہ خیر کا کام ہے اور ہر وہ چیز جس میں نفرت موجود ہو وہ شر کا کام ہے اور خیر اور شر کے معیار کا تعین دین کا نہیں بلکہ شخصی ذوق اور ضرورت کا کام ہے۔

۴۔ رہائش کے انتخاب میں آزادی کی تحقیق

جمہوریت میں ہر انسان کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ جہاں جی چاہے وہاں رہے اسی بنیاد پر مغربی جمہوریت یہ نہیں چاہتی کہ کفار جزیرۃ العرب سے نکالے جائیں اور کفار کو حرم کے ساحل پر نہ چھوڑا جائے حالانکہ جزیرۃ العرب میں کفار کو نہ چھوڑنے کا صریح حکم حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((اخرجوا المشركين وفي رواية: اليهود والنصارىٰ من جزيرة العرب...))

(البخاری)

ترجمہ: ""مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔""

اور دوسری روایت میں ہے:

""یہود اور نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔""

اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں تمام یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا تھا لیکن آج کے دور میں اگر کوئی شخص یہودی، نصرانی یا کسی اور کافر کو جزیرہ عرب سے نکالنے کا مطالبہ کرے یا نکالنے کی کوشش کرے تو اس کا جمہوریت کی مخالفت کے جرم میں محاسبہ کیا جاتا ہے اور اس کے قتل کرنے کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔

۵۔ ملکیت کے حق کی تحقیق

چونکہ مغربی جمہوریت کیپیٹل ازم (سرمایہ دارانہ نظام) کے تحفظ کے لئے میدان میں لائی گئی ہے اسی وجہ سے ہر شخص کو کسی بھی طریقے سے مال کمانے اور کسی بھی مد میں خرچ کرنے میں جمہوریت کسی قسم کی دینی یا اخلاقی پابندی لگانے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری ممالک میں سرمایہ دار احتکار (ذخیرہ اندوزی)، مزدور کے استحصال اور یہاں تک کہ دیگر ممالک کو زیر تسلط لانے اور اس کی معدنی دولت چوری کرنے، انہیں لوٹنے اور جنگوں کے اسباب پیدا کر کے اپنا اسلحہ فروخت کرنے اور جنگی سازوسامان بنانے والے کارخانے چلانے کے ذریعے اپنا سرمایہ بڑھاتے ہیں اور پھر اسے عیش و عشرت، جوئے، فحاشی اور فضول خرچیوں میں صرف کرتے ہیں لیکن اسلام میں جیسے مال کمانے کے لئے حلال راستوں اور وسائل کا انتخاب ضروری ہے اسی طرح مال خرچ کرنے کے لئے بھی کچھ قیدیں لگائی گئی ہیں۔

اسلام ایک ایسا متوازن اور معتدل اقتصادی نظام رکھنے والا دین ہے کہ نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح سرمایہ چند خاص لوگوں کے ہاتھوں میں محدود رکھتا ہے اور نہ کمیونزم کی طرح افراد کو شخصی

ملکیت سے محروم کرتا ہے بلکہ اسلام سرمایہ رکھنے کا حق بھی دیتا ہے لیکن سرمایہ دار کے سرمایہ میں غریبوں کا حق محفوظ رکھتا ہے چنانچہ لوگوں کے اموال سے حکومت اسلامیہ غریبوں کا حق وصول کر کے ان تک پہنچاتی ہے۔

۶۔ پیشہ اختیار کرنے کی آزادی کی تحقیق

جمہوریت میں انسان کو ہر قسم کا کام کرنے اور پیشہ اختیار کرنے کا مطلق حق حاصل ہے لیکن اسلام میں انسان صرف اور صرف حلال اور جائز کاموں کے کرنے کا حق رکھتا ہے اور اگر ایسا کوئی کام اختیار کرلے جو اسلام سے متصادم ہو جیسے شراب خانہ کھولنا، زنا کا اڈہ بنانا یا اس جیسے دوسرے ناجائز کام تو اس صورت میں اسلام اس فرد کو اس قسم کے کاموں کی اجازت نہیں دیتا لیکن جمہوریت میں وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

۷۔ کام سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے حق کی تحقیق

جمہوریت میں فرد کو ہر فن اور ہر علم حاصل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اسلام میں انسان کو ایسے علوم اور فنون سیکھنے کا حق نہیں دیا جاتا جو اسلام کے ساتھ متصادم ہوں جیسے جادو، شعبدہ بازی، مداری گری اور اس طرح کے دیگر علوم چنانچہ اسلام جادو کے سیکھنے کو کفر کہتا ہے اور اس کا راستہ روکتا ہے۔

پارلیمان جمہوریت کی نمائندگی کرنے والا ایک طاغوتی ادارہ

پارلیمان کی حقیقت کیا ہے؟

(Parliment \ پارلیمنٹ

پارلیمان لوگوں کے منتخب نمائندوں کا وہ ادارہ ہے جو لوگوں کے لئے قوانین بنانے یا تشریع (شریعت سازی) یعنی تحلیل وتحریم (کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے) کا مطلق العنان (بے لگام) حق رکھتا ہے آکسفورڈ ڈکشنری پارلیمان کی اسطرح تشریح کرتی ہے:

Parliment is a group of people that makes the laws of a country.

”پارلیمان لوگوں کا وہ گروہ ہے جو ایک ملک کے لئے قوانین بناتا ہے۔“

گذشتہ مباحث میں ثابت کیا گیا کہ جمہوریت میں لوگوں کی اکثریت الٰہ کا مرتبہ رکھتی ہے کیونکہ حاکمیتِ اعلیٰ کا وہ حق جو امر ونہی، تحلیل وتحریم کا مطلق العنان حق ہے اکثریت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جیسے دین میں اللہ جل شانہ کا فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جمہوریت میں اکثریت کی رائے رد نہیں کی جا سکتی۔

چونکہ جمہوری نظام میں اکثریت اللہ جل شانہ کا مرتبہ رکھتی ہے اسی طرح پارلیمان جو کہ اکثریت کی نمائندہ جماعت ہوتی ہے، پیغمبری (نمائندگی) کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یعنی ہر نمائندہ اپنے ووٹر کی مرضی کے مطابق قانون بنائے گا اور اس کی خواہشات کی تکمیل کرے گا، جمہوریت جو کہ اصلاً سیکولرازم (بے دینی) کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے، حکومت کے کاموں میں دین کو مداخلت کا حق بالکل نہیں دیتی، اسی بنیاد پر وہ تمام قراردادیں اور مسودے جو قانون بننے کے لئے پارلیمان میں بحث کے لئے پیش کئے جاتے ہیں انہیں دینی معیار پر نہیں پرکھا جاتا بلکہ کثرت رائے کی بنیاد پر دیکھا جاتا ہے۔ نمائندوں کی مختلف آراء، نظریات اور مسودے اس وقت تک عملی شکل اختیار نہیں کرتے جب تک

کہ پارلیمان کی طرف سے انہیں قانونی حیثیت نہ مل جائے کیونکہ پارلیمان میں قانون اس کو کہا جاتا ہے جو پارلیمان کے دونوں ایوانوں سے منظور شدہ ہو اور صدر مملکت اسے منظور کرلے اور جب تک یہ مراحل طے نہ ہوں اس وقت تک کسی بھی قانون کو عملی طور پر نافذ کرنے کے قابل نہیں جانا جاتا۔

جمہوریت میں پارلیمان تک ہر فکر اور نظر کے لوگوں کو انتخابات کے راستے سے پہنچنے کا حق حاصل ہوتا ہے، کفر و الحاد یا اسلام کے کسی بھی عقیدے سے انحراف پارلیمان تک پہنچنے سے مانع نہیں ہوتا، اسی بنیاد پر جو نمائندہ بھی پارلیمان تک پہنچ جائے وہ وہاں پر اپنی مرضی اور پسند کے مطابق قانون کے لئے دفعات پیش کرسکتا ہے اور اپنے کسی بھی قسم کے نظریات اور افکار بیان کرنے کی وجہ سے عدلیہ کے مواخذے میں نہیں آسکتا چاہے وہ نظریات دین کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، یہی بات کرزئی حکومت کے آئین کی دفعہ ۱۰۷ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

> ”ملکی شوریٰ کا کوئی ممبر اس رائے یا نظریے کی وجہ سے جو اپنے کام کے دوران ظاہر کرے عدلیہ کی تعقیب (گرفت یا مواخذہ) کے نیچے نہیں لایا جائے گا۔“

پارلیمان طاغوتی ادارہ کیوں ہے؟

اسلامی شریعت میں ہر اس ذات کو طاغوت کہا جاتا ہے جس کی اللہ کے علاوہ عبادت کی جائے، اور عبادت صرف نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، اور دعا کو نہیں کہا جاتا بلکہ کسی ذات کی تحلیل، تحریم اور تشریع کے ماننے کو بھی کہا جاتا ہے اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جو امام ترمذی، امام بیہقی اور دیگر محدثین نے اپنی کتابوں میں عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ قبیلہ 'بنو طے' کے مشہور سخی شخص حاتم طائی کے بیٹے تھے وہ اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے اور شام میں اہل کتاب کے ساتھ رہتے تھے، جب وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے گلے میں سونے کی صلیب لٹک رہی تھی تو آپ نے فرمایا کہ اس گندگی کو اپنے گلے سے اتار دو، وہ کہتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آیا تو آپ ﷺ قرآن کریم کی یہ آیت

تلاوت فرما رہے تھے:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾ (التوبة ۳۱)

ترجمہ: ''انہوں نے اللہ کی بجائے اپنے احبار (یعنی یہودی علماء) اور راہبوں (یعنی عیسائی درویشوں) کو خدا بنا لیا ہے۔''

عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ وہ ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو اُن کے کہنے پر حلال اور حلال کردہ چیزوں کو ان کے کہنے پر حرام نہیں گردانتے تھے؟ تو میں نے کہا جی ہاں! وہ ایسا ہی کرتے تھے تو آپ نے فرمایا یہی تو ان کی عبادت کرنا تھا۔ جمہوریت میں چونکہ حلال اور حرام کی تشریع پارلیمان کی طرف سے ہوتی ہے اور پارلیمان کے ارکان کو قوانین وضع کرنے کا کلی حق دیا جاتا ہے تو اس بنیاد پر ان کو قانون ساز بھی کہا جاتا ہے حالانکہ اسلام میں کسی چیز کو حلال وحرام کرنے کا حق صرف اور صرف اللہ جل شانہ کو حاصل ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق دینا شرک ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللّٰهُ﴾ (شوریٰ: ۲۱)

ترجمہ: ''کیا یہ ایسے شریک بھی رکھتے ہیں جو ان کے لئے وہ دین بناتے ہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔''

جمہوریت میں دینی اور اخلاقی امور کے بارے میں بھی جائز و ناجائز کا فیصلہ پارلیمان کا کام ہوتا ہے، مثلاً اگر مغربی پارلیمان نے ہم جنس پرستی کو جائز قرار دے دیا تو اب یہ جائز سمجھا جائیگا اور اس کے لئے قوانین اور ضابطے بنائے جائیں گے۔

جمہوریت میں فریقین کے درمیان نزاع کی صورت میں فیصلہ شریعت نہیں بلکہ ان قوانین پر کیا جاتا ہے جو جمہوری اصولوں کی روشنی میں طے کیے گئے ہوں حالانکہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی شریعت

کے علاوہ کسی اور سے فیصلہ کروانے کو کفر (طاغوت) سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ انہیں نہ مانیں اور ان لوگوں کے ایمان کو جھوٹ کا ایمان سمجھا گیا ہے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم مؤمن ہیں لیکن فیصلہ اللہ جل شانہ کے قانون سے نہیں بلکہ بندوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق کرتے ہیں، اس کے بارے میں، اللہ جل شانہ نے یوں فرمایا:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْکَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِکَ يُرِيْدُونَ
أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ
ضَلاَلاً بَعِيْداً (٦٠) وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ إِلَى مَا أَنزَلَ اللّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ
يَصُدُّونَ عَنکَ صُدُوداً﴾ (النساء ٦٠. ٦١)

ترجمہ: ”(اے پیغمبر) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر پرلے درجے کی گمراہی میں مبتلا کر دے (٦٠) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم ان منافقوں کو دیکھو گے کہ وہ تم سے پوری طرح منہ موڑ بیٹھتے ہیں (٦١)“

اسی طرح اللہ جل شانہ ان لوگوں کے حق میں جو فیصلہ اللہ جل شانہ کے قانون سے نہیں کرتے فرماتے ہیں:

﴿وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيْقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَلِکَ وَمَا
أُوْلَئِکَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۴۷) وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُم
مُّعْرِضُونَ﴾ (النور ۴۷. ۴۸)

ترجمہ: ''اور یہ (منافق) لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لے آئے ہیں پھر ان میں سے ایک گروہ اس کے بعد بھی منہ موڑ لیتا ہے اور یہ لوگ (حقیقت میں) مومن نہیں ہیں (۴۷) اور جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے کچھ لوگ ایک دم رخ پھیر لیتے ہیں۔''

لیکن جب اسلام کا کوئی حکم جمہوریت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو اور ان کے مقاصد اس سے کسی بھی درجے میں حاصل ہو سکتے ہوں تو پھر وہ اسلام کے حکم کو مانتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ اللہ جل شانہ کا واجب کردہ حکم ہے بلکہ اس لیے کہ وہ جمہوریت کے مطابق ہے اور اس کے مخالف نہیں۔ اس معاملے میں جمہوریت دان بالکل اللہ جل شانہ کے اس فرمان کے مصداق ٹھہرتے ہیں کہ جس میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ﴾ (النور. ۴۹)

ترجمہ: ''اور انہیں حق وصول کرنا ہو تو وہ بڑے فرمانبردار بن کر رسول کے پاس چلے آتے ہیں۔''

اسلامی دنیا کی ان تمام حکومتوں میں جو اپنے آپ کو جمہوری کہتی ہیں فیصلے اللہ جل شانہ کی مرضی کے خلاف اسی قانون کے مطابق کیے جاتے ہیں جو جمہوریت کے اصولوں کے مطابق بنا ہو۔

اِن حکومتوں میں پارلیمان کے بنائے ہوئے قوانین کی حرمت اور ان کا تقدس قرآن سے بلند ہوتا ہے اسی وجہ سے اگر کبھی کسی قانون کے خلاف قرآن و حدیث کے جتنے بھی دلائل دیے جائیں تو وہ اگر آئین کے مطابق نہ ہوں تو پارلیمان اسے قبول نہیں کرتی، یہ پارلیمان کے طاغوتی ادارہ ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔

کسی بھی جمہوریت نواز اسلامی ملک کی پارلیمان کا کوئی ممبر اگر کبھی اسلام کے لئے کام کرنا چاہے اور شریعت کے کسی حکم کو پارلیمان کے راستے قانون کی حیثیت دینا چاہے تو اس کے لئے ضروری

ہے کہ ایک منافق کا کسی معاملے میں ایک یہودی سے جھگڑا تھا تو وہ دونوں فیصلے کے لیے حضور ﷺ کے پاس چلے گئے، رسول اللہ ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمادیا لیکن منافق نے اس فیصلے پر قناعت اختیار نہیں کی اور حضور ﷺ کا کیا ہوا فیصلہ حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پتہ چلا کہ اس جھگڑے میں حضور ﷺ نے ایک دفعہ فیصلہ فرمادیا ہے اور منافق حضور ﷺ کے فیصلے پر حضرت عمرؓ کا فیصلہ چاہتا ہے تو آپ نے اس کو مرتد سمجھتے ہوئے اس کا سرتن سے جدا کردیا اس کام میں رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملامت نہیں کی بلکہ ان کو فاروق کا لقب بھی دیا۔

اسلام میں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کا حکم اکثریت کے فیصلے کے لئے پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر سوچے سمجھے ان کو کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح حدود، حجاب، قصاص، کفار کیساتھ دوستی، حلال وحرام اور دیگر احکام اکثریتی رائے اور فیصلے کے لیے پیش کیے بغیر عمل کرنے کے لیے ہیں لیکن جمہوریت میں یہ تمام اعمال جمہوری اصولوں کے خلاف ناپسندیدہ اور ناقابلِ قبول ہیں۔

جمہوری عمل میں شامل ہونے والوں کے دلائل اور ان کے جوابات

اسلام کی طرف منسوب بعض علماء جو یا تو مغرب کے نظریات سے متاثر ہو گئے ہیں یا جہاد اور قربانیوں کے نبوی طریقے اور اسلامی حکومت کے قیام کے نبوی طریقے سے ناآشنا ہیں یا ہر طرح کی غیر اسلامی حکومت اور نظام میں اور ہر قسم کی ذلت آمیز شرائط پر حکومت کی فراہم کردہ مراعات اور آسائشوں سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ افغانستان میں موجود امریکی سہارے پر کھڑی کٹھ پتلی جمہوری حکومت میں بھی بہت سی صرف نام کی اسلامی تنظیموں، جماعتوں اور اشخاص نے یہی طریقہ اپنایا ہوا ہے کہ وہ لوگ جمہوری حکومتوں اور پارلیمانوں میں داخل ہونے کے لئے اسلامی شریعت میں بعض بے بنیاد دلائل تراش کر اپنی شرکت کو جواز بخشتے ہیں۔ انہی بے موقع اور فضول شبہات میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی دلیل

حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کیساتھ کام کیا اور اس کے وزیر رہے

بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ جل شانہ کے پیغمبر ہوتے ہوئے مصر کے کافر بادشاہ کیساتھ اس کی حکومت میں وزیر کی حیثیت سے کام کیا اس وجہ سے آج مسلمان بھی یہ کر سکتے ہیں کہ ایک کفری نظام کیساتھ چلتے ہوئے کام کریں۔

مذکورہ بالا دلیل کی بنا پر جمہوری نظام کا حصہ بننا درج ذیل وجوہات کی بناء پر باطل ہے:

الف۔ موجودہ دور کی پارلیمانیں (ایوانہائے حکومت یا اسمبلیاں) طاغوتی ادارے ہیں کیونکہ پارلیمان کو تشریع، تحلیل، اور تحریم کا حق دیا جاتا ہے حالانکہ تشریع اور قانون سازی صرف اور صرف اللہ جل شانہ کا حق ہے لیکن جمہوریت میں یہ حق عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جن کی نمائندگی پارلیمان کرتی ہے۔

اسلام میں حاکمیت اور تشریع کے حق میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں جبکہ جمہوریت میں یہ حق بالکلیہ عوام کا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی شریعت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسلام اور جمہوریت دو الگ الگ دین ہیں دونوں میں قانون سازی کے مصادر مختلف ہیں اسلام میں اس کا مصدر وحی الٰہی اور رسول ہیں جبکہ جمہوریت میں تشریع کا مصدر لوگوں کی خواہشات اور ان کی ناتمام اور ناقص عقلیں ہوتی ہیں، اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

(آل عمران: ۸۵)

ترجمہ: ”جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شمار ہوگا جو سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔“

کیا کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا

دین قبول کر لیا ہوگا؟ یا اپنے توحید پرست آباؤ اجداد کی ملت کے علاوہ کوئی اور ملت اختیار کر لی ہوگی یا اسی طرح کفریہ قانون کے احترام و پاسداری کا حلف اٹھایا ہوگا جیسے موجودہ زمانے کے پارلیمانوں کا حال ہے۔ یوسف علیہ السلام نے تو قید اور بے بسی کے زمانے میں بھی جبکہ ایسے وقت میں انسان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا، شرک اور مشرکین سے براءت کا اعلان کیا تھا جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (٣٧) وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِکَ بِاللَّهِ مِن شَيْءٍ ذٰلِکَ مِن فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ﴾

ترجمہ: ”میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے جو آخرت کے منکر ہیں (٣٧) اور میں نے اپنے دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک ٹھہرائیں یہ (توحید) کا عقیدہ ہم پر اور تمام لوگوں پر اللہ کے فضل کا حصہ ہے لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر ادا نہیں کرتے۔“

اس کے بعد یوسف علیہ السلام شرک اور توحید کی حقیقت بیان کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ حکم صرف اللہ جل شانہ کا چلے گا اور یہ ضروری ہے کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے جیسے کہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

﴿يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (٣٩) مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاء سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِکَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾

ترجمہ: ”اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جس کا

اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔ (۳۹) اس کے سوا جس جس کی تم عبادت کرتے ہو ان کی حقیقت چند ناموں سے زیادہ نہیں ہے جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری، حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام قید اور ضعف کی حالت میں با آواز بلند شرک کا رد کریں اور اعلان کریں کہ حکومت صرف اللہ جل شانہ کے لائق ہے اور پھر جب بالکل آزاد ہوں اور ہاتھ میں حکومت بھی ہو تو پھر یہ حقیقت چھپا کر بادشاہ کے دین کے مطابق فیصلہ کریں جبکہ اللہ تعالی نے انہیں زمین پر حکومت و قدرت بھی دی ہوئی تھی؟

ایک دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ پارلیمنٹ اور وزارت میں فرق ہوتا ہے، پارلیمان شریعت ساز اور قانون ساز ہوتی ہے اور وزارتیں اسے نافذ کرتی ہیں وہ لوگ جو آج کل کی پارلیمانوں میں اللہ جل شانہ کے دین کے خلاف قوانین بناتے ہیں اور انہیں آئین کا حصہ بناتے ہیں ان کا جرم ان لوگوں سے زیادہ ہے جو بنائے ہوئے قانون کو عملی جامہ پہناتے ہیں، لہٰذا ان لوگوں کا استدلال جو پارلیمان تک جانے کے لئے یوسف علیہ السلام کا عمل پیش کرتے ہیں صحیح نہیں ہے۔

آج کل کے طاغوتی نظاموں میں جن میں اللہ جل شانہ کے دین کے ساتھ اعلان جنگ کیا جاتا ہے اللہ تعالی کے دوستوں سے لڑا جاتا ہے اور اس کے دشمنوں کیساتھ دوستی اور اتحاد کیا جاتا ہے اس نظام کی وزارت قبول کرنا حرام اور یوسف علیہ السلام کے عمل کو اس کی دلیل بنانا باطل ہے کیونکہ موجودہ دور کی حکومتوں کے وزیر بھی اسی آئین کی پاسداری اور احترام کا حلف اٹھاتے ہیں جو جمہوریت کی بنیاد پر بنا ہے حالانکہ اللہ جل شانہ نے ایسے طاغوتی حکم کے ساتھ کفر (انکار) کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَکْفُرُوْا بِهٖ﴾

ترجمہ: ”ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کیا کریں۔“

اب بھی اگر کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اسی قسم کے طاغوتی نظام کے ماننے، پاسداری اور احترام کرنے کا حلف اٹھایا ہوگا حالانکہ اللہ جل شانہ نے قرآن میں اُن سے برائی کی نفی کی ہے اور انہیں مخلص بندوں میں شمار کیا ہے تو یقیناً ایسا گمان کرنے والا اللہ کے ایک پیغمبر پر جھوٹ باندھنے والا بڑا کافر اور اسلامی ملت سے خارج شخص ہے۔

ب۔ آج کل کی حکومتوں میں ایسے وزیر رکھے گئے ہیں جو کفریہ قوانین کے ماننے والے اور نافذ کرنے والے ہیں ان کے لئے قدم قدم پر آئین کے مقررہ قوانین کی پابندی ضروری ہوتی ہے تو کیا حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ اس طرح کے بنائے گئے کفریہ اور ظالمانہ باطل قوانین کے پابند تھے، اگر کوئی ان کے بارے اس طرح کا گمان کرتا ہے اور پھر ان کے اس فعل کو بزعم خود اپنے لئے دلیل بھی بناتا ہے تو وہ یقینی طور پر اللہ جل شانہ کے ایک پیغمبر پر کفریہ قوانین قبول کرنے کا الزام لگاتا ہے اور یہ کام بذات خود کفر اور اللہ کے دین سے خروج ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو نبیوں کو اس واسطے بھیجا تھا کہ لوگوں کو طاغوت کو چھوڑنے اور صرف ایک اللہ کے ماننے کی تعلیم دیں چنانچہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾

ترجمہ: ”یقیناً ہم نے ہر امت میں رسول بھیجے تا کہ وہ لوگوں کو یہ کہیں کہ اللہ جل شانہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اپنے آپ کو بچاؤ۔“

اور یہی پیغام حضرت یوسف علیہ السلام کی رسالت کا بھی تھا، پھر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ

یوسف علیہ السلام نے پیغمبری کے ساتھ طاغوت کا قانون بھی مانا ہو اور فیصلے بھی اس کے مطابق کیے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی وزارت درحقیقت اللہ جل شانہ کی طرف سے ان کو عطا کردہ حکومت تھی اور وہ اللہ جل شانہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرتے تھے اس لئے نہ تو ان کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا نہ اپنے منصب سے ہٹا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی انہیں ظالمانہ فیصلے پر مجبور کر سکتا تھا اور یہی تمکین فی الارض کا معنیٰ ہے۔

کیا آج کل کے زمانے میں طاغوتی حکومتوں میں بھی وزیر اس طرح کے مکمل اختیارات رکھتے ہیں؟ پھر وہ کیسے یوسف علیہ السلام پر اپنے آپ کو قیاس کرتے ہیں کیونکہ آج کل کے وزیر تو ہر طرف سے اس طاغوتی اور شیطانی قانون کے شکنجے میں ایسے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اسلام کی خدمت اور فائدے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے جبکہ یوسف علیہ السلام اپنی تمام سرگرمیوں میں ہر قسم کی عدالتی گرفت اور نگرانی سے آزاد تھے کیونکہ جب بادشاہ نے ان کو جیل سے نکالا اور یوسف علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنی باتیں باسلیقہ انداز میں پیش کیں تو بادشاہ ان کی باتوں سے اتنا مطمئن ہوا کہ بادشاہ نے انہیں کہا:

﴿قَالَ إِنَّکَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾

ترجمہ: ''آج سے ہمارے پاس تمہارا بڑا رتبہ ہوگا اور تم پر پورا بھروسہ کیا جائے گا۔''

مفسرین لکھتے ہیں کہ اس کے بعد مصر کا بادشاہ برائے نام بادشاہ تھا اور تمام کام یوسف علیہ السلام کرتے تھے اور عزیز کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، بعض علماء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا تھا اور اس کے بعد یوسف علیہ السلام کے دین پر چلتا تھا۔

کیا آج کل کی طاغوتی حکومتوں میں صالح مسلمان وزیروں کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً جواب نفی میں ہے تو پھر قیاس کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے حق میں تمکین (اقتدار) کی بات ذکر کی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ﴾ (یوسف: ۲۱)

ترجمہ: ”اور اس طرح ہم نے اس سرزمین پر یوسف کے قدم جمائے۔“

تمکین (اقتدار) کا لفظ اس آیت میں مجمل اور مختصر ہے لیکن دوسری جگہ اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ آتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾

ترجمہ: ”یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور لوگوں کو نیکی کی ہدایت کریں اور لوگوں کو برائی سے روکیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔“

چونکہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمکین فی الارض (زمین میں اقتدار) کی خوشخبری دی تھی اسلئے یقیناً یوسف علیہ السلام بھی انہی لوگوں میں سے تھے کہ اپنی حکومت میں لوگوں سے نماز قائم کرواتے، انہیں زکوۃ دینے پر آمادہ کرتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے، اس سلسلے میں سب سے بڑا معروف توحید اور سب سے بڑا منکر شرک ہے، یوسف علیہ السلام اپنے آباواجداد کے حق دین کی اتباع کرتے اور اسی پر فیصلہ کرتے تھے، اس قانون پر ہرگز فیصلہ نہیں کرتے تھے جو اللہ جل شانہ نے نازل نہیں فرمایا اور نہ اللہ جل شانہ کے قانون کے خلاف دوسرے قوانین کے بنانے کی اجازت دیتے تھے۔

اور اگر کوئی یوسف علیہ السلام کے بارے میں اس کے خلاف عقیدہ رکھے تو وہ مسلمان باقی نہ رہے گا۔ آج کل کی شیطانی حکومتوں میں اگر کوئی وزیر انفرادی طور پر اسلام کے مفاد میں کوئی ادنی سا کام بھی کرلے تو اسے فوراً ہٹا دیا جاتا ہے یا جمہوریت کے آئین کی مخالفت یا حکومت کے ساتھ غداری

کے جرم میں قید کر دیا جاتا ہے اور اگر انتخابات کے راستے ساری حکومت اور وزارتیں بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ جائیں تو پھر بھی انھیں حکومت کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا جیسے اسلامی دنیا کے بعض ممالک۔ میں دیکھا گیا ہے لہٰذا اس بنیاد پر یوسف علیہ السلام کے فعل کو دلیل بنانا ایک بہانے کے سوا کچھ نہیں۔

دوسری دلیل: نجاشی کے عمل سے استدلال

بعض وہ مسلمان جن کے دلوں میں جمہوریت نے گھر کر لیا ہے جمہوری نظام میں شامل ہونے کے جواز پر نجاشی رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باوجودیکہ نجاشی ایک مسلمان بادشاہ تھے لیکن انہوں نے اسلامی حکومت نافذ نہیں کی تھی اور پھر بھی حضور ﷺ نے ان کی تعریف کی ہے اور ان کو عبد صالح کہا اور ان کی غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا کی لہٰذا آج کے دور میں بھی اگر کوئی بادشاہ اسلامی نظام نافذ نہ کرے یا دوسرے مسلمان ایک غیر اسلامی نظام میں حصہ لیں تو اس میں بھی کوئی ناجائز بات نہیں ہے۔

دلیل کا جواب:

نجاشی رضی اللہ عنہ کون تھے؟

نجاشی حبشہ کے وہ بادشاہ تھے جنہوں نے نبوت کے پانچویں سال ان مہاجرین کو پناہ دی جن کو حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ سے بھیجا تھا۔ نجاشی نے انہی مہاجرین کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا تھا اور عیسائیت کو چھوڑ دیا تھا اور مہاجرین ان کی مملکت میں باعزت طریقے سے رہ رہے تھے جب قریش نے مہاجرین کو واپس لانے کے لئے دو آدمیوں کا وفد بہت سارے تحفے تحائف دے کر بھیجا تو ان کے مباحثے اور تحقیق کے بعد نجاشی کو سمجھ میں آیا کہ قریش ظالم ہیں لہٰذا مہاجرین کو کسی بھی حال میں واپس نہیں کرنا چاہئے، یہی وجہ تھی کہ قریش کے وفد کو نامراد واپس کیا اور بعد میں حضور ﷺ کو اطلاع بھیجی گئی کہ نجاشی نے حضرت جعفر کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا ہے اور حضور ﷺ کے ہاتھ پر ان کے واسطے سے

بیعت کر لی ہے اور پھر ایک مرحلے پر اپنے بیٹے کو ایک بڑے وفد کے ساتھ آپ ﷺ کی تائید اور نصرت کے لئے بھیجا اور یہ بھی دریافت کروایا کہ اگر حضور ﷺ چاہیں تو وہ (نجاشی) مدینہ منورہ ہجرت کر لیں گے، رسول اللہ ﷺ نے انہیں دعا دی اور جب نجاشی فوت ہو گئے تو مدینہ منورہ میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ آج بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ وہ مسلمان تھے لیکن اسلامی شریعت نافذ نہیں کی تھی اس لئے اگر یہ موجودہ لوگ بھی قدرت اور استطاعت کے باوجود شریعت نافذ نہ کریں تو کوئی بات نہیں۔ یہ استدلال کئی وجوہات کی بناء پر باطل ہے:

☆ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کا اسلامی شریعت کو نافذ نہ کرنا کسی قابل اعتبار دلیل سے ثابت نہیں، نجاشی کا غائبانہ ایمان لانا، اور مسلمانوں کی حفاظت کرنا، اپنے پادریوں یعنی مسیحی علماء کی مخالفت کرنا اور رسول ﷺ کے پاس ساٹھ آدمیوں کی معیت میں اپنے بیٹے کو تائید اور نصرت کے لئے بھیجنا اس بات پر واضح دلیل ہے کہ انہوں نے اسلام کی حالت میں طاغوت کے حکم اور نظام کے مطابق فیصلہ نہیں کیا، دوسری وجہ یہ ہے کہ نجاشی رضی اللہ عنہ کی حالت سے استدلال کرنا ایک قیاس ہے اور قیاس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جس چیز کو دوسرے پر قیاس کیا جا رہا ہو، ان دونوں میں ایک علتِ مشترکہ ہو اور دونوں کے درمیان فرق بھی موجود نہ ہو نیز جس حادثے کو دوسرے پر قیاس کیا جا رہا ہو اس میں نص بھی موجود نہ ہو، یہاں نجاشی کے عمل کو اصل بنایا گیا ہے اور آج کل کی جمہوری حکومت میں شرکت کرنے کو فرع بنایا گیا ہے لیکن یہ قیاس اس لئے درست نہیں ہے کیونکہ یہاں فرع کے حق میں صریح نصوص موجود ہیں اور وہ یہ کہ جو شخص شریعت کو حَکَم نہ بنائے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا جیسے کہ اللہ جل شانہ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (نساء: ٦٥)

ترجمہ: ''نہیں (اے پیغمبر) تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصل نہ بنائیں اور پھر تم جو کچھ فیصلہ کرو اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اس کے آگے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔''

اسی طرح اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيداً﴾ (نساء: ٦٠)

ترجمہ: ''(اے پیغمبر) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئیں ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے بھی نازل کیا گیا تھا (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر پرلے درجے کی گمراہی میں لے جائے۔''

کیا یہ جائز ہے کہ شرعی نصوص کی موجودگی میں قیاس پر عمل کیا جائے حالانکہ ضابطہ یہ ہے کہ نص کے ہوتے ہوئے قیاس صحیح نہیں ہوتا، تیسری وجہ یہ ہے کہ نجاشی رضی اللہ عنہ کے وقت میں شریعت مکمل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی انہیں ہر روز ہر ہفتے اور مہینے احکام پہنچتے تھے کیونکہ ذرائع ابلاغ اتنے ترقی یافتہ نہ تھے وہ اتنے ہی کے مکلف تھے جتنے احکام انہیں پہنچے تھے لیکن آج جب کہ شریعت اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ موجود ہے اور تمام لوگوں کے گوش گذار بھی ہو چکی ہے تو پھر جمہوریت کے عاشق کیسے آج کی موجودہ شریعت چھوڑتے ہیں اور اس وقت کے ایک عمل سے استدلال کرتے ہیں جس وقت شریعت مکمل نہ تھی۔

تیسری دلیل: جمہوریت کو شوریٰ کا نام دینا

مغرب کے مسلط کردہ سیکولر عناصر جو اسلامی دنیا میں جمہوریت پھیلانے اور نافذ کرنے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف ہیں چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اندھیرے میں رکھنے کے لئے بے دین جمہوریت کو اسلامی شوریٰ کا نام دے دیں اور یہ منگھڑت پرچار کرتے پھریں کہ جمہوریت شوریٰ کی ایک جدید شکل ہے اور اس سے اسلامی شوریٰ کا نظام عمل میں آتا ہے۔

امریکا اور دیگر صلیبی اتحادیوں نے جب افغانستان کو بے دریغ اور شدید بمباری اور جاسوسوں کے بل بوتے پر اپنے قبضے میں لیا اور سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں کو شہید کرنے کے بعد چاہا کہ یہاں ایک غلام اور بے اختیار حکومت بنائیں اور پھر اس کے ذریعے اپنی فوجی مداخلت کے لئے جواز پیدا کریں تو انھوں نے یہاں بھی جمہوریت کا نعرہ لگایا اور چند زرخرید غلاموں کے ذریعے لویہ جرگہ (بڑی شوریٰ) کے نام سے ان کو کھڑا کیا اور بزعم خود ان کو ”وامرھم شوری بینھم“ کا مصداق قرار دیا، لیکن یہ لوگ یاد رکھیں کہ نام نہاد جرگہ کو شوریٰ کا نام دینے سے وہ اسلامی شوریٰ نہیں بن جاتی جیسے کہ شراب ”روحی مشروب“ کے نام سے اور زنا ”جنسی تقاضے“ کے نام سے جائز نہیں ہو جاتا، اسلام کی شوریٰ اور جمہوریت کی پارلیمان کے درمیان حق و باطل کا فرق ہے جن میں سے ہم بعض کو درج ذیل ترتیب سے بیان کرتے ہیں:

پارلیمان کی ووٹنگ اور اسلام کی شوری میں فرق

پہلا فرق: اسلامی شوریٰ مومنوں، موحدوں اور شریعت کے ماننے والے سمجھ دار مسلمانوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جبکہ پارلیمان کی ووٹنگ ایسی ایک مجلس کے ارکان کے درمیان ہوتی ہے جن میں مسلم، ہندو، عیسائی، یہودی، کمیونسٹ اور ملحد سب کے سب ایک جیسے ووٹ کا حق رکھتے ہیں اور اس میں فیصلہ جائز و ناجائز اور دلیل کی قوت وضعف کے معیار پر نہیں بلکہ اکثریت پر ہوتا ہے قرآن نے جہاں

شوریٰ کا ذکر کیا ہے تو اس کو ان مومنین کے لئے بطور وصف بیان کیا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں ، اس کی ذات پر توکل کرتے ہیں، بڑے گناہوں اور خاص طور پر بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں کسی پر غصہ آئے تو در گذر کرتے ہیں، اور اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہیں، نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں اور ان کے باہمی امور مشورہ سے طے پاتے ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں اور جب ان پر کوئی ظلم وزیادتی ہو جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔

قرآن کریم فرمارہا ہے" (امرھم شوری بینھم) " لیکن جمہوریت اور پارلیمان کی ووٹنگ یہ کہتی ہے کہ" امرھم شوری بینھم وبین غیرھم "یعنی اسلام میں مشورہ صرف مومنین کے درمیان ہوتا ہے لیکن جمہوریت میں مشورہ مومنوں اور کافروں سب کے درمیان ہوتا ہے لہٰذا اسلامی شوریٰ اور جمہوریت کی ووٹنگ کو ایک چیز سمجھنا درحقیقت حق و باطل کو آپس میں ملانا ہے۔

دوسرا فرق: اسلامی شوری حکم الٰہی اور اللہ کا دیا ہوا راستہ ہے جو وحی کے ذریعے نازل ہوا اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو عملی جامہ پہنایا لیکن جمہوریت انسانی خواہشات اور اس کی بنیاد پر کفار کی طرف سے بنایا ہوا ایک بے دین نظریہ ہے۔

تیسرا فرق: اسلامی مشورہ ان امور میں ہوتا ہے جہاں نص موجود نہ ہو اور جب نص موجود ہو تو شوری کی ضرورت ہی نہیں رہتی جبکہ جمہوری قانون میں احکام الٰہیہ اور شریعت کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں اس لئے جمہوریت میں حاکم اور حاکمیت یعنی تشریع کا حق مطلق طور پر عوام کے اختیار میں ہوتا ہے جن کی اکثریت اس کو لاگو کرتی ہے۔

چوتھا فرق: جمہوریت میں اکثریت الٰہ کا مرتبہ رکھتی ہے لہٰذا ان کی مرضی ہے کہ جو چاہیں قوانین بنائیں اور قوانین بنانے میں کوئی بھی خارجی طاقت (وحی) اس میں مداخلت کا حق نہیں رکھتی لیکن اسلامی شوریٰ میں اکثریت نہ صرف یہ کہ شریعت ساز اور واجب الاطاعت نہیں ہوتی بلکہ شوریٰ کے ممبر اپنے اوپر شارع (اللہ تعالیٰ) کی اطاعت کو لازم کرتے ہیں جو ہر مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اور جائز

امور میں اولوالامر (حکّام) کی بات مانتے ہیں، شوریٰ میں امام (حاکم) ہر مسئلہ میں اکثریت کے حکم کے ماننے کا مکلف نہیں ہوتا بلکہ اکثریت امام کی اطاعت کی مکلف ہوتی ہے مگر جب تک امام نیکی کا حکم کرے۔

پانچواں فرق: جمہوریت میں حق کا معیار لوگوں کی خواہشات اور اکثریت کی رائے ہوتی ہے لیکن اسلامی شوریٰ میں حق کا معیار اکثریت نہیں ہوتی بلکہ اکثریت کی جگہ دلیل کی قوت کا اعتبار کیا جاتا ہے اگرچہ وہ دلیل ایک ہی شخص کی طرف سے پیش ہو جائے۔

چھٹا فرق: جمہوریت یورپ کے الحاد زدہ معاشرے میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے جہاں دین نظامہائے زندگی کے تمام پہلوؤں میں بے بس واقع ہوا ہے اور صرف کلیسا کے ایک کونے میں بند ہے لیکن شوریٰ اسلامی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے جو ان تمام شعبوں کو محیط ہے جہاں صریح نصوص (قرآن و حدیث سے دلیل) موجود نہ ہوں تو مسلمانوں سے مطالبہ ہوتا ہے کہ آپس میں اہم امور میں مشورہ کیا کریں لہٰذا مندرجہ بالا وجوہات کی بناء پر شوریٰ اور جمہوریت دو الگ الگ چیزیں ہیں، پہلے کا سرچشمہ اسلام اور دوسرے کا الحاد ہے، جو لوگ چاہتے ہیں کہ جمہوریت کو لوگوں کی نظروں میں شوریٰ کے مثل قرار دے دیں تو وہ یا تو اسلام کے شورائی نظام کو نہیں جانتے یا پھر جانتے تو ہیں لیکن منافقت کی وجہ سے جمہوریت کے کفریہ نظام کو عام مسلمانوں کے سامنے اسلامی شوری کے قالب (سانچہ) میں ڈھالنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان اس کی مخالفت نہ کریں اور اس کو مان کر اس میں شامل ہو جائیں۔

چوتھی دلیل: دعوت کی مصلحت کے لئے جمہوریت میں شرکت

بعض اسلامی جماعتیں یا اشخاص دعوت کی مصلحت کے بہانے سے جمہوریت میں حصہ لیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر وہ لوگ انتخاب کے لئے کھڑے نہیں ہونگے تو کوئی اور اسلام دشمن جماعت یا شخص اقتدار میں آ جائے گا اور یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ ہم کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین

نافذ کرنے کے لئے پارلیمان کے ذریعہ راہ ہموار کریں، کبھی یہ کہتے ہیں کہ جمہوری نظام اور حکومتوں میں اس شخص کے دعوتی کام کے لئے عام اجازت موجود ہوتی ہے جو جمہوریت کو مانتا ہو اور جمہوری نظام کی چار دیواری میں رہتا ہو اور جو جمہوری نظام کی چار دیواری سے باہر ہو وہ طرح طرح کی پابندیوں کا سامنا کرتا ہے تو اس غرض سے کہ عام لوگوں کو دعوت دے سکیں اور معاشرے کے تمام طبقات تک اپنی آواز پہنچا سکیں، دعوت کی مصلحت یہ تقاضا کرتی ہے کہ جمہوریت کی عمارت کے اندر کام کیا جائے اور جمہوریت میں بیان کی آزادی سے استفادہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا وہمی دلائل اور بہانوں کے بارے میں ذیل میں چند جوابات ذکر کئے جاتے ہیں۔

پہلا جواب:

ایسے ایک نظام میں جو اپنی بنیاد کے اعتبار سے کفر پر قائم ہو جیسے کہ جمہوریت جو سیکولرزم (لادینیت) کے کفر پر قائم ہے اور جو دین کو زندگی اور حکومت کے کاموں میں مداخلت کا حق نہیں دیتا اور جس میں حلال وحرام کا تعین انسانوں کی اکثریت کی تائید کے ذریعہ ہوتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے شریعت سازی کا حق لیکر بشر کو دے دیا گیا ہو اور جس میں کفر و اسلام کے درمیان کوئی فرق موجود نہ ہو اور سب کو صرف انسان کی نظر سے دیکھا جاتا ہو، اور مسلمان اور کافر یکساں اہمیت کے حامل ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو آپس میں ٹکراؤ کی وجہ سے ممنوع قرار دیا جاتا ہو، ارتداد (دین سے پھر جانا) انسان کا اپنا حق ہو، اور وہ اس پر ہر طرح کی سزا سے محفوظ کر دیا گیا ہو، اسلام کے خلاف آواز اٹھانے کو اظہار رائے کی آزادی کی بنا پر جائز اور قانونی کام قرار دیا گیا ہو، تو اس طرح کے کفری نظام میں شرکت کرنا کیا اس کی تائید اور ماننا ہی نہیں ہوگا؟ کیا اس طرح کے کفری نظام کے دائرہ کار میں کام کرنا اور اس کو ماننا اس توحید کے منافی نہیں ہے جو سب سے پہلے طاغوت کو سب سے بڑا کفر تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے؟ وہ توحید 'جو لا الٰہ' کے ذریعے 'الا اللہ' سے پہلے ہر طرح کے طاغوت سے براءت کا اعلان چاہتی ہے؟ اسلام میں اس شخص کا اسلام ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتا جو توحید کو تو مانتا ہو لیکن شرک کے خلاف اس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] فرمایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿وقد نزل علیکم فی الکتاب أن إذا سمعتم آیاتِ اللّٰہِ یُکفرُ بِہا ویُستَہزأُ بِہا فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ إنکم إذاً مثلُہم إنّ اللّٰہ جامعُ المُنافِقِینَ والکافرین فی جہنم جمیعا﴾ (النساء: ۱۴۰)

ترجمہ: ''اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا

جارہا ہے اوران کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہوجائیں ورنہ تم لوگ بھی انہیں جیسے ہوجاؤ گے۔ یقین رکھو کہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔"

موجودہ پارلیمانوں میں برملا دیکھا جاتا ہے کہ سیکولر (بے دین) عناصر، کمیونسٹ، خواہشات کے بندے، اور گمراہ پارٹیاں بڑے دھڑلے کے ساتھ ارتداد کا دفاع کرتی ہیں، کفریہ قوانین کی طرفداری کرتی اور اسلامی احکام جیسے جہاد، حدود، حجاب وغیرہ کا مذاق اڑاتی ہیں اور طرح طرح کے برے القابات سے انہیں یاد کرتی ہیں لیکن پھر بھی نام کے جمہوریت پسند اور پارلیمانی مسلمان دعوت کی مصلحت کے بہانے مرتدوں کے ساتھ ایک جگہ ایک ہی پارلیمان میں کام کرتے رہتے ہیں۔

دوسرا جواب:

اسلامی دنیا کی اکثر پارلیمانوں میں وہ پارٹیاں جو اپنے آپ کو مسلمانوں کی سفیر کہتی ہیں اقلیت میں ہیں جو کہ سیکولر پارٹیوں کی اکثریت کے مقابلے میں اپنی اقلیت کی وجہ سے غیر اسلامی قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتیں اس لئے کہ جمہوریت میں اکثریت کی رائے قبول کی جاتی ہے، اس وجہ سے گذشتہ اسی سالوں میں جمہوریت اسلامی دنیا کی جن جن حکومتوں میں آئی ہے، کہیں بھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ جمہوریت اور انتخابات کے ذریعے کسی اسلامی ملک میں اسلامی شریعت نافذ ہوئی ہو، لیکن پھر بھی فریب خوردہ جمہوریت پسند نام نہاد مسلمان اس سے کنارہ کش نہیں ہوتے، اور تبدیلی کے لئے اسلام کے بتائے ہوئے نبوی راستے کی طرف رجوع نہیں کرتے، جو کہ بذات خود ان کی نیت اور اخلاص پر شک کا باعث ہے۔

تیسرا جواب:

رسول اللہ ﷺ کو بھی مشرکین مکہ اسی طرح جمہوریت کے ہم شکل نظام کی پیشکش کرتے

رہے، ایک ایسا نظام جس میں شرک کے عقائد، نظریات، تصورات اور اعمال محفوظ ہوں اور ایک حد تک اس میں اسلام بھی نظر آتا ہو لیکن اس کا موجودہ جمہوریت کے ساتھ اتنا فرق تھا کہ انتخابات اور اکثریت سے ہٹ کر سرداری، مال، حکومت اور سیاسی قیادت بھی وہ آپ ﷺ کو دے رہے تھے جیسے کہ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ میں مذکور ہے کہ مشرکین مکہ کے سرداروں نے اپنی شوریٰ کا اجلاس بلایا اور ایک بات پر متفق ہو کر عتبہ بن ربیعہ کو جو بنو عبد شمس کے سرداروں میں سے تھا آپ ﷺ کی طرف بھیجا، چنانچہ عتبہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا:

”اے بھتیجے! آپ جانتے ہو کہ آپ ہم میں اچھے حسب ونسب کے مالک ہو لیکن آپ ایک ایسا دین لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے آپ نے ہمارے اتفاق واتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے، آپ اپنے اور ہمارے آباؤ اجداد کے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہو، اُن کو بے وقوف قرار دیتے ہو اور ان کے دین کو کفر اور ان کے آباء واجداد کو کافر کہتے ہو، میں آپ کے لئے ایک پیشکش لے کر آیا ہوں لہٰذا آپ ان کو قبول کرلو تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابولبید! بول میں سن رہا ہوں، عتبہ نے اپنی پیشکش کچھ اس طرح بیان کی: اے بھتیجے اگر آپ اپنی دعوت چھوڑنے کے بدلے مال چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کر کے دیں گے کہ آپ مالدار ہو جائیں گے اور اگر عزت چاہتے ہو تو ہم آپ کو اپنا سردار بنائیں گے کہ آپ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بھی بنالیں گے یا اگر کسی جن نے آپ کو آپکڑا ہو اور آپ اپنے آپکو اس سے نہیں چھڑا سکتے ہوں تو ہم آپ کو کسی کاہن کے پاس لے چلتے ہیں جو آپ پر دم کریگا اور اس کام میں ہمارا جتنا بھی مال صرف ہوگا ہم صرف کریں گے تاکہ آپ کو اس تکلیف سے چھٹکارا مل جائے۔

آپ ﷺ نے جب ان کی بات سنی تو فرمایا: اے ابولبید: آپ کی باتیں ختم ہوئیں؟ تو اس نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا اب مجھ سے سنو، پھر آپ ﷺ نے سورہ فصلت کی چند آیات ان کے سامنے تلاوت فرمائیں۔

ذرا سوچیں! نبی کریم ﷺ نے قریش کے ساتھ ایسے مشترک اور مخلوط نظام کی پیشکش کو مسترد کیا، جس کے سردار آپ ﷺ خود ہوتے۔ لہٰذا یہ بات واضح طور پر معلوم ہوگئی کہ آپ ﷺ نے مظلومیت و محرومیت کے وقت میں بھی جہاں آپ کو اور آپ کے صحابہ کو سخت اذیت اور تکلیف دی جاتی تھی مشرکین کا پیش کردہ نظام اور نظریہ قبول نہیں کیا حالانکہ اس پیشکش کو ماننے کی صورت میں مسلمانوں پر (جو کہ مظلوم تھے) کچھ آسانی آجاتی لیکن پھر بھی آپ ﷺ نے یہ اس لئے نہیں کیا تاکہ مسلمانوں کو یہ تعلیم مل جائے کہ مومن اور کافر ایسے ایک نظام میں ساتھ نہیں نباہ سکتے کہ جس میں اسلام کو کفر کے تابع ہونا پڑتا ہو۔

قریش آج کے کفار کی طرح جھوٹ اور دھوکے کو پسند نہیں کرتے تھے وہ آپ ﷺ کے ساتھ اپنے وعدے میں سچے تھے وہ یقیناً آپ ﷺ کو سرداری، مال اور بادشاہی دے رہے تھے لیکن اس کے مقابلے میں وہ آپ ﷺ سے جاہلیت کے خلاف مقابلہ بند کروانا چاہتے تھے اور یہ وہی کام ہے جسے جمہوریت کے علم بردار کفار مسلمانوں سے چاہتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے پھر بھی ان کی ایسی پیشکش نہیں مانی، اب سوال یہ ہے کہ وہ جماعتیں جو اپنے آپ کو اسلامی کہتی ہیں اور جمہوریت میں اپنی شرکت سے اس کی تائید کرتی ہیں اور اپنے سیاہ چہرے اور گھناؤنے کردار پر پردہ ڈالتی ہیں کیا ان کو وہ حیثیت اور اقتدار کے مناصب دیئے جاتے ہیں جن کی قریش نے آپ کو پیشکش کی تھی؟ ہرگز نہیں۔

کیا واقعتاً اس طرح کی اپنے آپ کو بہلانے والی اسلامی پارٹیوں کو جمہوریت میں صحیح اسلام بیان کرنے اور کفر کی تمام صورتوں کے رد کرنے اور ان کے خلاف عملی اقدامات کرنے کی اجازت دی جاتی ہے؟ اگر دی جاتی ہے تو پچھلی ایک صدی میں یہ حق کس مسلمان ملک میں دیکھا گیا ہے؟ اگر نہیں دی جاتی تو پھر کیوں اس طرح کی باطل دلیل سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں اور اسلام کی طرف دعوت دینے کے نبوی منہج سے جس کی مثال صحابہ کی زندگی اور ان کی دعوت ہے، پہلوتہی کرتے ہیں۔ اگر اس طرح سے جمہوریت میں شرکت کرنے میں مصلحت ہوتی تو آپ ﷺ اس وقت ہی قریش کی پیشکش

قبول فرما لیتے جبکہ مسلمانوں کے لئے سوائے برداشت اور صبر کے کوئی اور راستہ نہیں تھا اس وقت آپ ﷺ نے اپنے مظلوم صحابہ کو حبشہ ہجرت کرنے کا حکم فرمایا لیکن کفار کے ساتھ ایک مشترک نظام میں رہنا پسند نہ فرمایا تاکہ مسلمانوں کو یہ تعلیم مل جائے کہ اسلام جاہلیت کی ہر قید و بند سے آزاد میدان اور نظام چاہتا ہے اور مسلمان اس وقت تک آرام سے نہیں رہ سکتے کہ جب تک اپنے لئے آزاد خالص اسلامی نظام نہ بنالیں۔

چوتھا جواب:

اسلامی دنیا کے ماضی قریب کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جمہوریت اور انتخابات صرف کفریہ نظام کو مضبوط کرنے اور اس کے فروغ کے لیے ہی کارآمد ہیں۔ جمہوری اسلام میں عملی اسلام کے نفاذ کی کوئی گنجائش نہیں اگرچہ مسلمان جمہوریت کے راستے سے اقتدار حاصل بھی کرلیں۔ مصر میں گذشتہ اَسّی سال کے طویل عرصہ سے 'الاخوان المسلمون' اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے غیر معمولی سرگرمیوں میں مصروف ہیں لیکن جب بھی مصری حکومت کو 'الاخوان' کی طرف سے کسی دینی تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں تو وہ فوری طور پر ان کے لئے کوئی مصیبت کھڑی کردیتی ہے، یا تو ان کے قائدین کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے یا ان کے مالی اثاثے ضبط کر لیئے جاتے ہیں اور ان کے قائدین کو سیاست اور کام کے میدان میں غیر مؤثر کردیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مصر میں گذشتہ اَسّی سالوں میں اسلامی حکومت نہ بن سکی اور نہ ہی کوئی اسلامی معاشرہ سامنے آیا اور 'الاخوان' بھی اپنے ان اصولوں، بنیادوں پر ثابت قدم نہ رہ سکے جنھیں امام البناء اور سید قطب شہید رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی تقاریر اور تالیفات میں 'الاخوان المسلمون' کے نظریاتی و علمی راستے کی حیثیت سے واضح کیا تھا، بلکہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ جمہوریت نے ان کے عزم کو سست اور دستور کو بدل کر رکھ دیا۔

ترکی میں ''نجم الدین اربکان'' کی اسلام پرست تنظیم نے انتخابات میں جمہوریت کے اصولوں کے مطابق اکثریت حاصل کر کے حکومت تو بنالی لیکن جب ترکی کی سیکولر اور جمہوریت کا دفاع

کرنے والی فوج نے اسلام کے مفاد میں ہونے والی کچھ تبدیلیاں دیکھیں تو فوراً ان کی حکومت گرادی، ''اربکان'' تنظیم پر پابندیاں لگا دی گئیں اور تنظیم کے قائدین کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کردیا گیا۔ اسی طرح شمالی افریقہ کے سب سے بڑے ملک ''الجزائر'' میں جب ''جبهة الانقاذ الاسلامية'' پارٹی نے مغربی جمہوریت کے اصولوں کے مطابق انتخابات میں اکثریت حاصل کرلی تو وہاں بھی سیکولر فوج نے مداخلت کر کے انتخابات کے نتائج کو لغو قرار دیا، اور اسلامی پارٹی کے قائدین و کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیا، اور الجزائر کے مسلمانوں کو ایک ایسے داخلی جھگڑے میں پھنسا دیا جسکے شعلے آج تک بھڑک رہے ہیں اور ہزاروں مسلمان اس آگ میں جل چکے ہیں اور ابھی تک جل رہے ہیں۔

پاکستان میں بھی جب بعض اسلامی جماعتوں نے دوسروں کی قربانیوں کے نتیجے میں ۲۰۰۲ء میں صوبہ خیبر پختونخوا میں انتخابات جیت کر اپنی حکومت بنائی تو وہ اپنے پورے دور حکومت میں ایک بھی اسلامی قانون نافذ نہ کرسکیں اور نہ ہی اسلام کے فائدے کے لئے کوئی ایسے اقدامات کرسکیں کہ جو تاریخ اپنے پاس نمونے کے طور پر محفوظ رکھتی، بلکہ وہ بڑی مشکلوں سے صرف انہی کاموں کو آگے بڑھا سکے جنہیں سیکولر حکومتیں بڑی آسانی سے چلاتی رہتی ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جمہوری حکومت کو مرکزی حکومت کی طرف سے یہ اجازت نہیں ملتی تھی کہ وہ اسلام نافذ کرسکے اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے بھی جمہوریت کے ساتھ وفاداری کی قسم اٹھا رکھی تھی۔ اسی طرح پوری دنیا میں اسلامی شریعت کو عملاً نفاذ سے دور رکھا جاتا ہے، اور اس کے ماننے والوں کو حکومت سے محروم کردیا جاتا ہے اگرچہ وہ جمہوریت کے راستے سے ہی اقتدار تک پہنچے ہوں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جمہوریت میں صحیح اسلام کے لئے کوئی جگہ نہیں، البتہ یہ ممکن ہے کہ جمہوریت کے راستے کفر کو اسلام کی شکل میں متعارف کرا کے اسلام میں تحریف کا ارتکاب کیا جائے۔

جمہوریت سے متعلق اس مقالے کے آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

☆ جمہوریت ایک غیر اسلامی کفری شیطانی دین ہے، جس نے انسانی زندگی کے تمام اطراف کو گھیرا ہوا ہے، اور یہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے انسانیت کے لئے ہر طرح کے نظام اور قانون بنانے کے حق کو چھیننا اور اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) قانون سازی کے باب میں غیر مؤثر کرنا ہے۔ مغرب میں جمہوریت مسیحیت سے انحراف اور الحاد کی وجہ سے وجود میں آئی ہے، جس میں سب کچھ ہر دینی قید و بند سے آزاد ہوتا ہے اور انسان کی اپنی پسند سے پورا ہوتا ہے۔

☆ جمہوریت میں اللہ تعالیٰ کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔

☆ جمہوریت مغرب کے مُلحد فلاسفہ کے افکار و نظریات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی اسلام کے ساتھ کوئی مشابہت اور رابطہ نہیں، لیکن مغرب زدہ سیکولر عناصر سے متاثر بہکے ہوئے نام نہاد مسلمانوں کی یہ کوشش ہے کہ تمام مسلمانوں کو دھوکہ دے کر اسلام اور جمہوریت میں روابط اور مشترکہ مفاہیم تراش ڈالیں تاکہ مسلمانوں کو جمہوریت کے کفریہ دین کے خلاف میدان میں اترنے اور جہاد کرنے سے روک سکیں۔

☆ جمہوریت اسلامی دنیا پر مغربی استعمار اور تسلّط کو ہمیشہ قائم و دائم رکھنے کا ایک خطرناک منصوبہ ہے جسے مغرب طاقت، قید و بند، موت کی دھمکیوں اور اپنی حکومتوں کے ذریعے محفوظ اور سدا بہار رکھتا ہے، اور اس کو پھیلانے اور نافذ کرنے کے لئے ہزاروں ملین ڈالر لاکھوں فوجیوں اور فوجی وسائل پر صرف کرتا ہے، اور اس کے ذریعے جمہوریت کے خلاف مزاحمت کو ختم کرنے کے لئے لاکھوں مسلمانوں کا اسلامی ممالک میں قتل عام کرتا ہے، اور اسلامی جماعتوں اور پارٹیوں کو صرف اس ڈر سے نیست و نابود کر دیتا ہے کہ شاید وہ مظلوم اور متاثر مسلمانوں کو جمہوریت کی تلخ حقیقت سے آشنا نہ کر دیں۔

اب جبکہ افغانستان مغرب کے قبضے میں آگیا ہے تو وہ وہاں ہلاکت خیز جنگ کو اس لئے جاری رکھے ہوئے ہے تاکہ اس میں جمہوریت نافذ کر سکے، لہٰذا افغان مسلمانوں کے لئے ضروری ہے

کہ اپنے اس دشمن کی فکری، اعتقادی اور اخلاقی حقیقت سے واقف ہو جائیں، اور دشمن کی اصلیت کو ہر زاویے سے پہچان لیں۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے اس موضوع کو تفصیل سے اپنی مجاہد قوم کے نوجوانوں کے لئے کئی کتابوں اور ہزاروں صفحات کے مطالعے کے بعد نکالا ہے اور اپنی سیدھی سادھی زبان میں اپنے ان نوجوانانِ اسلام کے سامنے پیش کیا ہے جو اسلام کے دفاع کے لیے ہر طریقہ اپنانے کے لئے تیار ہیں اور عملاً جمہوریت کے کفر کے خلاف جہاد میں مصروف عمل ہیں۔

آخر میں گذارش ہے کہ اگر اس موضوع میں میں نے حق بات لکھی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے، اور اگر کسی جگہ مجھ سے کوئی غلطی صادر ہوئی ہو تو وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہے جسکی تصحیح کے لئے میں مخلص علماء کی توجہ کا طلب گار ہوں۔

امریکی اسلام

الله
بسم الله الرحمن الرحيم

امریکی اسلام

آجکل دنیا میں دو طرح کا اسلام وجود رکھتا ہے، ایک وہ اسلام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر نازل فرمایا، اور انھوں نے اپنی اُمت تک مکمل طور پر پہنچایا، اور اسلامی امت کی تاریخ میں مسلمانوں نے اسے دل و جان سے مانا، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اسے لاگو کیا اور اس کے دفاع کے راستے میں بھی کروڑوں مسلمانوں نے قربانیاں دیں۔

اسلام کے علماء نے ہمیشہ اس اسلام کے بارے میں دشمنوں کے شکوک وشبہات کے علمی اور عقلی جوابات دیے، اور اسی دین کے حصول اور احکام کی شرح کے لئے لاکھوں کتابیں لکھیں، جو دنیا کی مختلف زبانوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں یہ وہ اسلام ہے جس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کوئی اور دین قبول ہی نہیں کرتے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹)

ترجمہ: ''بے شک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''

نیز ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلَامِ دِيناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الخَاسِرِيْنَ﴾

(آل عمران: ۸۵)

ترجمہ: ''جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

یہ اسلام وہ دین ہے جس کی دشمنی سے کفار کسی بھی وقت اور کسی صورت میں بھی دست بردار نہیں ہوتے اور ہر صورت اور ہر طریقہ سے اس کے خلاف ہمیشہ جنگ میں مصروف عمل رہتے ہیں اور اس وقت تک اس جنگ کو جاری رکھتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کو اسلام سے مکمل طور پر نہ پھیر

دیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلاَ یَزَالُونَ یُقَاتِلُونَکُمْ حَتَّیَ یَرُدُّوکُمْ عَن دِینِکُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا﴾(البقرہ : ۲۱۷)

ترجمہ: ''اور یہ (کافر) تم لوگوں سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ تم کو تمہارا دین چھوڑنے پر آمادہ کردیں۔''

یعنی جب تک مسلمان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اسلام پر سختی سے کاربند رہیں گے اس وقت تک کفار کی جنگ بھی ان کے خلاف کسی نہ کسی شکل میں جاری رہے گی۔ اور مسلمان صرف اس وقت ان کے دوست بن سکتے ہیں کہ جب اسلام سے پھر جائیں، اللہ تعالیٰ نے اسی مفہوم کو ایک دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَن تَرْضَی عَنکَ الْیَهُودُ وَلاَ النَّصَارَی حَتَّی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَی اللّهِ هُوَ الْهُدَی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ مِنَ اللّهِ مِن وَلِیٍّ وَلاَ نَصِیرٍ﴾. (سورۃ بقرۃ : ۱۲۰)

ترجمہ: ''اور یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہونگے جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہیں کرو گے، کہہ دو کہ حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے اور تمہارے پاس (وحی کے ذریعے) جو علم آ گیا ہے اگر کہیں تم نے اس کے بعد بھی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہیں اللہ سے بچانے کے لیے نہ کوئی حمایتی ملے گا اور نہ کوئی مددگار۔''

سورہ بقرہ کی مذکورہ آیات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ''الٰہی اسلام'' کبھی بھی یہودیوں، نصرانیوں اور دوسرے کافروں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہے اسی وجہ سے وہ پوری دنیا میں اپنے مادی اور معنوی وسائل کو بروئے کار لا رہے ہیں تا کہ ''الٰہی اسلام'' دنیا کے کسی خطے میں بھی نافذ نہ ہو سکے اور اگر کہیں نافذ بھی ہو گیا ہو تو کسی طریقے سے اسے نیست و نابود کر دیا جائے۔

لیکن الٰہی اسلام کے مقابلے میں ایک دوسری قسم کا اسلام بھی ہے جسے مغرب اور خصوصاً امریکہ بیان کرتا اور پھیلاتا ہے، اس کے نفاذ کے لئے کام کرتا اور تمام مادی ومعنوی وسائل کو بروئے کارلاتا ہے تاکہ اسلامی دنیا میں اُس ”امریکی اسلام“ کو ”الٰہی اسلام“ کی جگہ مسلمانوں کی زندگیوں میں جاری کرسکے، اسی امریکی اسلام کے تعارف کے لئے امریکہ کا سب سے اہم تحقیقاتی ادارہ (Rand Corporation) رینڈ کارپوریشن ہے جو کہ امریکی سرکار کے لئے اسلامی دنیا کے سیاسی، اجتماعی اور دفاعی امور کا لائحہ عمل (پالیسی) بناتا ہے، اور اس کے محققین اس میں مسلسل تحقیق کرتے رہتے ہیں جس کے نتائج امریکی سرکار مختلف محکموں میں نفاذ کے لئے بھیجتی رہتی ہے۔ ایک ایسی ہی پالیسی اس ادارے کی ایک جماعت جس کا سربراہ ”شیریل برنارڈ“ تھا، نے پیش کی۔ ”شیریل برنارڈ“ خود یہودی ہے اور اس کے ساتھ افغان نژاد امریکی ”زلمے خلیل زاد“ کی بیوی ہے جو اس پالیسی کی موجد ہے، اسی نے اس پالیسی کو Civil Democratic Islam Partners Resources and Strategies یعنی ”متمدن جمہوری اسلام دوست اصول“ کے نام سے تقریباً ۸۳ صفحات پر ترتیب دیا جس میں ”خلیل“ کے ساتھ نو اور مستشرق ماہرین کی مدد بھی شامل تھی۔

مذکورہ پالیسی میں ایک نئے امریکی اسلام کا تعارف کرایا گیا ہے، اور پھر اس نئے اسلام کو پھیلانے کے لئے اسلامی دنیا میں اپنے معاون اور مددگار ساتھیوں کا چناؤ کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جن سے اس نئے اسلام کے نفاذ کے لیے مدد حاصل کی جاسکتی ہے اور اسی طرح الٰہی اسلام کو ختم کرنے یا محدود کرنے یا مسخ کرنے کے لئے منصوبہ پیش کیا گیا ہے۔

امریکی اسلام کی تعریف

وہ اسلام جسے رینڈ کارپوریشن چاہتا ہے ”شیریل برنارڈ“ اس کا تعارف کچھ اس طرح سے کرتا ہے:

”امریکہ نئی صنعتی دنیا، اور مجموعی طور پر بین الاقوامی معاشرے میں ایک ایسا اسلام چاہتا ہے جو باقی دنیا کے

نظام کے ساتھ ایک راستے پر گامزن جمہوری اور نیا اسلام ہو، اور دنیاوی قوانین، احکام، اور اخلاق کے ساتھ چل سکے۔"

پھر صفحہ نمبر ۸ پر مذکورہ بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مناسب ہے کہ اسلام امریکہ اور بین الاقوامی معاشرے کی پسند کا ہو جو اپنا الگ تشخص اور متعین نظام نہ رکھتا ہو بلکہ باقی دنیا کے نظاموں کے ساتھ یکسانیت اور جوڑ رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ اسلام جمہوری ہو یعنی لوگوں کی طرف سے آیا ہو نہ یہ کہ وحی کی بنیاد پر قائم ہو اور جس نے اپنی پرانی شکل چھوڑ کر نئی ترقی یافتہ شکل اختیار کر لی ہو اور احکام اور اخلاقی فلسفے میں مغرب کے احکام اور اخلاق کے ساتھ یکسانیت رکھتا ہو۔"

پھر بعد میں اسی آٹھویں صفحہ پر مذکورہ اسلام کے ماننے والوں کی مدد اور ان کی تشویق کے لئے لکھتا ہے:

"یہ حکمت کا کام ہوگا کہ مسلمانوں میں ان عناصر کی مدد اور دلجوئی کی جائے جو دنیاوی صلح اور بین الاقوامی معاشرے کے ساتھ ایک ہی راستے پر چلنا پسند کرتے ہوں اور جمہوری تمدن اپنانے کے لیے راضی ہوں۔"

اس تفصیل سے درج ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

☆ تمام مسلمانوں کی مدد نہ کی جائے بلکہ خاص عناصر کی مدد کی جائے یعنی صرف ان عناصر کی مدد کی جائے جو کافروں کے ساتھ کسی قسم کا تصادم نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کے ساتھ مصالحت کی زندگی گزارنا پسند کرتے ہوں، جہاد پر یقین نہ رکھتے ہوں چاہے کافر مسلمانوں کے ساتھ دنیا بھر میں کچھ بھی کرتے رہیں۔

☆ ان مسلمانوں کی مدد کی جائے جو جمہوریت کو اپنی زندگی کے طریقۂ کار کے طور پر مانتے ہوں اور مغرب کی تہذیب وتمدن سے مرعوب ہوں۔

لکھنے والی مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فرق اور مغربی معاشرے سے (جسے وہ بین

الاقوامی معاشرہ کہتے ہیں) مسلمانوں کی دوری کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''موجودہ بین الاقوامی معاشرے سے مسلمانوں کا دور ہونا، ان کا غیر مسلموں کے ساتھ تناؤ اور دشمنی کے راستے کو ہموار کرتا ہے'' (ص ۸)

مندرجہ بالا عبارت کا معنیٰ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیروں کے درمیان اسوقت تک تناؤ برقرار رہے گا، جب تک مسلمان اپنا اسلامی معاشرہ نہ چھوڑ دیں اور بین الاقوامی معاشرے کو نہ اپنالیں، یعنی جب معاشرے، کا یہ فرق درمیان سے ہٹ جائیگا تو تناؤ خود بخود ختم ہو جائیگا۔ یہ بالکل وہی بات ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یاد دہانی کرائی ہے:

﴿وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّهِ هُوَ الْهُدَى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّهِ مِن وَلِيٍّ وَلاَ نَصِيرٍ﴾ (سورہ بقرہ: ۱۲۰)

ترجمہ: ''اور یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہونگے جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہیں کرو گے، کہہ دو کہ حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے اور تمہارے پاس (وحی کے ذریعے) جو علم آ گیا ہے اگر کہیں تم نے اس کے بعد بھی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہیں اللہ سے بچانے کے لیے نہ کوئی حمایتی ملے گا اور نہ کوئی مددگار۔''

اور یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ آج کا بین الاقوامی نظام اور معاشرہ یہودیوں کی ایجاد ہے اور اس کا بنیادی ڈھانچہ انہوں نے ہی بنایا ہے، اور نصرانی جن میں امریکہ اور برطانیہ سرفہرست ہیں پوری دنیا میں اسے نافذ کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اسی بین الاقوامی معاشرے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری اسلامی دنیا کو میدان جنگ بنایا ہوا ہے تا کہ اس نئے اسلام کو اسلامی دنیا میں نافذ کر سکیں۔

امریکی اسلام کے فروغ کا منصوبہ

کتاب کی مصنفہ نے اس کتاب کے صفحہ نمبر ۸۹ پر امریکی اسلام کے پیروکاروں کی تقویت کے لئے ایک منظم منصوبہ پیش کیا ہے۔ جس میں امریکی سرکار کو وصیت کے طور پر لکھتی ہے:

''اسلامی دنیا میں جمہوریت، ماڈرن ازم، اور موجودہ بین الاقوامی نظام کو منظم کرنے کے لیے کوئی مثبت تبدیلی سامنے آئے تو امریکہ اور مغرب کو چاہیے کہ پوری باریک بینی سے مسلمانوں میں ان عناصر کو تلاش کریں جو اسلام یعنی ''امریکی اسلام'' کو مضبوط کرنا چاہتے ہوں اور اسی طرح امریکہ اور اس کے ساتھیوں پر لازم ہے کہ ان عناصر کے لئے باریک بینی کے ساتھ اہداف اور اغراض مقرر کریں، اور اس پر بھی غور کریں کہ ان عناصر کے آگے بڑھنے سے انھیں کیا نتائج حاصل ہونگے۔ اس کے علاوہ اپنے معاونین کی تقویت کے لئے درج ذیل پروگراموں کو بھی مدنظر رکھا جاسکتا ہے:

۱۔ ان عناصر کی تحریروں کو سستے داموں چھاپا اور پھیلایا جائے۔

۲۔ ایسی جماعتوں اور عناصر کی دل جوئی کی جائے تاکہ وہ عام لوگوں اور نوجوانوں کے لئے تحریریں لکھیں۔

۳۔ ان کے نظریات اور افکار کو سرکاری تعلیمی نصاب اور دینیات میں جگہ دی جائے۔

۴۔ ان کو ریڈیو، ابلاغ عامہ اور عوامی جگہوں تک رسائی دی جائے۔

۵۔ اسلامی احکام کے متعلق ان کی تعبیریں اور تفسیریں لوگوں میں عام کی جائیں تاکہ یہ ان رجعت پسندوں کے ساتھ مقابلہ کرسکیں جو کہ مدارس، مکاتب اور کتب خانوں کے مالک ہیں اور اسلامی نظریات پھیلانے کے لئے جدید الیکٹرونک وسائل سے کام لیتے ہیں۔

۶۔ ماڈرن وسیکولر علماء کو بہت زیادہ عوام الناس میں متعارف کیا جائے تاکہ ان کے ذریعے جوشیلے مسلمان نوجوانوں کی خواہشات اور احساسات کو ٹھنڈا کیا جاسکے۔

۷۔ غیر اسلامی تاریخ اور معاشرے میں مغربی تہذیب کی کتابیں شائع کرنے والوں کی دل جوئی کی

جائے اور انہیں ان کتابوں کی چھپائی اور شائع کرنے میں سہولتیں فراہم کی جائیں اور اسی طرح کے علوم اسلامی ملکوں کے تعلیمی نصاب اور پریس میں چھاپے جائیں، خاص طور پر ان تاریخوں اور علوم کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے جو اسلام سے پہلے اسلامی ملکوں میں موجود تھے۔

۸۔ سول سوسائیٹی کے نام پر مستقل تنظیموں اور جماعتوں کو آگے آنے میں مددد ی جائے تاکہ ان کی معاشرت اور طور طریقے لوگوں کی زندگی میں عام ہو جائیں اور عام لوگوں کے لئے بھی سیاسی سرگرمیاں سیکھنے اور بیان کی آزادی کے مواقع فراہم ہو جائیں۔

افغانستان میں امریکہ کی مذکورہ تجاویز کی زندہ مثالیں

عام افغانیوں کو یہ سمجھانے کے لئے کہ ''رینڈ کارپوریشن'' نامی امریکی ادارے کا بنایا ہوا امریکی اسلام افغانستان میں کیسے پھیلایا جاتا ہے؟ اور کون کس طرح اس کے لئے کام کرتا ہے؟

مذکورہ منصوبے کی آٹھوں شقوں پر ہم الگ الگ مختصر تبصرہ کریں گے، اور اس کی عملی مثالیں بھی بیان کریں گے۔

پہلی شق

اس شق میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ جمہوری اسلام کے ماننے والوں کی تحریروں کو چھاپ کر سستے داموں زیادہ سے زیادہ تقسیم کیا جائے۔ اس منصوبے کو افغانستان میں درج ذیل طریقے سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے:

''امریکہ نے افغانستان پر حملہ کرتے ہی ان بیشتر افغانی اصحاب قلم، ادیبوں، شاعروں، اداکاروں، سیاسی ترجمانوں، سینما گھروں، ناشروں، علمی و سماجی اشخاص کو جو مغرب کی گود میں پل کر پروان چڑھے تھے، اور انہی کے ہاں تربیت یافتہ تھے اور مغربی معاشرے کے طور طریقوں سے متاثر بھی تھے، اپنے ساتھ افغانستان لے آیا اور یہاں ان کے لئے افغانوں پر نظریاتی محنت کے مختلف مواقع

فراہم کیے، ایسے عناصر نے یہاں نظریاتی ومعاشرتی میدانوں میں بہت بڑے پیمانے پر کام شروع کیا چنانچہ سینکڑوں کتابیں، رسالے، اخبارات، ابلاغ اور تبصرے چھپ کر منظر عام پر آئے اور وہ اتنے بڑے پیمانے پر چھاپے گئے کہ لینے کے لئے بھی کوئی نہ ملتا تھا چنانچہ بہت سے اداروں میں تو بالکل سستے داموں میں بھی تقسیم کیئے گئے۔ ایک طرف تو اکثر افغان عوام اقتصادی کمزوری یا کسی اور وجہ سے کتاب اور پریس پر پیسہ خرچ نہیں کر سکتے تو دوسری طرف افغانستان میں موجود مغربی پریس ایسا مواد اور ایسی مطبوعات شائع کرتا ہے جو کہ نہ تو افغانوں کے قومی ذوق کے مطابق ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں ان کے مسائل کا حل موجود ہوتا ہے بلکہ تقریباً تمام مطبوعات ایسے مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں جن سے مغربی نظریات کو فروغ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا افغانی پریس امریکہ یا اس کے اتحادیوں کے سہارے چل رہا ہے کیونکہ اُن کی تمام طباعتی مصارف مختلف امریکی اور یورپی این جی اوز اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر برداشت کرتی ہے جو رینڈ کارپوریشن، کی طرف سے مسلمانوں میں جمہوری اسلام کے فروغ کی خاطر بنایا گیا ہے۔

دوسری شق

یہ شق اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ جمہوریت پسند عوام اور خاص طور پر نوجوان طبقے کو تحریر اور مضمون نویسی سیکھنے کی ترغیب دی جائے، وہ اس طرح کہ تمام وہ اصحابِ قلم جو کچھ لکھنا جانتے ہوں بڑی بڑی تنخواہوں کے عوض مختلف ٹرسٹوں کی طرف سے سماجی کاموں پر لگائے جائیں اور بے دین قسم کے مضمون نویس نہ صرف یہ کہ سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھیں بلکہ شرعی موضوعات میں بھی اپنی رائے لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

اس سلسلے میں بعض اصحابِ قلم تو ارتداد کی سرحد کو چھونے کی جرأت بھی کر لیتے ہیں جس کی زندہ مثالیں، ‘علی محقق نسب’، ‘پرویز کامجش’، ‘لطیف پدرام’ وغیرہ ہیں، اسی طرح بعضوں نے تو عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لئے قرآن کریم کا تحریف شدہ ترجمہ جس کے ساتھ قرآن کریم کا متن نہیں تھا،

چھاپ دیا جس کیخلاف افغان عوام نے سخت رد عمل ظاہر کیا۔ ''رینڈ کارپوریشن'' کے یہ ادارے سیاسی، دینی اور معاشرتی موضوعات کے ساتھ ساتھ ادب اور ادبیات کے نام پر ہزاروں مخرب اخلاق مضامین اور من گھڑت کہانیاں بھی شائع کرتے ہیں جن کے پڑھنے سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جنسی احساسات اُبھرتے ہیں جو بالآخر بدکاریوں پر منتج ہوتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ''ایک رات کی جمہوریت'' کے نام سے چھپنے والی ایک کہانی ہے جس میں ایک لڑکی اور لڑکے کا سفر میں زنا کرنے کی کہانی سنائی گئی ہے جسے آزادی ریڈیو کی ایک رپورٹر لڑکی نے لکھا ہے۔

تیسری شق

اس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ ''جمہوری اسلام'' کے ماننے والوں کے نظریات کو تعلیمی نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ لازمی طور پر تمام لوگ اس کے پڑھنے پر مجبور ہو جائیں اور پھر اسلامیات کے مضامین کے ذریعے لوگ انہی نظریات کو دین اور عقیدے کی حیثیت سے ماننے لگیں۔ اس سلسلے میں امریکہ نے اپنی ایک این۔جی۔او US AID اور (NIBRASKA) ''نبراسکا'' کالج کے ذریعے خاطر خواہ کام کیا ہے۔ نبراسکا (NIBRASKA) کالج میں افغانستان کی وزارت تعلیم وتربیت کے لئے نیا نصاب تیار کیا گیا جسے ''USAID'' نامی ادارے نے چھپوایا۔ یہ نصاب امریکی ماہرین کی زیر سرپرستی تیار کیا گیا۔ اس سے وہ تمام مضامین نکال لئے گئے جن میں جہاد، کفار کے ساتھ دشمنی، حجاب اور اسلام پر سختی سے کاربند رہنے کی تعلیم دی گئی تھی اور ان کی جگہ کفار کے ساتھ صلح وتفاہم، انسانی حقوق اور آزادیٔ نسواں، دہشت گردی کیخلاف جنگ اور مغربی طرز زندگی جیسے مضامین شامل کردیئے گئے۔ اسی نوعیت کی دوسری کوششیں بھی مسلسل جاری ہیں اور ہر سال، دینیات، معاشرتی علوم، تاریخ اور ادب کی کتابوں میں نت نئے مضامین داخل کئے جارہے ہیں، یہ کام نہ صرف افغانستان میں جاری ہے بلکہ پوری دنیا کے اسلامی ممالک میں اور خصوصاً ان ممالک میں جن میں امریکی افواج قیام پذیر ہیں یا اُن میں امریکی مفادرو بہ زوال ہیں، بھرپور طریقے سے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے، امریکہ

ہر سال اس کام کے لئے سینکڑوں ملین ڈالر ''USAID''، آغا خان فاونڈیشن، ایشیا فاونڈیشن، اور دوسرے ٹرسٹوں کو دیتا ہے تا کہ مسلم ممالک کے تعلیمی نصابوں سے حقیقی اسلام کو بالتدریج (رفتہ رفتہ) نکالا جائے اور اس کی جگہ جمہوریت کو اسلامی نظریے کے طور پر متعارف کرایا جائے۔

چوتھی شق

اس شق میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اسلامی دنیا کے سیکولر عناصر کو میڈیا کے ذریعے فروغ دینے کے مواقع فراہم کیے جائیں، افغانستان میں اس کا عملی نمونہ یہ ہے کہ افغانستان میں جمہوری اور سیکولر عناصر کو عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وسیع پیمانے پر ذرائع ابلاغ اور مواقع فراہم کیے گئے ہیں اور اس کے لیے امریکہ نے ایک منظم نشریاتی منصوبہ بنایا ہے جس کو تین طریقوں سے عملی جامہ پہنایا گیا ہے:

۱۔ وہ تمام غیر ملکی ریڈیوز جو افغانستان کی نشریات کے لئے صرف آدھا گھنٹہ دیتے تھے اب ان کا وقت ۱۲ یا ۲۴ گھنٹوں تک بڑھا دیا گیا ہے تا کہ وہ وسیع پیمانے پر معاشرے کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی نشریات پہنچائیں اور وہ ریڈیوز جو پہلے صرف خبروں پر مبنی پروگرام نشر کرتے تھے اب انہوں نے بہت بڑے پیمانے پر سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، ادبی، معاشرتی، اقتصادی، اور دینی پروگراموں کے سلسلے نشر کرنا شروع کر دیئے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان چینلز نے افغانستان کے اچھے خبر نگاروں، صحافیوں، تبصرہ نگاروں، ادیبوں اور سیاسی ماہرین کو پرکشش تنخواہوں کے عوض اپنے اداروں میں کام کے لیے رکھ لیا ہے تا کہ افغانوں کو مغرب زدہ کرنے کے لیے ہر رخ پر کام ہو سکے۔

اس کے علاوہ مغرب نے ''وائس آف امریکہ'' اور ''بی بی سی'' کے بشمول دیگر چینلوں جیسے ''آزادی ریڈیو'' جو امریکی ''کانگریس'' کی طرف سے چلتا ہے ''دیوہ ریڈیو'' اور ''مشال'' ریڈیو کو بھی مصروفِ عمل کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وسیع پیمانے پر اپنی نشریات لوگوں تک پہنچانے کے لئے علاقائی FM چینلوں کو بھی کام پر لگایا ہوا ہے۔

۲۔ مغرب نے افغانستان پر حملے کے بعد تمام بڑے شہروں میں غیر سرکاری چینلز فعال کرائے اور ایسے ہزاروں افراد اس میں لگا دیے جو نظریاتی طور پر ''امریکی اسلام'' کے دلدادہ تھے، ان چینلز میں سے ہر ایک مختلف مقاصد کے لئے اپنے پروگرام نشر کرتا ہے۔ صرف کابل کے شہر میں بیس سرکاری اور غیر سرکاری چینل مصروف کار ہیں۔

۳) امریکہ نے افغانستان کے کئی صوبوں کے بہت سے اضلاع میں علاقائی چینلز بھی کھلوائے جن میں سے اکثر وہ ہیں جو علاقے میں موجود امریکی فوجیوں کے مراکز سے پروگرام نشر کرتے ہیں، اور ان سب کے لئے امریکی ادارہ ''USAID'' فنڈ دیتا ہے۔

اس طرح کے علاقائی ریڈیوز کی تعداد مختلف اضلاع میں اب تک ایک سو ستر ہو چکی ہے۔ یہ پورا انتظام 'رینڈ کارپوریشن' کی طرف سے جمہوری اور مہذب اسلام کے پیروکاروں کے پیغام کو قوم کے ہر ہر فرد تک پہنچانے کے لئے کیا گیا ہے۔

پانچویں شق

اس شق میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیر وتفسیر ایسے الفاظ میں کی جائے جو امریکہ اور اس سے مرعوب اور متاثر لوگوں کو پسند ہو، یعنی دینِ اسلام کی تعبیر وتشریح مغربی رواج کے مفاہیم کے مطابق اور مغرب کی طرف سے مقرر کردہ انسانی حقوق کے دائرہ کار میں ہو، اور اس میں جو باتیں مغربی معاشرے کے معیاروں کے خلاف اور اس سے متصادم ہوں انہیں رجعت پسندی اور بنیاد پرستی قرار دے کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ ان کے مطابق اس طرح کی باتیں پرانی اور دقیانوسی ہونے کی وجہ سے دور حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں بلکہ ان کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

مغرب نے اس تجربہ کو بہت سے اسلامی ممالک میں بارہا آزمایا ہے جیسے ترکی، مصر، لیبیا، تیونس، الجزائر، مراکش، ہندوستان اور پاکستان، جس کے نتیجے میں وہاں لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسے اسلام کا تصور راسخ ہو چکا ہے جس کا کفر اور کفریہ زندگی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا، ان کے

ذہنوں میں حقیقی اسلام کی بجائے ایک ایسے روشن خیال اسلام نے گھر کر لیا ہے جس میں دیگر ادیان و مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ دشمنی، بغض اور جنگ کا تصور ہی نہیں ہوتا جبکہ حقیقی اسلام کے ساتھ ان کی عداوت عروج پر ہوتی ہے، اسی وجہ سے یہ مغرب زدہ نام نہاد مسلمان اسلامی نظام کے قیام میں اہل مغرب سے بھی زیادہ رکاوٹ بنتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔

امریکہ اور اس کے ہم نوا اب افغانستان میں اسی طرح کے روشن خیال اسلام کو جس کی تعبیر و تفسیر مغربی معیار کے مطابق ہو، عملاً نافذ کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کی طرف سے درج ذیل اقدامات کئے جاتے ہیں۔

مغربی اسلام کے فروغ کے لیے امریکی اقدامات

۱۔ حقیقی اسلام کے ماننے والے (مجاہدین) کے افکار و نظریات کو شدت پسندی یا دہشت گردی جیسے ناپسندیدہ ناموں سے مشہور کرانا، لوگوں کے ذہنوں میں ان کے بارے میں یہ تاثر ڈالنا کہ اس وقت یہ افکار ناقابلِ عمل ہیں اور اس کی بجائے مغربی نظریات، افغانیوں کے پرانے رسم و رواج اور شریعت سے بے زار لوگوں کی خواہشات کو اتنی سختی سے عملی جامہ پہنانا گویا وہ آسمانی دین کا حصہ ہیں۔

۲۔ ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں ان روایتی علماء سے بیانات کروانا جو اسلام کی تفسیر مغربی افکار کے مطابق کرتے ہوں اور اس سلسلے میں ان لوگوں کی خدمات بھی حاصل کرنا جنہوں نے مستشرقین کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی ہو۔

۳۔ امریکی کٹھ پتلی حکومت کی طرف سے مرکز اور صوبوں میں ان کے آقاؤں کی مدد سے دینی مدارس بنانا اور پھر ان میں وہ دینی نصاب پڑھانا جو امریکی ماہرینِ تعلیم کی سرپرستی میں وزارت مذہبی امور کے لئے مرتب کیا گیا ہو۔

۴۔ افغانستان کے عدل و قضاء کا نظام بڑی حد تک اسلام پر قائم تھا لیکن اٹلی کی حکومت کی طرف

سے اس میں نظر ثانی اور اصلاحات کی گئیں اور اسی طرح اٹلی کے قانونی ماہرین کی طرف سے افغانی قاضیوں، سرکاری وکیلوں، عدلیہ اور حقوق کے ماہرین کو تربیت دی گئی، گزشتہ سات سالوں سے اس منصوبے (پروجیکٹ) پر بڑی تیزی سے عمل ہورہا ہے، اور اس پر کئی ملین ڈالر خرچ ہورہے ہیں۔

افغانستان کی عدلیہ اور قضاء کے نظام کو بھی اُسی اسلام کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے جو 'رینڈ کارپوریشن' کی طرف سے "جمہوری اسلام" کے نام سے ایک منصوبے کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے گذشتہ آٹھ سال سے افغانستان میں اٹلی کے سفارت خانے کی طرف سے افغانستان کے عدل وقضاء کے اداروں میں کام کرنے والے قاضیوں، ماہرینِ حقوق، استغاثہ کے وکلاء، مختلف تعلیمی سیمیناروں سے سند فراغ حاصل کرنے والے قاضیوں کو سرکاری تنخواہ کے علاوہ ہر مہینہ اُنکے مراتب اور کام کے تناسب سے سینکڑوں ڈالر انعامی تنخواہ بھی دی جاتی ہے تاکہ ان میں سے کوئی بھی مغربی عدالتی نظام کے منصوبے کی علانیہ مخالفت نہ کرسکے۔

۵۔ افغانستان میں مصر کی سیکولر یونیورسٹی "جامعۃ الازھر" کی شاخ کھولنا

'رینڈ کارپوریشن' کے منصوبے کی پانچویں شق میں لکھا ہے کہ جب تک افغان عوام اپنے مخلص علمائے حق سے جڑے رہیں گے اور منبر ومحراب سے رشد وہدایت حاصل کرتے رہیں گے اس وقت تک لوگ "حقیقی اسلام" کو ہی اپنا دین سمجھتے رہیں گے اور پھر اس کی خاطر جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے جیسے کہ گذشتہ چالیس سال سے اس کا مشاہدہ ہورہا ہے، لہٰذا امریکیوں کو چاہیے کہ افغانی عوام کے سامنے مخلص علماء حق اور ان کے مدارس کی بجائے ایسے مغرب زدہ علماء جو امریکی اسلام کے تربیت یافتہ ہوں باہر سے لائے جائیں اور یہ ایسے جمہوریت پسند علماء ہونے چاہییں جو مغرب کے ذہنی غلام ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں تھوڑا بہت دینی اور علمی مقام بھی رکھتے ہوں۔ یہ دونوں صفات چونکہ مصر کی یونیورسٹی جامعہ ازھر کے علماء میں پائی جاتی ہیں اس لئے کابل کی غلام حکومت نے ' مصر جو کہ عرب دنیا میں اسرائیل اور امریکہ کا سب سے بڑا اتحادی ہے اس کی

یونیورسٹی ''جامعہ ازھر'' کی شاخ کابل میں کھولنے کی منظوری دی ہے۔

آپ کی خدمت میں ایک بات یہ واضح کرتا چلوں کہ یہی جامعہ ازھر کسی زمانے میں حقیقی معنوں میں اسلام کے سیکھنے سکھانے کا مرکز تھا اور اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تصور کیا جاتا تھا، اور اللہ سے ڈرنے والے علمائے حق کی تربیت گاہ تھا، لیکن اب یہی جامعہ ازھر مصر کی سیکولر سرکار کا ایک سیکولر تعلیمی ٹرسٹ ہے جو مسخ شدہ اور مغربی افکار پر مشتمل اسلام کی نشرواشاعت کے لئے استعمال ہورہا ہے۔ اس وقت اس جامعہ کے مدرسین ایسے لوگ ہیں جو ڈاڑھیاں منڈواتے اور سگریٹ پیتے ہیں، غرض ان میں دینداری کا دور تک نام ونشان ہی نہیں ہوتا، حکومت انہیں جس چیز کا حکم دیتی ہے وہ اسی پر چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی قریب میں اسی جامعہ ازھر کے جتنے بھی تعلیم یافتہ صدر، وزیر یا کسی اور بڑے رتبے کے مالک بنے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اسلام کی خدمت کے لئے کوئی ادنیٰ کردار بھی ادا نہیں کیا۔

مثال کے طور پر انڈونیشیا میں عبدالرحمن وحید، مالدیپ میں مامون عبدالقیوم افغانستان میں ربانی اور مجددی ایک سیاسی تنظیم کے قائدین کی حیثیت سے، عبدالرب رسول سیاف ایک تنظیم کے لیڈر کی حیثیت سے اور موجودہ عدالت عظمیٰ کا صدر عبدالسلام عظیمی، یہ سب بھی ایک سیکولر ازھری ہیں، حقیقی اسلام کے نفاذ کے لیے ان کا کیا کردار ہے؟ وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اس وقت پوری دنیا میں موجود ازھریوں میں ایک مشترکہ نظریہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ مغرب کے خلاف کسی قسم کی مسلح جدوجہد کرنا جہاد نہیں بلکہ اس کو دہشت گردی، شدت پسندی اور ناحق بغاوت کہنا چاہیے جبکہ مسلمانوں میں اس قسم کے نظریات پیدا کرنے سے مغرب کے بہت سے اہم ترین مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

کابل میں جامعہ ازھر کی شاخ کھولنے کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ ''امریکی سیکولر اسلام'' کے ڈھانچے میں علماء کی پرورش کی جائے تاکہ مستقبل میں وہ بھی ازھریوں کی طرح ''امریکی اسلام'' کے لیے کام کریں اور اسی کی دعوت دیں اور علاقے میں سچے اور مخلص علماء حق کا مقابلہ کرنے کے لئے

ایک مقامی جماعت تشکیل دیں۔

چھٹی شق

اس شق میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ معاشرے میں جمہوریت پسند علماء کو متعارف کرایا جائے لہٰذا افغانستان میں اس شق کو درج ذیل طریقوں سے عملی جامہ پہنایا گیا:

امریکہ نے حملے کے بعد تمام حق پرست علماء کو مختلف بہانوں سے زیر عتاب لاکر بعض کو تو قید میں ڈال دیا، بعض کو شہید کر دیا اور جو بچے کھچے تھے ان کو ملک چھوڑنے یا زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے امریکہ کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ اس طریقے سے منبر و محراب، مکاتب و مدارس کو ان علماء سے خالی کر دیا جائے جو "امریکی اسلام" کے فروغ میں رکاوٹ بنتے ہیں جبکہ دوسری طرف ایسے علماء کے منظر عام سے ہٹنے سے پیدا ہونے والے خلاء کو اُن دنیا پرست مغرب زدہ علماء سے پر کر دیا جائے جو امریکہ اور مغرب سے متاثر اور اس کے تربیت یافتہ ہیں، جمہوریت کو دل و جان سے مانتے اور جمہوریت کے دائرے میں رہتے ہوئے دین کی خدمت کے لئے اپنا اتنا ہی کردار ادا کر سکتے ہیں جتنا جمہوریت ان کو اجازت دیتی ہے، ایسے علمائے سوء جمہوری مفادات کی تکمیل اور آزادیٔ اظہار رائے کا حق ادا کرنے کے لئے کبھی کبھار حکومت کے بعض اقدامات پر تنقید بھی کرتے ہیں، جس سے ان کے دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔

☆ ایک یہ کہ اس کے ذریعے وہ عوام کی نظروں سے اپنا سیاہ چہرہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ تأثر دیتے ہیں کہ امریکہ کو علماء کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں اور جو کوئی بھی اسلام کی خدمت کرنا چاہے تو آئے اور اِن علماء کی طرح جمہوری نظام کا حصہ بن کر دین کی خدمت کرے۔

☆ دوسرے یہ کہ امریکہ نے ان مغرب زدہ علماء اور اساتذہ کو شہرت دینے کے لئے انھیں نشر و اشاعت کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ہر جگہ اپنے مراکز بنانے کی بھی اجازت دے رکھی ہے اور ملک کے تعلیمی اداروں میں پڑھنے پڑھانے والے طلبہ اور اساتذہ کی جدید

طرز پر ذہن سازی کے لئے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

امریکا کی طرف سے اس اجازت کے بدلے یہ نام نہاد مسلمان امریکہ کی کٹھ پتلی، غلام حکومت کے لئے درج ذیل خدمات انجام دیتے ہیں:

امریکہ کے لئے مغرب زدہ علمائے سوٗ کی خدمات

۱۔ افغانستان میں دینی علماء کی حیثیت سے جمہوریت کو صحیح ماننا اور ایک سیکولر جمہوری حکومت کا ساتھ دیتے ہوئے کوئی مخالفت نہ کرنا۔

۲۔ نوجوانوں اور عوام کے ذہنوں سے جہاد، قتال، ہجرت، ولاء اور براء (یعنی صرف اللہ کے لئے دوستی یا دشمنی کرنا) کے نظریات نکال کر ان کو یہ بات باور کرانا کہ جنگ اور اسلحے سے امت کے مسائل حل نہیں ہوتے، جنگ اور اسلحے نے افغانستان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، لہٰذا وطن کی تعمیر و ترقی کی خاطر ہمیں بین الاقوامی دنیا کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے، علاوہ ازیں لوگوں میں غیر محسوس طریقے سے اس بات کا پرچار کرنا کہ طالبان اور مجاہدین فلاں فلاں ملک کے ایجنٹ ہیں اور وہ افغانی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی ایجنڈا نہیں رکھتے لہٰذا ان کی کوئی بات نہ مانی جائے۔

جہاد و قتال سے لوگوں کو روکنا ایک بڑی منافقت اور امریکیوں کے اہداف کی تکمیل ہے جو کہ اس طرح کے علماء بڑی بے شرمی سے انجام دے رہے ہیں۔

۳۔ جہاد کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلا کر علمائے حق کی کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا مثلاً نوجوانوں سے یہ کہنا کہ جہاد کے لئے متفقہ امیر کا ہونا اور ایک جھنڈے تلے ہونا ضروری ہے اور آج کل افغانستان کے جہاد میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں لہٰذا موجودہ صورتِ حال میں جاری جنگ شرعی جہاد نہیں بلکہ ملک کی تباہی ہے لیکن اندرونی منافقت کیوجہ سے یہ بات لوگوں سے چھپاتے ہیں کہ مذکورہ شرائط ''اقدامی جہاد'' یعنی کفار کی سرزمین پر حملہ آور ہونے کے لئے ضروری ہیں جبکہ افغانستان میں ہونے والا جہاد تو دفاعی جہاد ہے جو کہ تمام مسلمانوں پر نماز کی طرح فرض ہے۔

۴۔ اسلامی دنیا میں مغرب کا ایک بڑا ہدف یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکالا جائے اور ان تمام قیود اور پابندیوں کو توڑا جائے جو مرد و زن میں اختلاط کو روکتی ہیں، اس کے لیے مغرب ایک عرصے سے کوشش کر رہا ہے، اور ہر ممکن وسائل سے کام لے رہا ہے، جن میں سے بعض کوششیں ایسی ہیں جو ظاہری طور پر اعلیٰ دینی خدمات معلوم ہوتی ہیں جیسے کہ ۲۰۰۹ میں 'کنڑ' کے مرکز اسد آباد میں امریکہ کی PRT کے صوبائی تعمیراتی ادارے نے ایک لاکھ اسی ہزار ڈالر کی لاگت سے صرف عورتوں کے لئے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی، اس میں بڑی تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو طلبہ، علماء اور مساجد میں عام نمازیوں پر دوران نماز بمباری کر کے انہیں قتل کر دیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان کی عورتوں اور بہنوں کے لئے شہروں میں اپنے جنگی اخراجات کے فنڈ سے خصوصی طور پر عورتوں کے لیے مسجد تیار کی جاتی ہے۔ (یاللعجب۔۔۔!)

اس سلسلے میں یہ جمہوریت زدہ علماء دینی جلسوں، تعلیمی محفلوں اور تربیتی اجتماعات کے بہانے ہزاروں مسلمان پردہ نشین عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر انہیں، پارکوں، شہری عید گاہوں اور میدانوں میں جمع ہونے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ دین کے نام پر کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ اُسی مغربی منصوبے کا حصہ ہے جس کے ذریعے مسلمان عورتوں کو گھر سے باہر نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلامی تاریخ میں مسلم علماء نے عورتوں کو دین سکھانے کے لئے دعوت کا یہ طریقہ کار کبھی بھی نہیں اپنایا اور نہ یہ طریقہ دینی مزاج کے ساتھ کوئی مطابقت رکھتا ہے، اسلام میں تو عورتوں کی عبادت کے لئے بھی گھروں کو مساجد سے بہتر کہا گیا ہے۔

ساتویں شق

اس شق کے مطابق اسلامی ملکوں میں غیر اسلامی ملکوں اور قوموں کی تاریخ اور ان کی تہذیب وتمدن کو متعارف کرانے کی سفارش کی گئی ہے اور خاص طور پر اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے کی تاریخ کو مسلمانوں میں متعارف کرایا جائے، تاکہ مسلمان اس کو اپنی ہی تاریخ سمجھیں اور

اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کریں۔

اس سلسلے میں کٹھ پتلی حکومت نے اب تک بڑے پیمانے پر اسکولوں کی کتابوں میں اس ذر سے زیادہ تغیر نہیں کیا کہ افغانستان کے دیہاتوں اور قبائلی علاقوں میں ابھی تک دینی شعور زندہ ہے اور بہت سے علاقے ایسے بھی ہیں جہاں حکومت کا زور بھی نہیں چلتا لیکن اس کسر کو میڈیا اور پریس کے ذریعے پورا کیا جا رہا ہے اور وہ اس طرح کہ بہت سے ٹی وی چینلز اور ریڈیوز جو کہ غیروں کی طرف سے مصروف عمل ہیں اور جنھیں بے دین قسم کے افغانی چلاتے ہیں، رات دن مغربی اور بھارتی تاریخ، تمدن اور ان کا رسم ورواج پیش کرتے ہیں۔ ان چینلوں کو چلانے والے چونکہ امریکا کی طرف سے اس خدمت پر مامور ہوتے ہیں، اس لئے وزیر اطلاعات 'عبدالکریم خرم' کے بس کی بات بھی نہیں کہ کسی ایک چینل کی بھی اس قسم کی نشریات کو روک سکے کہ جو افغانیوں کے دین، اخلاق، معاشرہ اور قومی اقدار کے خلاف ہوں۔

اسی طرح وہ سیکولر مضمون نگار اور تبصرہ نگار جن کے سینے اسلام کے بغض اور کینے سے بھرے پڑے ہیں، وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تحریروں کو افغانستان میں قبل از اسلام رائج مذاہب اور تاریخ کی نشر واشاعت کے لئے مختص کر دیں تاکہ عوام الناس کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن افغانوں کی زندگی میں ایک زائد اور فالتو چیز ہے کہ جو فاتح قوموں کی طاقت سے یہاں رائج ہوئی ہے حالانکہ افغان عوام کی اصل تہذیب ایائیت، زردشیت، مزدکیت، اور بدھ مت ہے اسی وجہ سے ان کے ہاں بدھ مت سے متعلق آثار اور پرانے ادیان کی بقایا جات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس بارے میں سینکڑوں مضامین دائرۃ المعارف البریطانیہ اور دوسرے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو اسلام سے پہلے کے زمانے کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آٹھویں شق

اس شق میں یہ لکھا ہے کہ اسلامی دنیا کے سیاسی میدان میں شہری تنظیمیں (سول سوسائٹی) اور سیاسی جماعتیں آگے لائی جائیں اور عوام کو بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی دعوت دی جائے۔ یہ سفارش چونکہ حقیقت میں اسلامی معاشرے کو توڑنے اور بے شمار تنظیموں میں تقسیم کرنے کا وہ ناپاک منصوبہ ہے جس کو افغانستان میں بڑی مہارت کے ساتھ درج ذیل طریقے سے عملی جامہ پہنایا گیا ہے:

افغانی معاشرہ جو پہلے سے موجود آٹھ، نو سیاسی جماعتوں کے اختلاف اور جھگڑوں کی دلدل سے نہیں نکل پایا تھا، اور نہ ہی اب تک ان نقصانات کی تلافی ہو سکی تھی جو کہ جہادی تنظیموں کے باہمی قتل وقتال کی وجہ سے افغانی معاشرے میں پیدا ہوئے تھے، امریکہ نے آتے ہی افغانوں کو ایک مرتبہ پھر دو سو سیاسی دھڑوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دیا۔

ہر یورپی ملک نے تقریباً ایک درجن سیاسی تنظیموں کے مالی اخراجات کی کفالت اپنے ذمہ لے لی، یورپی ممالک کے علاوہ پڑوسی ممالک نے بھی افغانستان میں قومی اور لسانی بنیادوں پر اپنے سیاسی اور ثقافتی مقاصد کی حفاظت کی خاطر کئی سیاسی جماعتیں بنالیں اور ان کے لئے بڑے پیمانے پر نشریاتی وسائل اور اجتماعی ذرائع ابلاغ کو بھی استعمال کیا۔

ان پارٹیوں کی سیاسی کارکردگیوں نے افغان معاشرے کو کچھ اس طرح تقسیم کر دیا کہ گذشتہ زمانے میں اس قوم کی باہمی وحدت کی بات ایک افسانہ بن کر رہ گئی اور اس کا حقیقی وجود بالکل ہی ختم ہو گیا۔ استعماری ممالک دنیا میں مختلف قوموں کو اسی طرح پارٹیوں میں تقسیم کرتے ہیں تا کہ مغرب کے خلاف ان کے متحد ہونے کے امکانات ہی باقی نہ رہیں۔ اسی طرح ایک سیاسی پارٹی کو دوسرے کے خلاف کھڑا کر کے اپنا محتاج بنا دیتے ہیں تا کہ اگر ایک پارٹی سے اپنی پالیسیوں اور منصوبوں کی تکمیل نہ ہو سکے تو متبادل کے طور پر دوسری جماعت کو غلبہ دے کر اقتدار سونپ دیا جائے۔ یہ انگریزوں کے اس قدیم اصول کا عملی مظہر ہے کہ جسے ''DIVIDE AND RULE'' یعنی ''تقسیم کرو اور حکومت

کرو“ کی پالیسی کہا جاتا ہے۔

سیاسی سرگرمیوں میں عام لوگوں کی شرکت اور اس میں آزادی اظہار رائے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں عمومی امیر کی اطاعت اور اپنے وفاق کی پشت پناہی کی بجائے مقامی سطح پر منظم ہونے کے لئے کئی مراکز بنائے جائیں اور معاشرے کے افراد کو یہ شوق دلایا جائے کہ مرکزی حکومتوں کو اپنے سیاسی اقدامات کے ذریعے دباؤ میں رکھیں، اس سے مغرب کو بیک وقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ مرکزی حکومتیں کمزور ہوں اور دوسرا یہ کہ عوام آزادی کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں تا کہ انہیں مختلف سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کے ذریعے حکومت کے بالمقابل لاکھڑا کیا جاسکے۔

اسلام کے خلاف نام نہاد روایتی قسم کے علماء سے کام لینا

رینڈ کارپوریشن ”امریکی اسلام“ کی نشر واشاعت کے لئے عوام کے ایک ایسے طبقے کی نشاندہی کرتی ہے، جو بنیادی طور پر ان کے ساتھ کام تو نہیں کرتے لیکن ان سے استفادہ ممکن ہوسکتا ہے۔

ان میں سے ایک طبقہ ”روایتی قسم کے مولوی“ ہیں جو راسخ شرعی علم سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصل روح اور مزاج شریعت سے نا آشنا ہوتے ہیں اور پیشہ وارانہ طریقے سے معاشرے میں دینی فرائض سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں، یہ طبقہ ہر اس تحریک کی مخالفت کرتا ہے جو معاشرے کے سامنے اسلام کو اپنی اصل اور حقیقی شکل میں پیش کرتی ہے جو تمام اقوام عالم کے دین و دنیا دونوں کا کفیل ہے۔

اس طرح کے نام نہاد علماء یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں کسی بھی طرح کی مثبت تبدیلی کیوجہ سے وہ اپنے تمام اُن مادی ومعنوی مصالح سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو یہ اپنی پیشہ ورانہ امامت سے حاصل کرتے ہیں، اسی لئے یہ نہیں چاہتے کہ سیاسی اور انقلابی فکر رکھنے والے علماء اس معاشرے میں

مقام حاصل کریں۔

''چیریل بنارڈ'' نے اپنی کتاب ''سول ڈیموکریٹک اسلام'' کے صفحہ۲۷ پر ان طریقوں کو بیان کیا ہے جنکی وجہ سے روایتی علماء کو جہادی فکر رکھنے والے تحریکی علماء اور نوجوانوں کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے، لہٰذا وہ لکھتا ہے:

☆ ''روایتی قسم کے علماء کے وہ اعتراضات جو وہ انقلابی فکر رکھنے والوں کی کارگردی پر کرتے ہیں، ان کو بڑے زوروشور سے نشر کیا جائے، اور ان دونوں جماعتوں کے درمیان اختلاف کو اور بھی ہوا دی جائے۔

☆ جہادی علماء اور روایتی ملاؤں کے باہم متحد ہونے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں اور روڑے اٹکائے جائیں، روایتی ملاؤں اور جمہوریت زدہ علماء کو آپس میں قریب کرنے والی کوششوں کی دلجوئی کی جائے۔

☆ نام نہاد ملاؤں کو جہادی فکر رکھنے والے علماء کے ساتھ مناظرے کرنے کی تربیت دی جائے تاکہ وہ دلیل کے میدان میں رجعت پسندوں کا مقابلہ کرسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر جہادی علماء ذرائع ابلاغ اور بحث ومباحثہ کے میدان میں روایتی ملاؤں سے بہت زیادہ آگے ہوتے ہیں۔

☆ بعض ملکوں میں تو روایتی ملاؤں کو جمہوری اسلام کی تعلیم وتربیت دینی چاہیے تاکہ وہ پرزور طریقے سے جہادی علماء کا مقابلہ کرسکیں۔ ان نام نہاد علماء کے مدارس میں ماڈرن علماء کو تدریسی خدمات سونپی جائیں۔ ایسے روایتی مولویوں کی جو ماڈرن علماء کے نظریات کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں، پشت پناہی کی جائے اور ان کے نظریات کو پھیلایا جائے تاکہ سخت گیر وہابی نظریات کے حامل لوگوں کا راستہ روکا جائے اس مقصد کی تکمیل کے لئے مال اور علم دونوں ضروری ہیں کیونکہ وہابی نظریات کے حامل لوگ بھی وہابی نظریات کو پھیلانے کے لئے بہت مال خرچ کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ علمی اعتبار سے بھی انہوں نے بہت ترقی کی ہوئی ہے۔''

مندرجہ بالا مذکورہ دونوں صورتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امریکہ نے حملے کے فوراً بعد افغانستان اور پاکستان میں نام کے ملاؤں اور ان کے مدارس سے درج ذیل طریقے سے استفادہ کیا:

افغانستان میں امریکی حکومت نے مرکز اور صوبوں میں علماء کی مجالسِ شوریٰ بنائیں اور ان کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں مقرر کر دیں اور مجاہدین کو بدنام کرنے کے لئے منبر و محراب کا غلط استعمال کیا، حملہ آوروں یعنی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو مستأمنین (افغانستان میں امن طلب کر کے آنے والے) اور مجاہدین کو باغی قرار دیا، اس کے معاوضے کے طور پر ہر سال ان مزدور علماء کی ایک بڑی تعداد کو سرکاری خرچ پر حج بھی کرایا جاتا ہے۔

اسی طرح پاکستان میں امریکہ نواز حکومت نے پاکستان کے روایتی اور جمہوریت نواز علماء کی تمام جماعتوں اور تنظیموں اور اسی طرح ان کے مدارس اور دارالافتاؤں کو وہاں کی تمام اسلامی انقلابی تحریکوں جیسے کہ لال مسجد کی تحریک، نفاذ شریعتِ محمدی کی تحریک اور تحریکِ طالبان پاکستان سے نہ صرف یہ کہ دور رکھا بلکہ علانیہ طور پر اُن سے اِن جہادی اور انقلابی کوششوں کے خلاف بیانات اور استحکام پاکستان کے نام پر جلسے بھی کروائے جس میں انہوں نے حکومت کا ساتھ دینے کے فتوے بھی صادر کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی معاشرے کا وہ طبقہ جو پاکستانی حکومت کے مظالم اور ان کی اسلام دشمن پالیسیوں سے باخبر تھا ان روایتی اور جمہوریت نواز علماء سے متنفر ہو گیا اور عام مسلمانوں کا اعتماد ان سے اٹھ گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا گیا کہ برطانوی اور امریکی حکومتوں نے باقاعدہ طور پر پاکستان کے بعض مشہور مدارس اور خاص طور پر ان مدارس سے جو کہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاوہ دوسرے علاقوں میں ہیں، تعلقات استوار کر لئے اور اس کے علاوہ بعض مشہور مدارس نے تو کراچی میں اُن موضوعات پر تقریری مقابلے بھی کروائے جو مغرب کے لئے موجودہ حالت میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جیسے کہ انسانی حقوق، مذہبی صبر و تحمل، امن پسند زندگی اور اسی طرح کے دیگر اور موضوعات

اوران تقریری مقابلوں میں ممتاز کامیابی حاصل کرنے والے طلباء کوگراں قدر انعامات سے بھی نوازا گیا۔

چھٹی شق کو عملی شکل دینے کے لئے افغانستان میں (PRT) پی آرٹی اور امریکہ کی طرف سے مختلف صوبوں میں مساجد اور مدارس بنائے گئے اور وہاں اُن ماڈرن یا روایتی ملاؤں کو تدریسی اور انتظامی خدمات پر لگایا گیا جو جہاد اور مجاہدین کے ساتھ نظریاتی اختلاف رکھتے تھے، اسی طرح پاکستان میں دینی مدارس کی چار دیواری میں سرکاری کالجوں کی طرح "كلية الشريعة" (اسلامک لاء کالج بنام کلیۃ الشریعۃ) کے نام سے غیر سرکاری کالجز بنائے گئے اور ان کلیات (کالجز) میں ان طلبہ کو داخلہ دیا گیا جو اسکولوں اور کالجوں کے سند یافتہ تھے اور انہوں نے پہلے کبھی مدرسہ میں نہیں پڑھا تھا اور داخلے کے بعد صرف چند مختصر کورسوں (Short Courses) کے بعد انہیں علماء اور فضلاء کے القاب سے نوازا گیا جبکہ ان مختصر دوروں اور کورسز میں بیشتر اساتذہ بھی کالج یونیورسٹیوں کے ہوتے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدارس کے انتظامی اور ادارتی امور ان کے سپرد کئے گئے تاکہ مستقبل میں یہی لوگ ماڈرن علماء کی حیثیت سے مدارس سے ابھریں۔ تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ اس طرح کے ماڈرن طالب علموں کو طالب علمی کے دوران بھی ان کے استاذ سے بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں حالانکہ مدرسے کے دوسرے طلبہ کو چندہ جمع کرنے پر لگایا جاتا ہے اور بڑی مدت تک ایسے علوم وفنون میں مصروف کیا جاتا ہے جن کی طرف اصلاً کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ پاکستانی مدارس آج اعلانیہ طور پر اپنے طلباء کو مجاہدین کے ساتھ ملنے جلنے سے منع کرتے ہیں اور مجاہدین کا تعارف دین اور ملک کے دشمنوں کی حیثیت سے کراتے ہیں البتہ یہ بات صرف اُن مدارس کے ساتھ خاص ہے جن کی انتظامیہ کے حکومت اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ مضبوط روابط ہیں اور جو سیاسی ایجنڈے میں بھی حکومت کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔

ساتویں شق کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے مجاہدین کے نظریات کو ''وہابیت'' اور

''تکفیریت'' کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں بھی بڑے پیمانے پر کام جاری ہے۔ مغربی میڈیا کی یہ کوشش ہے کہ 'جہادی فکر' کو 'وہابی فکر' مشہور کیا جائے۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر اس کی نشر و اشاعت بھی کی جارہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے سے روایتی ملاؤں کو اس بات پر آمادہ بھی کیا جارہا ہے کہ وہ مذہب کے دفاع کے نام پر عرب مجاہدین کے خلاف ایک موقف اختیار کریں، وہ مجاہدین جنہوں نے صرف اللہ کی رضا کی خاطر جہادی راہ کو اپنایا اور اس راستے میں محلات، تنخواہیں، آرام دہ زندگی، اپنے گھر بار اور تمام دنیاوی نعمتوں پر پہاڑوں اور غاروں کی زندگی اور راہ شہادت میں جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی موت کو ترجیح دی اور یہ سب صرف اور صرف اللہ کے دین اور مظلوم مسلمانوں کی عزت و ناموس کے دفاع کی خاطر کیا، امریکہ چاہتا ہے کہ افغان عوام ان عرب مجاہدین کو بیگانہ اور غیر سمجھیں اور ان سے برسر پیکار بیرونی صلیبی حملہ آور کو اپنا دوست سمجھیں۔

رہی بات وہابیت کی تو وہابیوں کی تنظیمیں تو افغانستان، پاکستان اور سعودی عرب تینوں ممالک میں امریکہ نواز حکومتوں کی نعمتوں سے مزے لے رہی ہیں، مجاہدین کے خلاف فتوے صادر کر رہی ہیں اور علانیہ طور پر صلیبی فوجوں کے خلاف لڑنے والے مؤمن مجاہدین کو ''گمراہ جماعت'' کا خطاب دیتی ہیں۔

امریکی تحقیقاتی ادارے ''رینڈ کارپوریشن'' (Rand Corporation) نے اپنی کتاب ''جمہوری اسلام'' میں مخلص مسلمان جنہیں یہ انتہا پسند کہتے ہیں، کی مخالفت اور سد باب کے لئے ایک مفصل منصوبہ پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے:

۱۔ اسلام کی اس تشریح اور تفسیر کی جو انتہا پسندوں نے کی ہے، بھرپور مخالفت کی جائے اور اس کے غلط ہونے کو ثابت کیا جائے۔

۲۔ سیکولر جماعتوں کے ساتھ انتہا پسندوں کے خفیہ روابط اور تعلقات کو ظاہر کیا جائے۔

۳۔ شدت پسندوں کی ظلم وزیادتی اور اُن کے انجام کولوگوں کے سامنے بیان کیا جائے اور یہ پروپیگنڈا تو بھر پور طریقے سے ہونا چاہیے کہ شدت پسند اپنے ملک وقوم کی ترقی بالکل نہیں چاہتے اور یہ پیغام خاص طور پر نوجوان طبقہ، ان پڑھ عوام اور مغرب میں رہنے والی اقلیتوں کو پہنچایا جائے تا کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں شدت پسند ایک غیر معتمد اور ناپسندیدہ گروہ کی حیثیت سے پہچانے جائیں۔

۴۔ لوگوں کے ذہنوں سے شدت پسندوں کا احترام بالان کے کارناموں کا تذکرہ نکالا جائے، اورانہیں معاشرے میں برے ناموں سے مشہور کیا جائے جیسے کہ تکفیری، شدت پسند، انتہا پسند، ظالم و جابر۔

۵۔ کالم نگاروں، صحافیوں اور تبصرہ نگاروں کواس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ شدت پسندوں کے بارے میں فساد، نفاق، فسق جیسی بری صفات متعارف کرائیں اوران کے خلاف رپوٹیں تیار کر کے نشر کریں۔

۶۔ شدت پسندوں کو آپس میں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جائے۔

درج بالا منصوبے کو پورے اہتمام کے ساتھ افغانستان میں درج ذیل طریقے سے عملی جامہ پہنایا گیا ہے:

☆ امریکہ نے افغانستان میں اپنے میڈیا کے ذریعے ''حقیقی اسلام'' کومجاہدین کا اپنا گھڑا ہوا ''خودساختہ اسلام'' سے تعبیر کیا اور یہ مشہور کیا کہ یہ اسلام موجودہ زمانے میں قابل عمل نہیں اور اس کی جگہ اُس اسلام کوحقیقی قرار دیا جوان کی اپنی سرپرستی میں سیکولر مسلم ملکوں سے برآمد کیا گیا تھا۔

☆ امریکہ اوراس کے اتحادیوں نے یہ بھی کوشش کی کہ جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعے مجاہدین اور جرائم پیشہ افراد اور بدعنوان جماعتوں کے درمیان تعلقات کی خبریں نشر کریں۔ خاص طور پر اس بات کوشہرت دیں کہ مجاہدین کے اخراجات ناجائز ذرائع مثلاً نشہ آور مواد کے کاروبار سے پورے کیے جاتے ہیں۔

☆ افغانستان میں مغربی میڈیا دن رات مجاہدین کے خلاف منفی پروپیگنڈا کرنے میں مصروفِ عمل ہے تاکہ امریکہ اور مغرب کی اندھا دھند اور وحشیانہ بمباریوں میں ہونے والی اموات اور نقصانات کی ساری ذمہ داری مجاہدین پر ڈال دے، اگر امریکہ سینکڑوں دیہاتیوں اور عام لوگوں جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں شامل ہوتی ہیں کو مار دے تو اس کو غلطی ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ میڈیا بالکل اس کو نشر ہی نہیں کرتا باوجودیکہ ان کی کٹھ پتلی حکومت بارہا اس کا اقرار کرے لیکن اگر مجاہدین کہیں کسی خائن، غدار اور جاسوس کو مار ڈالیں یا کوئی شرعی حد نافذ کریں تو میڈیا اسے ایک ''سانحہ'' بنا دیتا ہے اور مسلسل کئی ہفتوں تک اس پر سوال و جواب کی نشستیں اور تبصرے نشر کرتا رہتا ہے۔

☆ مجاہدین کو خونخوار، امن دشمن کے طور پر متعارف کرایا گیا جبکہ دوسری طرف اس نے خود آدھے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، لاکھوں لوگوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا اور گزشتہ آٹھ سال کے عرصے میں ہزاروں بے گناہ لوگوں کو قتل کیا، اس کی این جی اوز نے کئی ملین ڈالر چوری کر کے ہڑپ کر لیے، پھر بھی اپنے آپ کو امن کا علم بردار اور افغانستان کی تعمیر و ترقی کا خواہاں کہتے ہیں۔

☆ مغرب نے افغانستان پر حملے کے بعد یہ کوشش کی کہ اپنی نشریات کے ذریعے اسلام کے سچے علماء اور مجاہدین کو تنگ نظر، پسماندہ، غیر مہذب، سخت دل، کم علم اور بے ہنر لوگوں کی حیثیت سے متعارف کرائے اور مجاہدین کی دلیرانہ اور حیران کن کاروائیوں کو بزدلانہ کاروائیاں ثابت کرے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام کے حقیقی علماء پس ماندہ، غیر مہذب اور کم علم ہیں تو مغرب ان کی باتوں کا جواب باتوں اور دلائل سے دینے کی بجائے بموں اور قتل و غارت گری سے کیوں دیتا ہے؟ اگر مجاہدین بزدل ہیں تو امریکہ میدان میں خود اکیلا کیوں نہیں آتا؟ اس نے پوری دنیا کو منت سماجت کر کے اپنا اتحادی کیوں بنایا ہے؟ چونکہ مخلص علماء اور راہ حق کے مجاہدین میں فسق اور اخلاقی فساد کا نام و نشان تک نہیں اس لئے مغرب نواز کالم نگاروں کو ان کے خلاف لکھنے کے لئے جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو انہوں نے مجاہدین کو مختلف پارٹیوں اور حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش شروع کر دی چنانچہ کبھی یہ کوشش کرتے ہیں۔

کہ ایک جماعت کو اعتدال پسند جماعت کا نام دیں تو دوسری کو شدت پسند لیکن الحمدللہ ابھی تک ان میں سے کوئی جماعت بھی اس ''اعتدال'' پر نہیں آئی جو ان کی آرزو ہے۔

جمہوری عناصر کی امداد

'رینڈ کارپوریشن' ایک طرف تو مجاہدین کو بدنام کرنے اور ان پر تہمتیں لگانے کی سفارش کرتا ہے تو دوسری طرف اسلامی ملکوں میں بے دین اور سیکولر عناصر کی تقویت اور ان کے موقف کو سراہنے اور معاشرے میں ان کو اقتدار تک پہنچانے کے منصوبے کو بھی درج ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے:

☆ سیکولر اور جمہوری عناصر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ شدت پسند ان کے اور امریکہ کے مشترکہ دشمن ہیں۔ اسلامی ملکوں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ مغرب نواز جمہوری عناصر کو ان جماعتوں کے ساتھ متحد ہونے سے دور رکھیں جن کے ساتھ امریکہ کا نظریاتی اختلاف ہے جیسے نیشنلسٹ، کمیونسٹ وغیرہ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جمہوری عناصر مغرب کی بجائے کسی اور کے ایجنڈے کے لئے کام کرنے لگ جائیں۔ اسلامی دنیا میں اس نظریہ کو تقویت دی جائے کہ دین کا حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرائی جائے کہ یہ نظریہ ان کے دین کے لئے کوئی نقصان دہ بھی نہیں بلکہ یہ تو دین کو مزید قوت بخشتا ہے۔

☆ اسلامی معاشرے میں نئی مغرب نواز قیادتیں پیدا کی جائیں اور ساتھ ساتھ ان کی پشت پناہی اور مدد بھی کی جائے۔ وہ مغرب نواز قیادتیں جو کمزور ہیں اور شکست کے خطرے کا سامنا کر رہی ہیں، ان میں سول سوسائٹی کی حفاظت کرنے والی قیادتوں جیسی دلیرانہ صفات پیدا کرنی چاہئیں، خاص طور پر عورتوں میں جیسے کہ افغانستان میں ''سیما ثمر'' اور مصر میں ''نوال سعداوی'' سامنے آئی ہیں۔

☆ مسلمانوں کی اکثریت کو وسیع سیاسی سرگرمیوں میں شریک کیا جائے تاکہ مسلمانوں کو شدت پسندی کی طرف جانے سے روکا جا سکے اور مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کروایا جائے کہ اسلام تو ان کی معاشرتی زندگی کے صرف ایک ہی جز میں راہنمائی کرتا ہے یعنی 'عبادت' اور زندگی کے دوسرے شعبوں

کے لئے اسلام نے ایسی کوئی خاص تعلیمات نہیں دیں جن کو مشعل راہ بنایا جائے۔

☆ شہری معاشرے (سول سوسائٹی) کو وسعت دی جائے خاص طور پر جنگ زدہ علاقوں کے مہاجرین، اور ناگفتہ بہ حالات سے نکلنے والے خاندانوں کے حالات سے سیکولر اور جمہوری قیادت کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور غیر سرکاری ٹرسٹوں اور جماعتوں کے ذریعے دیہاتوں اور شہروں میں لوگوں کی فلاح و بہبود کے ایسے بنیادی مواقع فراہم کئے جائیں جس کے نتیجے میں "معتدل" ماڈرن سیاسی قیادت اور سیاسی کلچر کو وجود ملے۔

مذکورہ بالا تجاویز بھی دیگر تجاویز اور منصوبوں کی طرح پورے زور و شور سے مسلم ملکوں میں اور خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں جہادی تحریکیں جاری ہیں عملی شکل اختیار کر گئی ہیں۔

امریکہ نہ صرف یہ کہ اسلامی دنیا کے جمہوری اور سیکولر عناصر کو یہ سمجھا چکا ہے کہ سچے مسلمان ان کے اور امریکہ کے مشترکہ دشمن ہیں بلکہ اس نے عملی طور پر جمہوری حکومتوں کو اپنے ساتھ مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے صف میں کھڑا بھی کر لیا ہے یہی وہ سیکولر حکومتیں ہیں جنہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر کر دیا اور اب بھی انھیں صرف اس لیے مار رہی ہیں کہ وہ عملی طور پر شریعت کا نفاذ اور اسلامی زندگی چاہتے ہیں۔ انہی کٹھ پتلی حکومتوں نے لوگوں کے لئے ایسے نظامِ زندگی وضع کیے ہیں جن میں عملی طور پر اسلام کے کوئی خدوخال نہیں پائے جاتے، انہی نے دین کو حکومت اور معاشرتی زندگی میں دخیل ہونے سے محروم کر ڈالا، یہ لوگ معاشرے میں دین کا صرف نام چاہتے ہیں اور جو بھی ان سے عملی اسلام اور نفاذِ اسلام کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ اس کو رجعت پسند، شدت پسند اور تخریب کار جیسے خود ساختہ نام دے کر خاموش کر دیتے ہیں۔

مغرب مسلم ممالک کو حقیقی اور مخلص قیادتوں اور معزز شخصیات سے محروم کر کے ناچ گانے والے مراثیوں، فلمی اداکاروں، کرکٹروں اور کھلاڑیوں کو معاشرے کی معزز شخصیات اور قائدین کی حیثیت سے متعارف کرا رہا ہے اور مغربی میڈیا دن رات ایسی ہی جعلی اور نااہل شخصیات کو اجاگر کرنے

اور ان کی تعریفیں کرنے میں مصروف عمل ہے تاکہ عام مسلمان نوجوان زندگی کے تمام امور میں ایسے ہی لوگوں کی تقلید کریں۔ ان بناوٹی قیادتوں کو کامیاب کرانے اور آگے بڑھانے کے لئے انہوں نے سینکڑوں مختلف کمیٹیاں، کلب، قومی جرگے اور ثقافتی ادارے بنا رکھے ہیں، مغرب کی طرف سے یہ تمام اقدامات اس لیے کیے جاتے ہیں تاکہ نااہل افراد کو معاشرے میں قائدین کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع مل سکے۔

افغانستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جمہوری نظامِ تعلیم اور جمہوریت پسند میڈیا کے ذریعے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کو ایک ایسے رسمی دین کی شکل میں پیش کیا جائے جو معاشرے کی چند رسوم اور قدیم زمانے سے مروج چند غیر مستند باتوں کا مجموعہ ہو اور مزید برآں مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے کہ اسلام اُن کی تہذیب وثقافت کا صرف ایک جزء ہونا چاہیے نہ یہ کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے مطابق عمل کریں، مغرب اور اُن کے دست نگر جمہوریت پسند اخبارات اور چینلز مسلمانوں کی ایک سے ایک اہم سیاسی، اجتماعی، ثقافتی، عسکری اور نظم وضبط سے متعلق ایسی شخصیات کے انٹرویو نشر کرتے ہیں جو بالکل نہ تو اسلام کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلامی دنیا کے مسائل جانتے ہیں بلکہ ایسی نشریات میں کام کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے جن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں مغرب کا پلڑا بھاری دکھایا جائے اور اس کا غلط موقف برحق ثابت کیا جائے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ مغرب کے منتخب کردہ نااہل لوگ معاشرے میں حقیقی قیادت کا مقام حاصل کرسکیں۔

بنیاد پرستوں کے خلاف حملے کا طریقہ کار

"Civil Democratic Islam" ''جمہوری اسلام'' نامی کتاب کی ابتداء میں مغرب اور اس کے سیکولر اتحادیوں کے لئے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا طریقہ مذکور ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں پر ان کے اپنے ہی ملکوں میں حملے کیے جائیں اور ان سے یہ صلاحیت چھین لی جائے کہ وہ

مغرب تک اپنی دعوت اور مسلح جدوجہد لے کر پہنچیں اور اس حملہ کے اخراجات بھی انہیں کے وسائل سے پورے کئے جائیں اور مسلمانوں کو ان کے اپنے ہی اسلحہ کے ذریعے نیست و نابود کر دیا جائے۔ یہ طریقہ کار تین اہم بنیادوں پر قائم ہے۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱) مسلمانوں کو مغرب کے خلاف حملہ آور ہونے کی صلاحیت سے محروم کرنا۔

۲) صوفیا اور تصوف کے دلدادہ لوگوں کو مغرب کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا۔

۳) نئی نسل کی مغربی طرز پر تربیت کرنا۔

'شیریل برنارڈ' اس طریقہ کار کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بنیاد پرست مسلمانوں اور ان کے منصوبوں کی قانونی حیثیت ختم کر کے ان کی صلاحیت چھین لی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن پر اتنے اخلاقی حملے کئے جائیں کہ وہ صرف اپنا دفاع کرنے میں ہی مصروف رہیں اور مغرب کا اخلاقی فساد بھول جائیں''

اسی طرح صوفیا (فلسفی قسم کے جعلی صوفیا) سے فوائد حاصل کرنے کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

''پیر پرستی کو بھرپور اہمیت دی جانی چاہیے۔ وہ ممالک جن کے عوام میں پیر پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے ان کے باشندوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی صوفیانہ تاریخ اور ثقافت پر جمے رہیں اور اپنے نصابِ تعلیم میں صوفیانہ اسلام (نام نہاد پیر پرستی) کو جگہ دیں تا کہ لوگوں میں صوفیانہ اسلام (نام نہاد پیر پرستی) کی دعوت عام ہو جائے۔''

شیریل صوفیا سے متعلق مزید لکھتا ہے:

''صوفیا کا شمار جدت پسندوں (Modernist) میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں آزاد خیال اور اس کی تشریح میں وسعت پسند ہوتے ہیں۔ لہٰذا افغانستان اور عراق کے وہ لوگ جو صوفیانہ مزاج رکھتے ہیں، ان کے نصابِ تعلیم میں صوفیانہ مضامین داخل کر کے انہیں اس کی طرف (پیر پرستی کی طرف) مزید مائل کیا جائے۔ صوفیانہ تحریک اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ اشعار نیز اپنی موسیقی کے ذریعے تمام

مذاہب کے درمیان، ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔"

صوفیا اور تصوف سے فوائد حاصل کرنے کے مذکورہ بالا منصوبے کو افغانستان میں درج ذیل طریقے سے عملی جامہ پہنایا گیا:

امریکہ کے آتے ہی افغانستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں مزارات کا بازار گرم کیا گیا۔ وزارت اطلاعات جو کہ امریکی زیرِ سرپرستی کام کرنے والے شخص "مخدوم رھین" کی زیر سرپرستی تھا، نے شہروں میں صوفیانہ مزارات اور خانقاہیں بنانے پر پوری توجہ دی۔ صوفیاء کے کئی گروہوں نے کابل اور دیگر کئی علاقوں میں اپنے تبلیغی مشن شروع کر دیئے۔ حکومت نے ولایتِ بلخ اور کابل میں "کارتہ سخی" میں مزارات میں ہونے والی مشرکانہ رسومات پر لاکھوں ڈالر خرچ کر ڈالے، ملک بھر کے مزارات میں ملنگی تہذیب، منشیات کا استعمال، موسیقی اور رقص سے سجی ہوئی محفلیں منعقد کرنے کے لئے وسائل فراہم کئے گئے اور یہ سب کچھ عوام کو بدعات و مشرکانہ رسومات پر مشتمل پیر پرستی اور نام نہاد روحانیت کی طرف مائل کرنے کے نام پر انجام دیا جاتا رہا۔ مساجد اور مدارس پر بم برسائے گئے، مدرسین اور طلبہ کو قتل کیا گیا لیکن اس کے برعکس خانقاہیں اور صوفیانہ مزارات آباد کئے جاتے رہے۔

اسی "صوفیانہ اسلام" کو رواج دینے کی غرض سے اقوام متحدہ کے ادارے UNESCO نے سن 2007ء کو مشہور صوفی شخصیت جلال الدین رومی کے سال کے نام سے موسوم کیا اور اس صوفی شخصیت کے فلسفے اور افکار کو موضوع بنا کر یورپ کے کئی شہروں اور (مغربیت کے داعی) مراکز میں اجتماعات کروائے تا کہ لوگوں کے سامنے ان کے صوفیانہ افکار کو حقیقی اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا جائے البتہ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ دنیا میں تصوف دو طرح کا ہے:

ایک وہ تصوف ہے جو لوگوں کو دنیا میں بے رغبتی، خوفِ خدا، اللہ کے ذکر اور پیغمبر کی سنتوں پر عمل پیرا ہونے کا درس دیتا ہے الہٰذا اس طور پر تو ہر مسلمان کو صوفی بننا لازم ہے۔

دوسرا فلسفیانہ تصوف وہ ہے جو کہ وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، حلول، اشراق کا قائل، عبادات

کو یکسر چھوڑنے اور عملی عبادات کو پس پشت ڈال کر صرف دل کی صفائی پر اکتفا کرنے کے مشرکانہ فلسفے پر قائم ہے اور اس کے افکار یہودیت، بدھ مت، اور دیگر تو ہم پرست مذاہب اور فلسفوں میں بھی موجود ہیں۔ ایسے تصوف کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، علمائے حق نے ہمیشہ ایسے تصوف کے خطرے سے امت کو خبردار کیا ہے۔ تاہم مغرب کو یہی تصوف مطلوب ہے کیونکہ صرف یہی تصوف یہودیت، نصرانیت، ہندوازم اور دوسرے باطل ادیان کو اسلام کے مقابلے میں متحد کر سکتا ہے جس کا عملی نمونہ افغانستان میں ہمارے سامنے ہے کہ ان سب فلسفی صوفیوں نے جہاد کے خلاف مل کر ایک متحدہ محاذ بنایا ہوا ہے۔

''عصری تعلیم'' کو اسلام کے خلاف استعمال کرنا

''عصری تعلیم'' کو اسلام کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر کیسے استعمال کیا جائے اور اس کے کون کون سے اچھے نتائج امریکا کے ہاتھ آ سکتے ہیں، شیریل ان کی وضاحت یوں کرتا ہے:

> ''بالغ دیندار لوگوں کو جن کا اسلامی اعمال کے ساتھ دلی لگاؤ ہو، انہیں اپنے زیر اثر لانا اور انہیں اپنے نظریات چھوڑنے پر آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن نئی نسل میں یہ مقصد بڑی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ جمہوری اسلام کا پیغام اور اس کی خود ساختہ تعلیمات کو نصابِ تعلیم میں شامل کر دیا جائے۔''

آگے چل کر اس راستے میں آڑے آنے والی رکاوٹوں کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''لیکن اس میدان میں بھی بنیاد پرستوں نے اپنا تسلط جمانے کے لئے کافی کام کیا ہوا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی سخت لڑائی کے بغیر اس میدان کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہونگے لہٰذا مناسب ہے کہ جتنی قوت کے ساتھ بنیاد پرست اس میدان پر مسلط ہیں، ہم بھی اسی طرح زور لگا کر کام کریں یہاں تک کہ ان سے یہ میدان پورے کا پورا چھین لیں۔''

تعلیم کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے سلسلے

میں ''رینڈ کارپوریشن'' (Rand corporation) بڑی باریک بینی کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں مصروف کار ہے، مثال کے طور پر:

☆ امریکہ نے افغانستان پر قبضہ جماتے ہی ایک مہینے کے اندر پورا نصابِ تعلیم تبدیل کرڈالا، مجاہدین اور طالبان دور کا وہ نصاب جو تجرباتی اور سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ دین سکھانے کا بھی کفیل تھا، اسے یکسر ہٹایا دیا اور اس کی بجائے امریکا کے ادارے ''نبراسکا'' (Nibraska) کی طرف سے مرتب کردہ نصاب لاگو کیا گیا۔ نئے تعلیمی نصاب سے جہاد، ہجرت اور کافروں کے ساتھ دشمنی اور قتال پر مشتمل تمام مضامین نکال دیے گئے اور ان کی جگہ صلح، باہمی رواداری، حالاتِ حاضرہ اور دہشت گردی کے خلاف جدوجہد پر مشتمل موضوعات نصاب میں شامل کردیئے گئے۔

امریکا نے ''نبراسکا یونیورسٹی'' میں افغانستان کے تعلیمی امور پر بحث وتحقیق کرنے کے لئے جو مرکز بنایا تھا اسے وہاں سے افغانستان منتقل کردیا اور وزارتِ تعلیم کے تمام امور کی نگرانی اِسی مرکز اور دیگر امریکی تعلیمی مراکز کے ذمہ دار افراد کو سونپ دی۔

امریکی سفارت خانے نے کئی بار افغان اساتذہ اور معلمات کو اس غرض سے امریکا بھیجا کہ وہ امریکی تعلیم وتربیت کے طور طریقے اور مقاصد سے آگاہ ہوجائیں۔ اساتذہ کی مغربی طرز پر تربیت کرنے کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ تعلیمی نصاب کو اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی کرنے کے لئے کابل کے قریب سینکڑوں یورپی اور امریکی ادارے مختلف شکلوں میں مصروف کار ہیں۔ جن میں چند کا تعارف درج ذیل ہے:

امریکی اور یورپی این جی اوز کا تعارف

☆ آغا خان کی تعلیمی خدمات کا مرکز (AKES)

☆ آغا خان کی ثقافتی خدمات کا مرکز (AKTC)

☆ افغانستان کے تعلیمی اسکالرشپ کی بنیاد (FSA)

☆ افغان ترک تعلیمی خدمات کا ادارہ (ATCE)

☆ افغانستان کا انکشافی اور تربیتی مرکز (AITM)

☆ افغانستان کا پرائمری ایجوکیشن پروگرام (APEP)

☆ تعلیمی اور خدماتی ادارہ برائے افغان خواتین (AWSE)

☆ افغان بچوں کے لئے تعلیمی اور تربیتی نمائش (MMCC)

☆ انسانی حقوق کا تربیتی مرکز برائے افغان خواتین (THRC)

☆ B.B.C کا یومیہ تربیتی پراجیکٹ (BBC.AEP)

☆ تعلیمی ترقی کی اکیڈمی (ACD)

☆ تعلیم حاصل کرنے کا مشاورتی ادارہ (ATC)

☆ سرف کا تربیتی اور ھنگامی امدادی مرکز (SRVE)

☆ سی آئی سی کا یک روزہ تربیتی مرکز (CIC.ETC)

☆ تعلیم ریسرچ سینٹر (EDC)

☆ تعلیمی مرکز برائے افغانی خواتین (AWEC)

☆ میڈی کا مرکز برائے تعلیمی تعاون (MESAA)

یہ تمام وہ ادارے ہیں جو افغانستان میں یورپی اور امریکی اداروں کی طرف سے تعلیم کے میدان میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور یہ تمام اجتماعی شکل میں افغانستان میں نصابِ تعلیم، تعلیمی ماحول، ثقافت اور دیگر اہداف کو مغربی جامہ پہنانے کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔

امریکہ کے آتے ہی تعلیمی نصاب میں تبدیلی

افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے آنے کے بعد تعلیمی نصاب میں کئی بار تبدیلی کی گئی:

☆ سب سے پہلے تو دورِ جہاد کا وہ نصاب یکسر ختم کیا گیا جو اسلامی نظریے کی بنیادوں پر قائم تھا۔

اس نصاب کو نکال کر ایک ایسا نصاب مرتب کیا گیا جس میں جہاد اور امت کے دفاع سے متعلق مضامین کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور نصاب بنایا گیا جو مکمل طور پر غیر اسلامی مضامین پر مشتمل تھا اس نصاب میں ایسے گھٹیا اور لایعنی مضامین شامل کیے گئے جو نئی نسل کو اسلامی روح اور عقائد سے غیر شعوری طور پر دور کرتے ہیں اور انہیں مغرب کی سوچ، ان کے اخلاق اور اجتماعی نظریات وافکار سے مانوس کراتے ہیں، اہل مغرب کے بنیادی افکار مثلاً سیکولرازم، لبرل ازم، انسانی حقوق، کفر اور کفار سے نفرت نہ کرنا، کافروں کے ساتھ ایک ہی معاشرے میں پرامن زندگی گزارنا اور دیگر کئی مغربی افکار کو بڑی مہارت اور ہوشیاری کے ساتھ مرحلہ وار نئے نصاب میں جگہ دی گئی اور اس کے ضمن میں وہ تمام مفاہیم کتابوں سے نکال دیے گئے جو زمانۂ جہاد میں اس مقصد کی خاطر شاملِ نصاب کیے گئے تھے کہ آنے والی نسل اسلام پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

اپنے مذکورہ بالا مدعا کو ثابت کرنے کے لئے نمونے کے طور پر قدیم نصاب اور امریکہ کی نگرانی میں بنائے گئے نصاب کے درمیان تقابل پیش کیا جاتا ہے۔ جو کہ بچوں کی پہلی جماعت کی پشتو کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

قدیم وجدید نصاب کا تقابل

زمانۂ جہاد کا نصاب	کرزئی کے دور کا نصاب
(الف)	(الف)
اللہ ایک ہے محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔	اللہ ایک ہے ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔

تبصرہ: ''محمد اللہ کے رسول ہیں'' کا جملہ جو کہ کلمہ طیبہ کا دوسرا جزو ہے، موجودہ نصاب سے نکال دیا گیا۔

(ب)	(ب)
بابا	بہادر
بابا قرآن شریف پڑھتا ہے۔	بہادر کباب کھاتا ہے۔
قرآن شریف اللہ کی کتاب ہے۔	بابا بھی کباب کھاتا ہے۔

تبصرہ: قرآن اوراس کی تلاوت کو نکال دیا گیا۔ "قرآن شریف کو اللہ کی کتاب سمجھنا" بھی نکال دیا گیا۔

(پ)	(پ)
پاک	پوپ (ایک شخص کا نام)
میں اپنے کپڑے پاک رکھتا ہوں۔	پوپ کے پاس گیند ہے، وہ اس سے کھیلتا ہے،
پاکیزگی اچھی خصلت ہے۔	پوپ کی گیند سفید ہے

تبصرہ: پاکیزگی کی ترغیب دینے کی بجائے گیند کی طرف شوق دلانے کا مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

(ت)	(ت)
تلوار	ترازو
احمد تلوار رکھتا ہے۔ تلوار سے جہاد کرتا ہے۔	یہ ترازو ہے۔ ترازو سے تولتے ہیں۔ توت بیچنے والا توت تولتا ہے۔

تبصرہ: تلوار اور جہاد کا درس یکسر پس پشت ڈال دیا گیا۔

(ٹ)	(ٹ)
ٹوپک (بندوق)	ٹال (جھولا)
میرے ماموں کے پاس بندوق ہے۔	خاتول (نامی بچی) جھولا جھولتی ہے
وہ بندوق سے جہاد کرتے ہیں۔	خٹک (نامی لڑکا) خاتول کا بھائی ہے۔

تبصرہ: بندوق اور جہاد کا درس ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ ایسے جملے لائے گئے جن میں کوئی نظریاتی پیغام موجود نہیں۔

(ث)	(ث)
ثواب	ثور (ایک برج کا نام)
بیمار کی عیادت کرنا ثواب کا کام ہے۔	ثور موسم بہار کا دوسرا مہینہ ہے۔ ثور میں پھول کھلتے ہیں۔
میں ثواب کے کام کرتا ہوں۔	کوثر باغیچہ میں پھول لگاتی ہے۔

تبصرہ: بیمار کی عیادت اور ثواب والے کام جو کہ دینی مفاہیم ہیں اور نظریاتی درس دیتے ہیں انہیں نکال دیا گیا۔

(ج)	(ج)
جہاد	جالہ وان (ملاح)
جہاد فرض عین ہے۔ احمد جہاد کے لئے گیا ہے۔	یہ کشتی ہے، سراج ملاح ہے، کشتی مشکیزوں سے بنتی ہے
سو میں بھی جہاد کے لئے جاؤنگا۔	

تبصرہ: جہاد کرنے اور اس کی فرضیت کا درس دینے کو ملاح کے تذکرے سے تبدیل کر دیا گیا۔

(چ)	(چ)
چمن	چمن
یہ چمن ہرا بھرا ہے۔ چمن میں پھول کھلتے ہیں۔	چمن (نامی شخص) اخروٹ لایا۔ کوچی توت اور اخروٹ
ہم چمن کے پھول نہیں توڑتے۔	کھاتا ہے۔ چمن کو شہد کی مکھیوں سے محبت ہے۔

تبصرہ: چمن کے پھول نہ توڑنے کا مفہوم بچوں کے لئے اخلاقی اعتبار سے ایک اہم درس ہے جبکہ توت اور اخروٹ کھانا جس میں کوئی اخلاقی مفہوم مضمر نہیں، کو ترجیح دے کر اُسے نکال دیا گیا۔

(ح)	(ح)
حج	حج
میرا چچا حج کرنے جا رہا ہے۔ حامد کا والد حاجی ہے۔ حج کرنا فرض ہے۔	ذبیح حج کرنے جا رہا ہے۔ جمال کا چچا حاجی ہے۔ حج کرنا فرض ہے۔

تبصرہ: دونوں قسم کی مثالیں ایک جیسی ہیں۔

(خ)	(خ)
خدا	خیمہ
خدا ایک ہے۔ میں خدا کا بندہ ہوں۔ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔	خانہ بدوش خیمہ رکھتے ہیں۔ خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

تبصرہ: اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی بندگی اور اُس پر ایمان لانے کا درس نکال کر خانہ بدوش کی زندگی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(د)	(د)
دین	دکان
اسلام ہمارا دین ہے۔ میں اپنے دین پر سر قربان کرتا ہوں۔ روسی اور دیگر تمام کفار ہمارے دین کے دشمن ہیں۔	ودود کی ایک دکان ہے۔ دکان میں وہ چیزیں بیچتا ہے۔ اور اس سے ودود کو سہارا ملتا ہے۔

تبصرہ: دین اسلام، دین پر جان دینا، دین کے دشمنوں کو پہچاننا ایسی باتیں ہیں جن میں کئی اہم درس موجود ہیں لیکن ایسی مفید چیزوں کی بجائے دکان (اور دنیا کمانے) کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ذ)	(ذ)
ذکر	آذان
میں اللہ کا ذکر کرتا ہوں۔ مسلمان اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اللہ کے ذکر پر ثواب ملتا ہے۔	ملا آذان دیتا ہے۔ ذکی مسجد جاتا ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتا ہے۔

تبصرہ: دونوں میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں۔

(ر)	(ر)
روزہ	ریوڑ
روزہ رکھنا فرض ہے۔ ہم سال بھر میں ایک مہینہ روزہ رکھتے ہیں۔ روزہ صحت کے لئے فائدہ مند ہے۔	کوثر کا ایک ریوڑ ہے۔ اس کا ریوڑ پہاڑ میں چرتا ہے۔ وہ ریوڑ سے دودھ حاصل کرتا ہے۔

تبصرہ: روزے کی فرضیت، روزہ رکھنا اور اس سے جسمانی فائدہ ہونا اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے جس کو چھوڑ کر ریوڑ اور پہاڑ کی باتیں شامل کی گئی ہیں۔

(ز)	(ز)
زکوۃ	زرگر (سنار)
زکوۃ مسلمان پر فرض ہے۔ زکوۃ مال میں برکت پیدا کرتی ہے۔ زکوۃ غریبوں کو دی جاتی ہے	میرا بیٹا سنار ہے۔ سنار سونے سے زیورات بناتا ہے۔ گردیز میں اس کی زیورات کی دوکان ہے۔

تبصرہ: زکوۃ کی فرضیت، زکوۃ کی وجہ سے مال میں برکت آنا اور ناتواں لوگوں کو زکوۃ دینے کے دینی درس نکال دیے گئے اور ان کی بجائے سنار، سونے اور زیورات کی باتیں شامل کی گئیں ہیں نیز پہلی جماعت کے بچے کے حق میں یہ ایک غیر معقول اور بے محل جملہ ہے کہ وہ یہ کہے کہ میرا بیٹا سنار ہے۔

(س)	(س)
سبق	ساگ (ایک سبزی)
میں مدرسہ میں سبق پڑھتا ہوں۔ استاذ ہمیں سبق پڑھاتے ہیں، میں نے قرآن شریف کا سبق یاد کرلیا ہے۔	ہم بازار سے ساگ لایا، بسم اللہ نے ساگ دھو کر صاف کیا، ساگ صحت کے لیے فائدہ مند ہے۔

تبصرہ: مدرسہ، سبق پڑھنا، استاذ کا بچوں کو سبق پڑھانا اور قرآن کا سبق یاد کرنا تمام دینی مفاہیم کے درس ہیں۔ جنہیں نکال کر ان کی بجائے ساگ کی باتیں رکھی گئی ہیں۔

(ص)	(ص)
صداقت (سچائی)	صندلی[۱]
سچائی اچھی عادت ہے۔ سچا انسان ہر کسی کو پسند ہوتا ہے۔ مسلمان سچا ہوتا ہے۔	ہم موسم سرما میں صندلی رکھتے ہیں، بصیر لوگوں کی صندلی گرم ہے۔

تبصرہ: سچائی، سچا انسان، مسلمان مرد جیسی عبارتیں جو کہ اسلامی روح رکھتی ہیں، کو نکال کر ان کی بجائے سردی میں جسم کے گرم کرنے کی باتیں شامل کی گئی ہیں۔

(ض)	(ض)
ضرر	حوض
کسی کو ضرر پہنچانا گناہ ہے۔ اچھا لڑکا کسی کو ضرر نہیں پہنچاتا۔ مسلمان بے ضرر ہوتا ہے۔	ہمارے باغ میں ایک حوض ہے۔ یہ حوض افضل نے بنایا ہے۔ ضمیر حوض میں تیرتا ہے

تبصرہ: ضرر پہنچانے کا ایک گناہ کی حیثیت سے تعارف کروانا، اچھے لڑکے کا کسی کو ضرر نہ پہنچانا،

---

(۱) آگ پر میز رکھ کر اس پر لحاف ڈالا جاتا ہے جس میں پاؤں داخل کر کے جسم کو گرم کیا جاتا ہے۔

مسلمان کا ضرر رساں نہ ہونا اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بچوں کے لئے حوض اور اس میں تیرنے کی نسبت بہتر ہے لیکن یہاں انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(ط)

طالب

میرا بھائی مدرسے کا طالب علم ہے۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ طارق بن زیاد اسلام کا ایک نامی گرامی مجاہد ہے۔

(ط)

طوطا

یہ طاہر کا طوطا ہے۔ طاہر طوطے سے بات کرتا ہے۔ درزی کا طوطا سیٹی بجاتا ہے۔

تبصرہ: طالب علم، مدرسہ، علم کی فرضیت اور طارق بن زیاد کو مشہور مجاہد سمجھنا سب کے سب دینی باتوں پر مشتمل نفع بخش درس تھے۔ جنہیں چھوڑ کر طوطے اور سیٹی بجانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی درس کے صفحہ پر ڈھول کی تصویر بھی دی گئی ہے جو کہ موسیقی کا ایک آلہ ہے۔

(ظ)

ظریف

ظریف پاک وصاف رہتا ہے۔ صفائی ایمان کا حصہ ہے۔ صفائی صحت کے لئے نفع بخش ہے۔

(ظ)

منظر

یہ محفوظ کے گاؤں کا منظر ہے۔ ہمارے وطن کا منظر بہت خوب ہے۔ خوبصورت منظر ہر کسی کو پسند ہوتا ہے۔

تبصرہ: صاف رہنا، صفائی کا تعارف ایمان کے ایک جزو کی حیثیت سے کرانا، صحت کے لئے صفائی کا نفع بخش ہونا یقینی طور پر اخلاقی اعتبار سے بچوں کے لئے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ان کے سامنے منظر کی وضاحت کی جائے، لیکن کرزئی کے نصاب میں ان سب کو نکال دیا گیا ہے۔

(ع)	(ع)
علم	ساعت (گھڑی)
علم سیکھنا مسلمان پر فرض ہے۔ ہم مدرسہ اور مسجد میں علم سیکھتے ہیں۔ علم کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے۔	یہ گھڑی ہے۔ گھڑیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ عبداللہ گھڑی ساز ہے۔

تبصرہ: علم حاصل کرنے کی فرضیت، مدرسہ اور مسجد کو علم حاصل کرنے کی جگہ سمجھنا اور جہالت کی زندگی کو مشکل سمجھنا دینی تعلیمات ہیں، جنہیں نکال دیا گیا ہے۔ اس سے کرزئی حکومت کی علم، فرض، مسجد اور مدرسے سے عداوت واضح معلوم ہو سکتی ہے۔

(ف)	(ف)
فرمان	فٹ بال
قرآن شریف اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ہم اللہ کا فرمان مانتے ہیں۔ مجاہدین اپنے مسلمان امیر کا فرمان مانتے ہیں۔	فواد اور غفور فٹ بال کھیلتے ہیں۔ وہ فٹ بال کے شوقین ہیں۔ فٹ بال کھیلنا صحت کے لیے فائدہ مند ہے

تبصرہ: قرآن شریف کو اللہ تعالیٰ کا فرمان سمجھنا، اللہ کے فرمان کو ماننا اور مجاہدین کا اپنے مسلمان امیر کے فرمان کی اطاعت کرنا سب دینی مفاہیم ہیں۔ جنہیں نکال دیا گیا ہے۔

(ق)	(ق)
قلم	قلم
میرا قلم نیا ہے۔ میں بڑے شوق سے خط لکھتا ہوں۔ مقیم اور فقیر آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔	عبدالقدیم سبق پڑھتا ہے۔ وہ قلم سے لکھتا ہے۔ مقیم سبق میں بہت قابل ہے۔

تبصرہ: کوئی خاص فرق نہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس مثال میں زمانہ جہاد کے نصاب کے درس

میں کوئی ایسا خاص دینی پیغام نہ تھا جس کو نکالنے کی ضرورت پیش آتی۔

(م)

مجاہد

افغانستان کے مسلمان مجاہدین ہیں، مجاہدین کافروں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں۔ کافروں کے ساتھ جہاد کرنا فرض ہے۔ میرے چچا جہاد کے لیے جاتے ہیں۔

(م)

ماں

میری ماں کپڑے سیتی ہے۔ ماں کا اولاد پر حق ہے۔ میں ماں کا احترام کرتا ہوں۔

تبصرہ: افغانستان کے مسلمانوں کو مجاہدین سمجھنا، کافروں کے ساتھ جہاد کرنا کافروں کے خلاف جہاد فرض ہونا اور چچا کا جہاد کے لئے جانا سب جہادی اسلامی مناہیم ہیں جنہیں یکسر ختم کر دیا گیا۔

(ن)

نام

میں اپنا نام لکھ سکتا ہوں۔ ہمارے پیغمبر کا نام حضرت محمد ﷺ ہے۔ ہماری جماعت کے سارے طالب علم اپنا نام لکھ سکتے ہیں۔ کسی کو توہین آمیز اور برے نام سے پکارنا گناہ ہے

(ن)

نارنج

مجھے نارنج پسند ہے۔ نارنج بہت اچھا پھل ہے۔ ننگرہار میں نارنج زیادہ پیدا ہوتا ہے۔

تبصرہ: پیغمبر پاک ﷺ کا نام، توہین آمیز اور برے نام سے پکارنے کا گناہ ہونا اسلامی مفاہیم ہیں جن کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

همزه (ء)

قراءت

میں روزانہ صبح کے وقت قرآن کریم کی تلاوت سنتا ہوں۔ ہم قرآن کریم کی تلاوت کے وقت بات چیت نہیں کرتے، قرآن کریم کی تلاوت سننا ثواب کا کام ہے۔ ہم اب پشتو اور فارسی کتاب پڑھ سکتے ہیں

همزه (ء)

جدید نصاب میں ہمزہ کا درس ہی ذکر نہیں کیا گیا اور نہ اس کی پہچان کے لئے کوئی جملہ ذکر کیا گیا ہے۔

تبصرہ: قدیم نصاب میں ہمزہ کا پورا درس جو کہ اسلامی آداب پر مشتمل تھا، حذف کرا دیا گیا ہے۔

طالبان دور کے نصابِ تعلیم اور کرزئی حکومت کے نصاب کے درمیان تقابلی جائزے کی جو مثالیں اب تک پیش کی گئی ہیں یہ وہ درس ہیں جو کہ اسلامی تعلیمات اور مفاہیم پر مشتمل تھے اور کرزئی حکومت کے نصاب میں اس میں تبدیلی کر کے ان سے اسلامی روح کو ختم کر دیا گیا اب وہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہونے کی بناء پر یکسر مٹا دی گئیں اور ان کی جگہ کوئی متبادل مضمون بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

اسلام

اسلام تمام ادیان میں سب سے بہتر دین ہے۔ ہم اسلام کے مبارک دین کے پیروکار ہیں۔ حضرت محمد ﷺ اسلام کے پیغمبر اور مسلمانوں کے بڑے پیشوا ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسلام کے ایک بڑے عالم اور مجاہد تھے۔ ہم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر ہیں۔

مسواک

مسواک کرنا سنت ہے۔ مسواک کا استعمال کرنا صحت کے لئے مفید ہے۔ مسواک دانتوں کو

صاف کرتی ہے۔ اور انسان کو بیماری سے بچاتی ہے۔ جو شخص مسواک نہیں کرتا اس کا منہ بدبودار ہوتا ہے۔ لوگ اُس سے گھن کھاتے ہیں۔ اور وہ کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

سلام کرنا

سلام کرنا سنت ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ دوسرے مسلمان کو سلام کرے، جو بھی سلام کرے اس کا جواب دینا چاہئے۔ کیونکہ سلام کرنا باہمی محبت پیدا کرتا ہے۔ نوجوانوں نے کل اپنے والد سے کہا: السلام علیکم

والد نے کہا: وعلیکم السلام۔ شاباش بیٹے ہمیں چاہئے کہ بڑوں اور چھوٹوں سب کو سلام کریں۔ آج جب استاذ درسگاہ میں آئے تو سب کو سلام کیا اور سبق شروع کیا۔

اتحاد

باہمی اتحاد و اتفاق اچھا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متحد رہنے کا حکم دیا ہے اور بے اتفاقی سے منع کیا ہے کیونکہ اتفاق کے ذریعے سے مسلمانوں کی آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ افغانستان کے مجاہدین متفقہ طور پر جہاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے تمام مسلمانوں کو متحد رکھے۔ آمین۔

اب ہم قدیم نصاب کے بعض وہ عنوانات پیش کریں گے جو کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھے لیکن کرزئی حکومت کے نصاب میں ان کے بالمقابل وہ مضامین رکھے ہیں جو کہ ان تعلیمات سے خالی ہیں:

قدیم نصاب

ہماراوطن

نغانستان ہمارا پیاراوطن ہے۔ کابل ہمارے وطن کا ارالحکومت ہے۔ ہمارے وطن میں بڑے بڑے شہر ین۔ اس کی آب وہوا بہت عمدہ ہے۔ روسیوں نے مارے وطن پر حملہ کیا ہے۔ افغانستان کے مجاہد سلمان حملہ آوروں سے جہاد کررہے ہیں۔ دین اور طن کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے۔

کرزئی دور کا نصاب

ہماراوطن

ہماراوطن بہت خوبصورت ہے۔ اس میں بہت سے جنگل اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ اس کے خوبصورت دروں میں دریا بہتے ہیں، اس کی زمین غلہ پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اس میں کئی عمدہ معدنیات ہیں۔ ہماراوطن ایک مخلوط اور مشترک گھر کی طرح ہے۔ تو آیئے اپنے اس وطن کی تعمیر کریں۔ خدا کرے ہمارا پیارا افغانستان آباد رہے۔

تبصرہ: کرزئی دور کے نصاب سے وہ اسلامی کلمات اور مفاہیم نکال دیئے گئے جو پڑھنے والے و اسلامی روح بخشتے ہیں یعنی مسلمانوں کا بیرونی حملہ آوروں سے جہاد کرنا، دین ووطن کی حفاظت، جہاد کی فضیلت وغیرہ کی بجائے درودیوار تعمیر کرنے کی باتیں کی گئی ہیں اور اپنے وطن کو آزاد کرانے کی بات کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے جوکہ ان تمام باتوں سے زیادہ اہم ہیں۔

باہمی تعاون

بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ جو بھی کسی بے سہارا کو دیکھے اُسے چاہئے کہ اُس کی مدد کرے۔ باہمی تعاون سے مسلمانوں کے درمیان محبت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی غریب اور بے سہارا کی مدد کریں گے تو اللہ اور اس کے رسول ہم سے راضی ہونگے اور اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اللہ اور اس کے رسول ناراض ہونگے۔ اسی طرح ہمیں چاہیے کہ گھر کے کاموں میں بھی اپنے والدین بھائیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ تعاون کریں۔

باہمی تعاون

تمام بچے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ ہر کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ باہمی تعاون کے ساتھ ہر کام اچھی طرح تکمیل تک پہنچتا ہے۔ بچے اجتماعی کام میں ایک دوسرے سے کام کرنے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں۔

تبصرہ: مذکورہ بالا درس کا مضمون تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مذکورہ اسلامی اصطلاحات بھی حذف کر دی گئی ہیں جو دین اسلام کی پہچان ہیں۔ مثلاً مسلمان، دینی ذمہ داری، مسلمانوں میں باہمی محبت، اللہ جل جلالہ، پیغمبر ﷺ اور اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی وغیرہ

مذکورہ بالا حذف اور تبدیلی کے علاوہ اور بھی کئی مضامین قدیم نصاب سے کلی طور پر حذف کر دیے گئے ہیں اور ان کی بجائے ایسے مضامین شاملِ نصاب کیے گئے ہیں جو ظاہری طور پر صرف دنیوی نفع رسانی پر مشتمل ہیں اور اس میں ضرر اور تخریب کاری (جہاد) کا کوئی گوشہ نہیں۔

درحقیقت ایسے مضامین مغربی فلسفے کو لاگو کرنے کے لئے ایک مقدمہ اور نئی نسل کی ذہن سازی کے طور پر نصاب میں داخل کیے گئے ہیں۔

ذیل میں ایسے ہی مضامین کے چند اور نمونے ذکر کیے جاتے ہیں۔

قدیم نصاب کے متروک مضامین	جدید نصاب کے نئے شامل کردہ مضامین
بیمار کی عیادت	انسانیت
بیمار کی عیادت ہر مسلمان پر لازم ہے۔ جو بیمار کی بیمار پرسی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بہت ثواب دیتے ہیں۔ کل میرے والد بریالی چچا کی عیادت کے لئے گئے تھے۔ اور اُن کے لئے ڈاکٹر سے دوا لے کر آئے تھے۔ بریالی چچا بہت اچھے شخص ہیں۔ پنج وقتہ نماز کے پابند ہیں۔ اگر مسجد میں کوئی مسافر آجائے تو اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ راستے سے کانٹا، پتھر اور دوسری ضرر رساں چیزیں ہٹاتے ہیں اور اگر کوئی بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرنے جاتے ہیں۔	انسان ہونے کے ناطے تمام لوگ برابر ہیں۔ ہر انسان عزت نفس رکھتا ہے۔ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر فوقیت حاصل نہیں۔ تاہم وہ انسان دوسروں سے بہتر ہے جس کی عادات اچھی ہوں، اچھے کام کرنے والا ہو اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا ہو۔

تبصرہ: جدید نصاب کا درس ظاہری اعتبار سے تو بالکل بے ضرر دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں یہ مؤمن اور کافر کے درمیان فرق ختم کرنے کی بنیاد پر قائم ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو یہ تاثر دیتا ہے کہ مؤمن اور کافر ایک ہی طرح کے حقوق اور حیثیت رکھتے ہیں اور مغربی دنیا کے نزدیک فلسفۂ انسانیت (ھیومنزم) کا مرکزی مفہوم بھی یہی ہے۔

مدرسہ

مدرسہ علم وادب سیکھنے کی جگہ ہے۔ ہم روزانہ مقررہ وقت پر مدرسہ جاتے ہیں۔ جب گھنٹی بجتی ہے تو اپنی اپنی کلاس میں جاکر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ جب استاذ درسگاہ میں آجاتے ہیں تو ہم سب ان کے احترام میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔

صبر

کبھی کبھی بچے آپس میں جھگڑتے ہیں۔ بچوں کو چاہئے کہ لڑائی جھگڑے کے موقع پر صبر کریں اور آپس میں بات چیت کے ذریعے جھگڑے کا تصفیہ کیا کریں اور اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ کیا جھگڑے سے یہ مسئلہ حل ہوگا؟ کیونکہ جھگڑا کرنے سے اچھے تعلقات کو نقصان پہنچتا ہے اور باہمی دوستی بھی متاثر ہوتی ہے۔

تبصرہ: یہ مضمون بھی گذشتہ مضمون کی طرح مغرب کے فلسفے ''برداشت''(Tolerence) کی تلقین کرتا ہے اور اشارہ اس طرف ہے کہ مسلمان مغرب کے مظالم کے مقابلے میں برداشت سے کام لیں اور جہاد کی بجائے صرف مذاکرات اور بات چیت کی طرف توجہ دیں۔

مہمان نوازی

مسلمان مہمان نوازی میں اچھے ہیں۔ ہم نے مہمان نوازی حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سیکھی ہے ہم مہمان کے آنے پر خوش ہوتے ہیں، مہمان کی عزت کرنا بہت ثواب کا کام ہے۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مہمان کی عزت کرے اللہ جل شانہ نے مہمان کی عزت کا حکم دیا ہے۔

صحت مند آدمی

صحت مند آدمی جب بھی نیند سے بیدار ہوتا ہے ورزش کرتا ہے۔ وہ معمولی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتا۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ زندگی میں خوشحالی اور صحت ہو۔ صحت مند آدمی نہ صرف

اپنی ذات بلکہ اردگرد کو بھی صاف ستھرا رکھتا ہے، صحت مند آدمی فروٹ اور دیگر غذائی اشیاء پانی سے اچھی طرح دھوتا ہے اور پھر کھاتا ہے صفائی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔

تبصرہ: یہ سبق یقیناً نفع بخش مفاہیم پر مشتمل ہے لیکن سبق کے پہلے جملے میں بہت مہارت کے ساتھ طلبہ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد جو سب سے پہلے کرنے کا کام ہے وہ ورزش ہے نہ کہ وضو اور نماز حالانکہ ایک مسلم معاشرے کے نصابِ تعلیم میں طلبہ کے دلوں میں یہ تصور بٹھانا ضروری ہے کہ نیند سے اٹھنے کے بعد سب سے پہلے انسان دعا پڑھے پھر وضو کر کے باجماعت نماز ادا کرے اس کے بعد ورزش کرے۔

مجاہد کا بیٹا

زیمی مجاہد کا بیٹا ہے، زیمی نے اپنی ماں سے پوچھا کہ میرے والد کہاں گئے ہیں؟ والدہ نے کہا بیٹا آپ کے والد جہاد پر گئے ہیں، بیٹے نے پوچھا کہ کس کے مقابلے میں جہاد کرتے ہیں؟ والدہ نے کہا روسیوں اور ان کے مزدوروں کے مقابلے میں۔ زیمی نے پوچھا روسیوں کے مزدور کون ہیں؟ والدہ نے کہا! ردسیوں کے مزدور 'خلق' اور 'پرچم پارٹی' کے لوگ ہیں۔ بیٹے نے کہا میں بھی اُسی باپ کا بیٹا ہوں جس نے اپنے دین اور وطن کو آزاد کرنے کے لئے اپنا سر ہتھیلی پر رکھا ہے، ماں یہ ہمارا اسلامی فریضہ ہے کہ ہم اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلیں اور اپنے سر کو اللہ جل شانہ کے دین کے لئے قربان کریں، اپنے وطن کو ردسیوں اور ان کے مزدوروں سے پاک کریں اور اسلامی شریعت نافذ کریں۔

بڑی شوریٰ

بڑی شوریٰ ہمارا ایک پرانا رواج ہے شوریٰ کی آواز لوگوں کی آواز ہوتی ہے۔ بڑی شوریٰ میں لوگوں کے اجتماعی مسائل کا حل نکالا جاتا ہے۔ بڑی شوریٰ کے فیصلوں کو ہر شخص اچھی نظر سے دیکھتا ہے اور انہیں مانتا ہے۔

تبصرہ: امریکہ کے ہاتھوں بنا ہوا موجودہ خودساختہ نظام اور بنیادی قوانین، نام نہاد قومی جرگہ کی

طرف سے سامنے لایا گیا ہے اور جرگہ سے اس کی توثیق کروائی گئی ہے، چونکہ مجاہدین بڑی شوریٰ کے (غیر اسلامی) فیصلوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ملک میں بڑے پیمانے پر جہاد کو اپنی لازوال قربانیوں کی بدولت وجود بخشا ہے اسلئے صلیبی دشمن کی کٹھ پتلی حکومت تعلیمی نصاب کے ذریعے ملک کی نئی نسل کے دلوں میں یہ تصور بٹھانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں کہ قومی جرگہ کے فیصلوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اور دل و جان سے انہیں ماننا چاہئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے تمام دینی اور دنیوی مسائل کا حل اسلامی شریعت ہی میں ہے نہ کہ قومی جرگہ کے فیصلوں میں۔

اسلامی ترانہ

اسلام ہمارا دین ہے، ہم اس کے شیدائی ہیں، ہم مسلمان ہیں ہم مسلمان ہیں، ہمارا رب ایک اللہ ہے جو ہر کام پر قادر ہے، بے مثال با اختیار ہے، اس بات پر شکر ہے کہ ہم محمد ﷺ کے امتی ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ عظیم کتاب قرآن ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ شکر ہے کہ ہم محمد آخر الزمان ﷺ کے امتی ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہمارا مددگار رب ذوالجلال ہے، ہمارا مددگار رب ذوالجلال ہے، ہم اس مشعلِ حق کی طرف روانہ ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہم مسلمان ہیں۔

کبوتر

کاش میں کبوتر ہوتا
میری کمر چت کبری ہوتی
پتھر پر بیٹھا ہوتا
بہت تیز نظر ہوتا
پاؤں میرے سونے کے ہوتے
زندگی میری بے خطر ہوتی

تبصرہ: اسلامی ترانے کی جگہ ایک ایسی نظم لانا جس میں نہ تو کوئی دینی یا اخلاقی فائدہ ہے اور نہ ہی اجتماعی یا ادبی فائدہ۔

شعار

۱۔ اللہ کی رضا ہمارا مقصود ہے۔
۲۔ محمد ﷺ ہمارا رہبر ہے۔
۳۔ قرآن کریم ہمارا دستور ہے۔
۴۔ برے کاموں سے اجتناب کرنا اللہ جل شانہ کا حکم ہے۔
۵۔ اللہ کی راہ میں جہاد ہمارا راستہ ہے۔
۶۔ اللہ کی راہ میں نصرت اور شہادت ہماری آرزو ہے۔
۷۔ شرعی حجاب ہمارا ناموس ہے۔
۸۔ استقلال ہماری عزت ہے۔
۹۔ اسلامی دنیا کی وحدت ہماری آرزو ہے۔

برے کام

سگریٹ۔ نسوار۔ چرس اور دیگر نشہ آور چیزیں استعمال کرنا صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔ کبھی کبھی ایسے برے اعمال انسان کی موت کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ برے اعمال اقتصاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

تبصرہ: مندرجہ بالا سبق میں نشہ کرنا برا کام شمار کیا گیا ہے جو حقیقتاً برا کام ہے لیکن شراب جوام الخبائث ہے اور مغرب نے سارے افغانستان کو اس سے رنگ دیا ہے، لاکھوں کو اس کا عادی بنا دیا ہے اس کا نام تک نہیں لیا گیا۔ اس کا مقصد طلبہ کو غیر شعوری طور پر یہ تأثر دینا ہے کہ شراب نوشی کوئی برا عمل نہیں ہے اور اس میں کوئی نقصان بھی نہیں۔

یہ تبدیلیاں صرف وہ ہیں جو پہلی جماعت کے نصاب میں لائی گئی ہیں اس کے علاوہ جو تبدیلیاں بڑی جماعتوں کی کتابوں میں لائی گئی ہیں وہ اس سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں۔

افغانستان کے لئے ہندوستان کی تعلیمی اور ثقافتی خدمات

ایک دوسرا خطرناک منصوبہ جو امریکا اور ہندوستان کی طرف سے مشترکہ طور پر آگے بڑھایا جارہا ہے اس کا محور بھی تعلیم اور ثقافت کا میدان ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ:

امریکا یہ جانتا ہے کہ ایشیا میں اس کے لئے ہندوستان بنسبت پاکستان کے بہتر ساتھی ثابت ہوسکتا ہے اسی وجہ سے وہ پاکستان کو ایک وقتی اور مشکوک اتحادی کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن ہندوستان کو ایک مثبت اور پائیدار ساتھی سمجھتا ہے اسی وجہ سے امریکہ چاہتا ہے کہ افغانستان میں پاکستان سے زیادہ بھارت کو اثر ورسوخ حاصل ہو۔ امریکہ طالبان کو پاکستان کے دینی مدارس کی پیداوار سمجھتا ہے اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ ان کے مقابلے کے لئے افغانستان میں ہندوستانیوں کو تربیت دے اور پھر انہیں ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز کرے تاکہ اندرون ملک مجاہدین کی شدت پسندی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان نے افغان طلباء کے لئے اپنے تعلیمی اداروں اور کالجوں کے دروازے کھول دیئے ہیں اور ہر سال تقریباً ایک ہزار افغان طلباء کو ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ویزا دیا جاتا ہے، اب تک ہندوستان میں افغان طلباء کی تعداد سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے اور یہ تعداد اسی تناسب سے ہر سال مزید بڑھ رہی ہے جو کہ مستقبل میں کئی ہزار تک پہنچ جائے گی اور پھر ملک کے مختلف اداروں میں اِن لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔

اس کے علاوہ امریکہ نے افغانستان میں ہندی زبان اور ثقافت کے فروغ کے لئے بھی عوام کو بڑے پیمانے پر مواقع فراہم کئے ہیں افغانستان میں اپنے وفادار غلاموں کی مدد سے درجنوں ٹی وی چینلز کھول رکھے ہیں جو بڑے پیمانے پر ہندی زبان اور ہندوستانی ثقافت کی نشرواشاعت میں مشغول ہیں ایک محتاط اندازے کے مطابق افغانستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے نے بشمول عورتوں کے، ہندی فلموں کے ذریعے ہندی زبان سیکھ لی ہے۔

تعلیم، سیاست اور دیگر ملکی اداروں میں موجود ہندوستان سے تربیت یافتہ وہ لوگ جو ہندی

ذرائع ابلاغ کے لئے افغانستان میں عوامی سطح پر ہندوستان کی پالیسیوں کی تکمیل کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں ان کا گمان یہ ہے کہ امریکہ اپنی شکست کی صورت میں زمام کار ہندوستان کے حوالے کرے گا، کیونکہ ایک تو ہندوستان سیاسی اعتبار سے افغانستان میں دلچسپی رکھتا ہے اور ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی افغانستان میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے، دسرے اس لئے کہ وہ خطے میں چین اور پاکستان کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے امریکا کے ساتھ دوستی کا خواہاں ہے، یہ تمام اسباب اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہندوستان افغانستان کے تعلیمی شعبوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھائے اور افغانستان کی تعلیم کو سیکولر (بے دین) بنانے میں امریکہ سے ہر ممکن تعاون کرے یہاں تک کہ اس خطے کے باشندوں میں وہ اسلام متعارف ہو جائے جس کا (Rand Corporation) رینڈ کارپوریشن ''عوامی جمہوری اسلام'' (CIVIL DEMOCRATIC ISLAM) کی شکل میں خواب دیکھ رہا ہے۔

چند اہم تجاویز اور سفارشات

اس تمام تفصیل کے بعد ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خطے میں اور خاص طور پر افغانستان میں مجاہدین اور ان کی قیادت مسلح جدوجہد کے ساتھ ساتھ علمی، نشریاتی، نظریاتی اور سیاسی میدانوں میں دشمن کی سازشوں کا کیسے مقابلہ کریں اور ان تمام میدانوں میں اسلامی تعلیمات سے ان کا متبادل کیسے پیش کریں اور اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کی کیا کیا کوششیں کریں کیونکہ یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مسلح جدوجہد کے لئے تربیت یافتہ افراد تیار کرنا ضروری ہے۔

مغرب اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ اس خطے میں کشمکش کی ایک لمبی تاریخ ہے اور مستقبل میں بھی یہ جنگ مختلف شکلوں میں جاری رہنے کا امکان ہے۔ اسلئے جہادی قوتیں اپنے اندر جدوجہد اور استحکام پیدا کرنے کے لئے درج ذیل امور کی طرف بھرپور توجہ دیں۔

پہلی تجویز: مجاہدین کی سیاسی اور نظریاتی تربیت کرنا

مجاہدین کی سیاسی اور نظریاتی تربیت اور مغرب کے مکروہ عزائم سے ان کو باخبر رکھنے کے لئے ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں جہاد کے اغراض و مقاصد، اپنے قومی تشخصات کی پہچان اور خطے کے پڑوسی ممالک کے افغانستان کی داخلی پالیسیوں میں اثر ورسوخ پیدا کرنے کے منصوبوں کی وضاحت کی گئی ہو۔

یہ کتاب پوری باریک بینی کے ساتھ لکھی جائے اور اس کے موضوعات مجاہدین کے لئے سادہ زبان میں لکھے جائیں نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کتاب جیب کے سائز میں چھاپی جائے اور ایک نظریاتی نصاب کی حیثیت سے اُس کا بغور پڑھنا مجاہدین پر ان کے امراء کی طرف سے لازمی قرار دیا جائے تا کہ مجاہدین مکمل سیاسی بصیرت کے ساتھ اپنی جہادی جدوجہد کو ترقی دیں اور دشمن کے پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔

دوسری تجویز: دشمن کی نظریاتی جنگ سے باخبر رہنا

افغانستان کی مشہور زبانوں میں مغرب کی نظریاتی یلغار سے متعلق کتابیں لکھی جائیں اور قیادت کی طرف سے مجاہدین پر ان کتابوں کا پڑھنا لازم کیا جائے اور اسی طرح مجاہدین میں اس خفیہ جنگ اور اس سے دفاع کا احساس پیدا کرنے کے لیے مختلف اسباب جیسے تقریریں اور بیانات، آڈیو، Mp3 شکل میں ترتیب دے کر مجاہدین میں تقسیم کردی جائیں تا کہ وہ دشمن کے منصوبوں سے اچھی طرح باخبر رہیں اور ان کے مقابلے کے لئے تیاری کریں۔

تیسری تجویز: مدارس کے نصاب میں درج ذیل مضامین شامل کرنا

دینی مدارس کے نصاب میں درج ذیل مضامین کو ہر درجہ میں داخل کیا جائے۔

لف: سیرت النبی ﷺ کی تعلیم

سیرۃ النبی ﷺ وہ مبارک علم ہے جو پیغمبر اسلام حضور ﷺ کی ذاتی، اجتماعی، سیاسی فوجی، تشریعی اور اخلاقی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے اور اس کے ذریعے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح حضور ﷺ نے جزیرۃ العرب کے ان پڑھ، غیر منظم، غیر سیاسی، نادار اور غریب لوگوں کو پوری دنیا کی انسانیت کی قیادت کا اہل بنایا اور ان کو علم وتمدن کا استاد بنا دیا۔ بدنصیبی سے اس مبارک علم کو ہمارے دینی نصاب میں مناسب جگہ نہیں دی گئی کیونکہ اس کو نصاب میں تو شامل کیا گیا ہے مگر یہ علم زندگی کے ایک ایسے مرحلے میں پڑھایا جاتا ہے جس میں طالب علم عقل وادارک کی اتنی پختگی تک نہیں پہنچا ہوتا کہ وہ اس علم سے اپنے لیے زندگی کا ایک لائحہ عمل بنا سکے لہٰذا اس علم کو طالب علمی کے بڑے درجات میں پڑھانا چاہیے مثلاً دورہ حدیث یا موقوف علیہ کے درجات میں۔

(ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بچوں کو ان کی استعداد کے مطابق کتاب پڑھائی جائے اور بڑوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق، اس تکرار سے ایک تو سیرت یاد ہو جائے گی دوسرا اس سے مذکورہ فائدہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ مترجم)

ب: اسلام میں سیاسی نظام کا تصور واضح کرنا

جب سے سیاسی نظام مخلص مسلمانوں سے نکل کر بے دین لوگوں کے ہاتھوں میں آیا ہے اس وقت سے اس مضمون کا تصور بھی دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے نصاب تعلیم سے نکال دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء کے ذہنوں میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ روحانی اور مذہبی قیادت کے ساتھ سیاسی قیادت بھی علماء اور دین دار لوگوں کا حق ہے، قرآنِ پاک نے یہ حق صرف صالح لوگوں کے لیے بتلایا تھا، حضور ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بیک وقت مسجد کے امام، ملک کے سربراہ اور فوجی سربراہ ہوا کرتے تھے ان حضرات نے اپنے عمل سے امت کو یہ تعلیم دی تھی کہ ہر طرح کی دینی اور سیاسی

قیادت صرف صالح لوگوں کا حق ہے، مگر آج مذہبی اور سیاسی قیادت کی اہلیت کے درمیان بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے سراسر انحراف کیا جاتا ہے، یہ انحراف صرف اُسی وقت ختم ہو سکتا ہے کہ جب نیک لوگوں کو ایک بار پھر یہ باور کرایا جائے کہ دینی قیادت کی طرح سیاسی قیادت بھی اُن ہی کا حق ہے جسے حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک بھرپور جدوجہد کی جائے تاکہ قیادت مفسد اور بے دین عناصر کے ہاتھوں سے لے کر اُس کے صحیح حقداروں کے سپرد کی جا سکے۔

ج: دورِ حاضر کے کفر کی نئی شکلوں اور قسموں کا تعارف کرانا

موجودہ زمانے میں کفر کی نئی نئی اور مختلف شکلوں سے لاعلمی کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سادہ لوح مسلمان کفر کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اس موضوع کو قرآنِ کریم نے بھی پوری توجہ دی ہے، قرآن کے طریقے اور منہج کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ قرآن کریم ایک طرف تو مسلمانوں کو ایمان اور اس کے تقاضے سمجھاتا ہے، تو دوسری طرف کفر اور کفر کی مختلف قسمیں اور شکلیں بیان کرتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کے طریقے واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کفر کے مفاسد بھی بتاتا ہے، قرآن پاک نے اپنے نزول کے زمانے میں اُس زمانے کے کفر کی تمام اقسام اور شکلیں بتائی ہیں، یہودیوں کا کفر، عیسائیوں کا کفر، صابئین کا کفر، مشرکوں کا کفر، حاکمیت کا کفر، عبادت کا کفر، غیر اللہ سے استعانت اور ان کے نام نذر و نیاز کا کفر، کفار سے محبت اور ان سے دوستی کرنے کا کفر، نفاق کا کفر اور دیگر کئی اقسام کو اچھی طرح ایک ایک کر کے مثالوں سے سمجھایا ہے، قرآنِ کریم نے نہ صرف یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے کفر کی اقسام بتائی ہیں بلکہ پچھلی امتوں جیسے نوح علیہ السلام کی امت کا کفر، ابراہیم علیہ السلام کی امت کا کفر، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، لوط علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور دیگر پیغمبروں کی قوموں کے کفر اور ان کے کفریہ دلائل بھی خاصے تفصیل سے صرف اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ مسلمان اُن کی طرح کے انجام سے دوچار نہ ہوں۔

اسی طرح علمائے اسلام نے اپنے اپنے دور میں کفر اور گمراہی کی مختلف شکلوں اور ان کے

کفریہ اور گمراہ کن فلسفوں کو امت کے سامنے واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر مدلل رد بھی کیا ہے، جن میں خاص طور پر مرتد، زندیق، چنگیزی، خوارج، مرجئہ، جہمیہ، قدریہ، روافض، وجودیہ، حلولیہ، بابی، ذکری، قادیانی اور دیگر فرقے قابل ذکر ہیں۔ کفر اور گمراہی کی پرانی شکلیں تو اس دور کے علماء کی کاوشوں کے بدولت خاصی تفصیل کے ساتھ امت کے سامنے واضح ہو گئیں لیکن آج کے دور میں مشکل یہ ہے کہ کفر کی وہ صورتیں اور فلسفے جو نئے ناموں اور شکلوں میں سامنے آئی ہیں ان کو مکمل اور واضح شکل میں علمائے کرام نے تعلیمی نصاب میں ذکر ہی نہیں کیا اور علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق وہ فلسفہ امت کو اجتماعی طور پر ارتداد کی طرف لے جا رہا ہے۔

موجودہ زمانے کے کفر کی شکلیں جیسے کمیونزم، لبرل ازم، سیکولرازم، ہیومن ازم، ہیومن رائٹس جمہوریت، ماڈرن ازم، نیشنل ازم، عقل کے ترازو پر تولے ہوئے قوانین اور گلوبلائزیشن وغیرہ کفر کی پرانی شکلوں سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ پرانے زمانے میں کفر بالکل سادہ اور واضح شکل میں ہوا کرتا تھا اور صرف عبادات کی حدود میں دائر تھا لیکن آج کے کفر نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، سیاست، نظام سلطنت، عقائد، اخلاق، اقتصاد، تمدن وغیرہ ہر چیز میں اپنا اثر ورسوخ جمائے ہوئے ہے اور اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس طرح کے کفر میں مبتلا لوگ اپنے آپ کو کفر میں مبتلا ہی نہیں سمجھتے بلکہ ترقی، تمدن، عالمگیریت، عدالت، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی صفات سے اپنے آپ کو متصف سمجھتے ہیں اور عام لوگ اُن کی اصطلاحات اور ان خوشنما الفاظ کے پس پردہ خطرناک مفہوم سے واقف نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں مسلمان کبھی اپنے آپ کو کمیونیزم کی گود میں اور کبھی ماڈرن ازم (جدت پسندی)، لبرل ازم یا جمہوریت اور انسانی حقوق جیسے فتنوں کی گود میں ڈال دیتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ لہٰذا جہادی اور اسلامی تحریکوں کو چاہیے کہ قرآن کریم کے دلائل کی روشنی میں اِس زمانے کے کفر کی شکلوں اور نئی اقسام کے بارے میں تعلیمی نصاب یا مطبوعات اور دیگر مؤثر طریقوں کے ذریعے نئی مسلمان نسل کو آگاہ کریں اور ان کے رد کے

لئے بھی بڑے پیمانے پر کتابیں تصنیف کی جائیں تاکہ مسلمانوں کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کو زمانے کے کفر کے خطرات سے بچایا جا سکے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو بہت سے لوگ دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ان کو یہ خبر بھی نہ ہوگی کہ وہ کافر ہو گئے ہیں۔

د: مغرب کے پس پردہ جرائم کو بے نقاب کرنا

اسلامی تحریکوں اور خاص طور پر مجاہدین کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں مغرب کے سیاسی، استعماری، فوجی، اقتصادی اور اخلاقی جرائم سے پردہ اٹھائیں تاکہ مغرب کے وہ جرائم جو اس نے اسلامی ممالک کو زیر تسلط لانے اور مسلمانوں پر اپنا براہ راست یا بالواسطہ قبضہ جمانے کے بعد کئے ہیں وہ دنیا کے سامنے آجائیں، اسی طرح وہ مظالم جو انگریزوں نے ایشیاء میں کئے، فرانس، اٹلی اور ہسپانیہ کے لوگوں نے اپنے اپنے زمانے میں افریقہ میں کئے، روسیوں نے اور وسطی ایشیاء کے امریکیوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں پر کئے، وہ اب تک دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مستقبل میں امریکا کے مکروہ عزائم کو دنیا کے سامنے بے نقاب کیا جائے مثلاً خلیج، وسطی ایشیاء اور دیگر اسلامی ممالک کے معدنی وسائل اور ذخائر پر اپنا قبضہ جمانا۔ یہ امریکہ کے وہ منصوبے ہیں جن کی تکمیل کے لیے وہ لاکھوں انسانوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اسی سلسلے میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ امریکہ اور یورپ نے کیسے یہودیوں کے شر سے اپنے آپ کو چھڑانے کی خاطر فلسطین میں ایک یہودی ریاست بنا کر اُن کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ امریکہ کی کٹھ پتلی حکومت، اقوامِ متحدہ کے ادارے اور سلامتی کونسل کے وہ تمام مظالم بھی دنیا کے سامنے لائے جائیں جو اس نے گذشتہ ساٹھ سالوں میں فلسطین، کشمیر، قبرص اور دیگر اسلامی ممالک میں ڈھائے ہیں، مغرب کے ان جرائم سے پردہ اٹھانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو مغرب کے انصاف، مساوات، جمہوریت اور تمدن کا اصلی چہرہ نظر آجائے گا اور وہ یہ جان لیں گے کہ آیا مغرب ان کا ہمدرد دوست ہے یا خطرناک دشمن؟ اور یہ بھی کہ امریکہ کی جانب سے

مرتب شدہ ''جمہوری اسلام'' حقیقی اسلام ہے یا اسلام کے لباس میں چھپا ہوا کفر ہے کہ جس کو اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔

اسی طرح مغرب کی ہزاروں غیر سرکاری این جی اوز کے جرائم سے بھی نقاب ہٹایا جائے جو وہ جاسوسی کرنے، مالی بدعنوانیوں اور اخلاقی جرائم پھیلانے کے لیے اسلامی دنیا میں موجود مغربی اطلاعات نشر کرنے اور مسیحیت کی طرف دعوت کی شکل میں انجام دیتی ہیں۔ یہ این جی اوز (N.G.O) مجموعی طور پر مغرب کے غیر مسلح لشکر ہیں جو اسلحہ استعمال کیے بغیر اسلامی دنیا کو قبضے میں لینے کے ارادے سے اسلامی ممالک میں مختلف شکلوں میں کام کرتی ہیں۔

۵: جہاد کے ساتھ ساتھ دعوت الی اللہ کی طرف بھی توجہ دینا

اسلام کا ایک بہت اہم فریضہ جس کی طرف جہادی تحریکوں کو بھرپور توجہ دینی چاہیے وہ حقیقی اسلام کی طرف ناصحانہ اور مخلصانہ دعوت ہے۔ مجاہدین کو چاہیے کہ وہ افغانستان میں کفر کے خلاف مسلح جنگ کے ساتھ ساتھ دعوتی سرگرمیوں کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دیں مثلاً عمومی مجالس میں درسِ قرآن، اسلامی بیانات، اجتماعات اور تربیتی نشستیں، پروجیکٹر (Projector) کے ذریعے عام لوگوں کے لیے جہادی فلموں کی نمائش، نوجوانوں، اسکولوں اور مدرسوں کے طلبہ کے درمیان علمی اور قرآن کی بعض سورتوں اور ایک خاص تعداد میں احادیث کے زبانی یاد کرنے کے مقابلے، ادبی جلسے اور گاؤں کے نوجوانوں کے درمیان مناسب ورزشی پروگرام وغیرہ۔ جس قدر لوگوں کے درمیان اسلامی فضا عام ہوگی اتنا ہی لوگوں میں جہاد اور مسلح جدوجہد کی طرف میلان پیدا ہوگا اور دشمن کے پروپیگنڈوں کا اثر ماند پڑ جائے گا۔ اس طرح کے دعوتی پروگراموں کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ مجاہدین میں ایک غیر معمولی تعلیمی، تربیتی اور دعوتی استعداد پیدا کی جائے اور ہر گروپ میں دعوتی سرگرمیوں کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے، جس میں مختلف ذوق، اور استعداد رکھنے والے مجاہدین اور محلے کے علماء شامل ہوں جو یہ کام کریں، جن علاقوں میں مجاہدین کا قبضہ ہے وہاں FM کے چھوٹے چھوٹے ریڈیو چینلز فعال

کیے جائیں تا کہ دینی دعوت کا پیغام بڑے پیمانے پر زندگی کے ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچ جائے، یہ کوشش بھی کی جائے کہ اسلامی مطبوعات (کتابیں، رسائل) بھرپور انداز میں لوگوں تک پہنچائی جائیں اور ان مطبوعات میں ایسے موضوعات کی طرف خاص توجہ دی جائے جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کے خطرناک منصوبوں کو بے نقاب کیا گیا ہو اور ان کے نتائج سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہو، اسی طرح جہاد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ایمان اور اخلاق کی حفاظت کے لیے بھی ایک مؤثر دعوتی تحریک چلائی جائے جو دشمنوں کے منصوبوں کو غیر مؤثر بنائے اور جس کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا گیا اسلام اور امریکہ کی طرف سے مرتب شدہ ''جمہوری اسلام'' دونوں بالکل الگ الگ دین ہیں، پہلا اسلام ہے اور دوسرا کفر، یہ وہ اسلام ہے کہ جس کے بارے میں امریکہ چاہتا ہے کہ اسے دنیا میں حقیقی اسلام کے متبادل کے طور پر پیش کرے اور اس کے ذریعے مسلمانوں کو مغرب کی استعماری ریاستوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے سے روکے۔

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (الصف: ۸)

ترجمہ: ''یہ (کافر) چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھا دیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہیں گے، چاہے کافروں کو یہ بات کتنی ہی بری لگے۔''

دور حاضر کا نظریاتی ارتداد

الله
بسم الله الرحمن الرحیم

دور حاضر کا نظریاتی ارتداد علامہ ندویؒ کی نظر میں

مغرب کا اسلام اور مسلمانوں میں نظریاتی ارتداد پھیلانے کا منصوبہ مسلمانوں کے خلاف تاریخ کا سب سے خطرناک منصوبہ ہے کہ جس نے گذشتہ ڈیڑھ صدی کے طویل عرصہ میں نظریاتی، سیاسی اور نشریاتی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے لاکھوں مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ کر دیا اور انہیں مغربی نظریات میں رنگ دیا جس کی وجہ سے وہ علانیہ طور پر کفر کے جھنڈے تلے اسلام کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ نہ تو مغربی افکار اور نظریات کو ماننے والی مسلمان نسل یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ عملاً ایک صریح ارتداد میں مبتلا ہے اور نہ ہی دنیائے اسلام کے علماء نے اس پہلو کی طرف توجہ دی ہے کہ موجودہ دور کا ارتداد جو کبھی کمیونیزم، کبھی مغربی لبرل ازم اور کبھی جمہوریت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، درحقیقت اللہ جل شانہ کی حاکمیت اعلیٰ کو نہ ماننے کا نام ہے، ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک طرف یہ ارتداد ایسی حیران کن پیچیدہ شکلوں میں ہے کہ اس کے اندر موجود کفر کی حقیقت آسانی سے نظر نہیں آتی اور دوسری طرف ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں نظریاتی، عقیدتی اور زمانے کے جدید کفریہ خیالات اور نظریات کے تعارف پر مشتمل موضوعات کو کوئی جگہ بھی نہیں دی گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان دینی مدارس سے فارغ ہونے والوں میں سے اکثریت کا حال یہی ہوتا ہے کہ وہ دور حاضر کی ارتدادی سرگرمیوں اور ان کے خطروں سے بے خبر ہوتے ہیں یا باخبر ہوتے ہوئے اس سے بے توجہی برتتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کا شکر ہے کہ اب بھی امت میں زمانے کے نبض شناس، دلسوز اور سمجھدار علماء موجود ہیں جو ان فتنوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور جو امت کو زمانے کے ارتداد کی حقیقت اور شکلوں سے باخبر کرتے ہیں انہی علماء میں سے ایک علامہ سید ابوالحسن علی الحسینی الندوی ہیں جو کہ ہندوستان کے بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے عالم تھے اور بہت ہی وسیع النظر شخصیت تھے اور دنیا کے احوال اور انقلابات سے باخبر انسان تھے۔

علامہ ندوی رحمہ اللہ کا تعارف

علامہ سید علی الحسینی الندوی نے ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کے اتر پردیش صوبے میں رائے بریلی کے تکیہ کلاں نامی گاؤں میں ایک بڑے عالم علامہ سید علی الحسینی کے گھر میں آنکھ کھولی، ان کے والد صاحب نے ہندوستان کی گذشتہ آٹھ صدیوں میں گزرے ہوئے علماء کے تذکروں اور سوانح پر آٹھ جلدوں میں "الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام" کے نام سے ایک بڑی کتاب لکھی جس کا شمار دنیائے اسلام کے کتب خانوں کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ آپ امام المجاہدین سید احمد شہید رحمہ اللہ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔

علامہ ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چودہ سال کی عمر تک مروجہ علوم پڑھے، فارسی، عربی اور انگریزی زبان سیکھی اور پندرہ سال کی عمر ۱۹۲۹ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دارالعلوم سے دورہ حدیث کیا، بعد میں علامہ احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے لاہور میں تفسیر کا علم حاصل کیا اور دارالعلوم دیوبند میں علامہ حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے حدیث اور تفسیر پڑھی۔

علامہ ۱۹۶۱ء سے اپنی وفات یعنی ۱۹۹۹ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رئیس رہے، انہوں نے اسلامی فکر اور اسلامی دنیا کے اہم موضوعات پر اسّی سے زیادہ کتابیں اور سینکڑوں مقالے تصنیف فرمائے۔

علامہ ندوی دوسروں سے زیادہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مغرب کا موجودہ نظریاتی اور اخلاقی فلسفہ الحاد کی بنیاد پر کھڑا ہے اور جو کوئی دل سے مطمئن ہو کر اس کو مان لے وہ مرتد ہو جاتا ہے اس لیے انہوں نے اپنے ایک تاریخی اور عالمی مقالے میں اس کڑوی حقیقت کی وضاحت کی ہے کئی سال پہلے مصر کے "المسلمون" رسالے میں افتتاحیہ کے طور پر انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا نام تھا "ردة ولا ابا بكر لها" چونکہ علامہ ندوی کے اس مقالہ میں ایسے حقائق کے بارے میں واضح علمی اور شرعی موقف بیان ہوا ہے جن کا ہمارا معاشرہ بھی ایک عرصے سے سامنا کر رہا ہے اور

امریکہ کی دخل اندازی کے بعد انہی نظریات کو امت مسلمہ پر مسلط کرنے کو ہماری حکومت نے اپنا بنیادی فریضہ سمجھا ہوا ہے اور اسی کے لیے امریکہ نے ان کو تمام اختیارات دیے ہوئے ہیں اس لئے ضروری تھا کہ اس موضوع کو ایک ایسے فرد کے قلم سے افغان مسلمان اور مجاہد معاشرے کے سامنے پیش کیا جائے جس کا علمی رسوخ، تقویٰ، انصاف، وسعتِ نظر، حکمت اور تجربہ تمام مسلمانوں میں بلا اختلاف مسلّم ہو۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر اس مقالے کو بغیر کسی کمی بیشی کے اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے ہمیں امید ہے کہ اس کے ذریعے ہم اپنی مجاہد ملت کو زمانے کے ارتداد کے خطرات سے خبردار کرنے کا فریضہ ادا کر سکیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

((ردة ولا ابا بکر لها))

"ارتداد ہے لیکن اس کے لئے کوئی ابوبکر جیسا نہیں"

علامہ ابوالحسن علی الحسینی الندوی

اسلام کی تاریخ میں ارتداد کے متعدد واقعات پیش آئے ہیں، جن میں سب سے بڑا اور سخت عرب قبائل کا ارتداد تھا جو کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد پیش آیا۔ یعنی وہ زبردست باغی تحریک جس کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بے نظیر عزم وایمان سے سر اٹھاتے ہی کچل دیا تھا۔

دوسرا بڑا ارتدادی واقعہ نصرانیت اختیار کر لینے کی وبا تھی جو ہسپانیہ سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد پھیلی اور بعض ان دوسرے ملکوں میں بھی رونما ہوئی جو مسیحی مغربی طاقتوں کے زیر نگیں تھے اور عیسائی پادری اور مشنری بھی وہاں اس مقصد کے لئے سرگرم تھے۔ ان معتدبہ واقعات کے علاوہ اسلامی تاریخ میں ارتداد کے وہ اکادکا واقعات بھی ہیں کہ مثلاً ہندوستان میں کسی خفیف العقل اور پست فرد نے اسلام کو چھوڑ کر برہمنیت یا آریہ سماجیت اختیار کر لی لیکن ایسے واقعات شاذ ونادر ہی ہوئے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر بدنصیب ہسپانیہ کے فتنۂ نصرانیت کو ارتداد مانا جائے تو اس کو مستثنیٰ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کسی عام ارتداد سے آشنا نہیں ہوئی ہے۔ جیسا کہ مؤرخین مذہب کا اعتراف ہے۔

گذشتہ زمانے میں ارتداد کے کسی بھی واقعہ کے بعد دو قسم کے نتائج سامنے آتے تھے:

۱۔ مسلمان مرتد ہونے والے لوگوں سے سخت نفرت کرتے۔

۲۔ مرتدین کو اسلامی معاشرے سے الگ شمار کیا جاتا۔

صرف ایک ارتداد کی وجہ سے مرتد اور اس کے رشتہ داروں کے درمیان سارے تعلقات اور رشتے ٹوٹ جاتے تھے، ارتداد ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے اور ایک زندگی سے دوسری

زندگی میں داخل ہونا شمار کیا جاتا تھا۔ مرتد کا خاندان اس کا بالکلیہ بائیکاٹ کر دیتا اور اسے اپنے آپ سے بالکل الگ کر دیتا تھا، نہ تو اس کی عورتوں کے ساتھ کوئی نکاح کرتا، نہ کوئی اسے اپنی بہن اور بیٹی دیتا اور نہ ہی اس مرتد اور اس کے گھرانے کے درمیان میراث کا معاملہ ہوتا۔

اس زمانے میں ارتداد کے واقعات سے مسلمانوں میں اپنے دین کے دفاع اور ادیان کے درمیان تقابل کرنے اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا تھا۔ جب بھی کسی علاقے میں ارتداد کے واقعات رونما ہوتے تو وہاں کے علماء اور مبلغین اور مصنفین فتنہ ارتداد کا دلائل کے ساتھ رد کرتے اور اس کے اسباب کو معلوم کر کے لوگوں کے سامنے ان کو بے نقاب کرنے کے لئے میدان میں اتر آتے اور اسلام کی خوبیاں اور دوسرے ادیان سے اس کے امتیازات لوگوں کے سامنے بیان کرتے۔ گویا اس مسلمان معاشرے کا حال یہ ہو جاتا تھا کہ جیسے قلق واضطراب، بے چینی اور غیظ وغضب کی ایک موج آ کر سب کو تہ وبالا کر گئی ہو۔ یہ حوادث مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے اور کیا خواص کیا عوام سب کے لئے یہ ایک ہی بات اور ایک ہی فکر ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ گذشتہ زمانے میں مسلم معاشرے میں پیش آنے والے ارتداد کے واقعات بہت کم ہوا کرتے تھے اور ان واقعات کا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر کوئی خاص اثر بھی مرتب نہیں ہوا کرتا تھا۔

لیکن اب کچھ عرصہ سے دنیائے اسلام کو ایک ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے جس نے پوری اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جو اپنی قوت، عموم اور شدت کی وجہ سے گذشتہ تمام ارتدادی تحریکوں سے بازی لے گیا ہے۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں بچا جو اس فتنہ ارتداد کی غارتگری سے محفوظ رہا ہو بلکہ ملک تو ملک اب تو خاندانوں میں بہت کم گھرانے ایسے نظر آتے ہیں جو اس فتنے کے اثرات سے محفوظ رہ گئے ہوں۔ یہ وہ ارتداد ہے جو مشرقی اسلامی دنیا پر مغرب کے سیاسی، نشریاتی اور تہذیبی حملوں کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ یہ فتنہ ارتداد اسلامی دنیا اور اسلامی تاریخ میں حضور اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک کا سب سے بڑا ارتدادی فتنہ ہے۔

'ارتداد' کی تعریف

اسلام کے عرف اور شریعت کی اصطلاح میں ارتداد کے معنی:

''ایک دین کے بدلے دوسرا دین اور ایک عقیدے کے بدلے دوسرا عقیدہ اختیار کرنا، آپ ﷺ جو تعلیمات لے کر آئے ہیں ان کا انکار کرنا، دین کی جو باتیں تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور جو کچھ اسلام میں قطعی طور پر (بغیر کسی شک وشبہ کے) ثابت ہے، اس کا انکار کرنا۔''

گذشتہ زمانے میں مرتد کی پہچان

گذشتہ ادوار میں کوئی شخص یا تو آپ ﷺ کی رسالت ونبوت کا انکار کر کے اسلام سے مرتد ہو جاتا یا اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت، یہودیت یا برہمنیت اختیار کر کے مسلم معاشرے میں مرتد شمار ہوتا تھا، یا کبھی الحادی راہ اختیار کر کے وحی اور آخرت کا منکر ہو کر لوگوں کے سامنے اعلانیہ طور پر کافر ہو جاتا تھا۔ پھر جو شخص بھی مرتد ہو جاتا تو وہ یا تو نصاریٰ کے کلیسا یا یہودیوں کے ہیکل جاتا نظر آتا یا پھر برہمنوں کے بت خانوں میں پایا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کا ارتداد مسلمانوں پر واضح ہو جاتا اور مرتد دور سے ہی پہچان لیا جاتا تھا۔ اس کی طرف انگلیاں اٹھتیں اور مسلمان اس شخص سے تمام امیدیں منقطع کر لیتے تھے۔ الحاصل عام طور پر کسی کا ارتداد کوئی راز نہیں ہوا کرتا تھا۔

یورپ کی دجالی طاقتوں نے مشرق میں ایسے نظریات پھیلائے جو دین کی بنیادوں اور اللہ تعالیٰ کے انکار پر مبنی تھے، یعنی وہ قادر مطلق ذات جس نے اس کائنات کو عدم سے وجود بخشا اور جس کے دست تصرف میں کائنات کی زمام کار ہے، یورپ کے نظریات کی بنیاد اس ذات کے انکار پر قائم تھی۔

﴿الا له الخلق والامر﴾

ترجمہ: ''پیدا کرنا اور حکم چلانا صرف اسی کا حق ہے۔''

ان کے فلسفے عالم غیب، وحی، نبوت، شرائع سماویہ اور روحانی و اخلاقی قدروں کے انکار پر قائم تھے۔ یورپ کے ان فلاسفروں میں سے بعض تو بایولوجی (حیاتیات) کے نظریہ ارتقاء سے بحث کرتے تھے تو بعض مباحث اخلاق سے، بعض کے افکار روحانی تربیت کے گرد گھومتے تھے تو بعض دیگر نے اقتصاد اور سیاست کا موضوع اپنایا ہوا تھا، یہ فلسفے اگرچہ ظاہری طور پر اغراض و مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف رکھتے ہوں لیکن ایک نقطہ نظر پر سب متفق تھے کہ انسان اور دنیا کو صرف مادی نظر سے دیکھا جائے اور دنیا میں انسان کی زندگی کا لائحہ عمل مادی علتوں کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے۔ آج ان فلسفوں اور نظریات نے مشرقی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور یہ نظریات ان کی رگ و ریشے میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ فلسفے دنیا کی تاریخ میں اسلام کے بعد سب سے بڑے اور طاقتور دین کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم و فہم کے لحاظ سے ممتاز تھا اس دین پر فریفتہ ہو گیا اور ان نظریات میں اچھے برے کی تمیز کیے بغیر کلی طور پر ان سب کو ایسے قبول کر لیا جیسے مسلمان اسلام کو اور عیسائی مسیحیت کو کلی طور پر مانتے ہیں، یہ لوگ اپنے ان نظریات کی راہ میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس کے شعائر کی عزت کرتے ہیں۔ اس کے رہنماؤں اور داعیوں کی عظمت کا کلمہ پڑھتے ہیں، اپنی تصانیف کے ذریعے لوگوں کو اس دین کی دعوت بھی دیتے ہیں اور ان تمام ادیان، طریقوں اور نظریات کی تذلیل کرتے ہیں جو ان کے (مغربی) نظریات سے متصادم ہوں اور ایسے تمام لوگوں کو اپنا بھائی شمار کرتے ہیں جو ان کے نظریات کے پیروکار ہوں۔ اس طرح یہ سب لوگ ایک گھرانہ، ایک امت اور ایک بلاک بن گئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ ایسے (نظریاتی مرتد) لوگوں کا دین کیا ہے؟ اگرچہ اس کے ماننے والے اس کو دین کا نام دینے سے انکاری ہیں۔ ان کا دین کائنات کو وجود میں لانے والی اس علیم و خبیر ہستی کا انکار ہے جو مالک تقدیر بھی ہے اور رہنمائے حیات بھی (الذی قدر فھدی) حیات بعد الموت، حشر و نشر، جنت و دوزخ اور ثواب و عذاب کا انکار، نبوت و رسالت کا انکار۔ شرائع سماویہ

اور حدود شرعیہ کا انکار اور اس حقیقت کا انکار کہ اللہ نے اپنی تمام مخلوق پر اپنے عظیم تر خاتم الرسل ﷺ کی اطاعت فرض کی ہے، اور ہدایت و سعادت کو ان کی پیروی میں منحصر کر دیا ہے اور اس بات کا انکار کہ اسلام وہ آخری اور دائمی پیغام ہے جو دین و دنیا کی تمام سعادتوں کا کفیل ہے اور زندگی کا ایک ایسا نظام ہے جو سب سے اعلیٰ و افضل ہے اور اسلام ہی وہ دین ہے جس کے علاوہ کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں اور جس کے بغیر دنیا کی فلاح و سعادت کا کوئی امکان نہیں، اور اس کا انکار کہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان اللہ کے لئے۔

آج جس طبقے کے ہاتھ میں اکثر اسلامی دنیا کا کنٹرول ہے وہ اسی دین کا پیروکار ہے۔ اگر چہ یہ سب اس (خودساختہ) دین پر ایمان رکھنے اور اس کا دفاع کرنے میں ایک جیسے نہیں بلکہ ان میں سے بعض تو یقیناً اللہ جل شانہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کو بھی دین کی حیثیت سے مانتے ہیں لیکن اس طبقے کی غالب اکثریت کا دین مادیت اور مغرب کا وہ فلسفہ ہے جو الحاد پر قائم ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ یہ وہ ارتداد ہے، جس نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، ہر گھر اور ہر خاندان پر اس کا حملہ ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور دیگر اداروں سب پر اس کی یورشی ہوئی ہے، مشکل ہی سے کوئی ایسا خوش قسمت خاندان ملتا ہے کہ جس کو اللہ جل شانہ نے محفوظ رکھا ہو اور اس میں اس نئے مذہب کے عقیدت گزار موجود نہ ہوں۔ اگر آپ کو کبھی اس طبقے کے لوگوں سے بات کرنے کی نوبت آئے اور آپ ان کو چھیڑ کر ان سے اندر کی بات اگلوائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ یا تو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے ہوں گے یا یوم آخرت کے انکاری ہوں گے، وہ یا تو پیغمبر ﷺ کے منکر ہوں گے یا پھر قرآن کو ایک معجزہ اور رہتی دنیا تک کے لئے زندگی کے قانون کی حیثیت سے نہیں دیکھتے ہوں گے۔ ان میں گمراہی کے اعتبار سے سب سے کم خطرے میں وہ شخص ہوگا جو اس قسم کی بحث کے دوران کفریات بکنے کی بجائے یہ کہے کہ ہم نہ تو ان مسائل میں غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہمارے دل میں ان کی کوئی خاص اہمیت ہے۔

اس طبقے کے نظریات بغیر کسی شک وشبہ کے کفر وارتداد ہیں لیکن مسلمانوں کی اس طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ارتداد کے بعد کسی کلیسا یا دیگر مذاہب کے عبادت خانوں میں نہیں جاتے اور نہ ہی اپنے مرتد ہونے اور دین بدلنے کا اعلان کرتے ہیں اور نہ ان کا خاندان اس ارتداد کی وجہ سے ان سے قطع تعلق کرتا ہے بلکہ یہ لوگ اس ارتداد کے بعد بھی بدستور اپنے گھر میں ہی زندگی گذارتے ہیں، انہیں پہلے کی طرح تمام خاندانی حقوق حاصل ہوتے ہیں بلکہ خاندانوں میں اکثر اسی قسم کے روشن خیال مرتد لوگوں کا ہی اثر ورسوخ چلتا ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر نہ تو معاشرہ ان کے ارتداد کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے محاسبے کی نوبت آتی ہے اور نہ ہی انہیں کوئی ملامت کی جاتی ہے بلکہ یہ لوگ بدستور معاشرے میں گھل مل کر رہتے ہیں اور معاشرے کے اجتماعی حقوق کے حقدار بھی ٹھہرتے ہیں۔

یہ عالم اسلام کا نہایت اہم مسئلہ اور نہایت قابل فکر معاملہ ہے، ایک ارتداد ہے جو سیلاب کی طرح پھیلتا جارہا ہے لیکن عمومی طور پر کسی کی اس طرف توجہ نہیں، حد تو یہ ہے کہ علماء کرام اور دین کی سمجھ رکھنے والے لوگ بھی نہ صرف یہ کہ عامۃ المسلمین کو اس کے خطرے سے خبردار نہیں کرتے بلکہ خود بھی اس سے بے خبر ہیں۔ گذشتہ زمانے میں جب ان کفریہ نظریات نے مسلمانوں کے دلوں میں گھر نہیں کیا تھا تو جب کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش آتا تو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یاد کیا کرتے تھے چنانچہ اس زمانے میں ایسے موقع کے لئے ایک ضرب المثل مشہور تھی "قضیة ولا ابا حسن لھا" یعنی مسئلہ پیش آیا ہے لیکن اس کو حل کرنے کے لئے ابوالحسن یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ موجود نہیں ہیں لیکن میں آج کہتا ہوں کہ "ردة ولا ابا بکر لھا" یعنی ارتداد پھیل رہا ہے لیکن اس کے لئے کوئی ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں ہے۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو دبانے کے لئے جنگ کی ضرورت نہیں۔ نہ تو کوئی انقلابی عمل اس کے لئے کارگر ثابت ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کو زیر کرنے کے لئے کوئی تلخ تجربہ مفید ہوگا بلکہ طاقت کا استعمال اور طبیعتوں کی باہمی تلخی اور بھی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے جو کہ اس کو مزید ابھار دے گی۔

اسلام میں نہ تو مسیحیت کی طرح تفتیش کے محکمے ہیں اور نہ دین کی وجہ سے کسی پر زور زیادتی کی گنجائش، بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے لئے عزم، حکمت، مشکلات پر صبر و استقامت اور گہرے نظر و فکر کی ضرورت ہے۔

اس دین جدید کے فروغ کی وجوہات

یہ نیا دین اسلامی دنیا میں کیسے پھیلا؟ اور اس نے کیسے مسلمانوں کو عین ان کے گھروں کے اندر نشانہ بنایا؟ اور کس طرح اس نے لوگوں کے دل و دماغ پر ایک عالم گیر تسلط جمایا؟ ان تمام سوالات کے جواب کے لئے انتہائی باریک اور پرفکر وضاحت کی ضرورت ہے۔

قصہ کچھ یوں ہوا کہ انیسویں صدی میں دنیائے اسلام پر تھکاوٹ اور بڑھاپے کے آثار طاری ہونے لگے اور مسلمان دعوت و عقیدہ اور علم و عقلیت کے لحاظ سے انتہائی ضعف اور پستی کی طرف گرنے لگے، اسلام تو بے شک کبھی بڑھاپے کی منزل سے آشنا نہیں ہو سکتا، اس کی مثال تو سورج کی سی ہے کہ قدیم ہونے کے باوجود بھی ہر وقت جدید اور ہر دم جواں رہتا ہے۔ لیکن یہ مسلمان تھے جو ضعف اور سستی کا شکار ہو گئے۔ پھر نہ ان کے عملی میدانوں میں کوئی ہلچل رہی اور نہ فکر اور جدت کے میدان میں وہ کوئی کارنامہ انجام دے سکے۔ دعوت کا جوش و ولولہ اور اسلام کو مؤثر اور عمدہ طریقے سے پیش کرنے کا سلیقہ بھی ناپید ہو گیا۔

مزید برآں یہ ہوا کہ نوجوانوں سے ربط نہیں رکھا گیا اور نہ ان کی اسلامی ذہن سازی کی کوشش کی گئی حالاں کہ مستقبل کا دور انہیں کا تھا۔ اس نوخیز نسل کو اس بات کا قائل کرنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ اسلام ایک سدا بہار پیغام اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے قابل عمل دین ہے۔ قرآن ہی تنہا وہ معجزہ اور ابدی کتاب ہے جس کے عجائبات کی انتہا نہیں، نہ اس کے علوم کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے اور نہ اس کی جوانی میں کوئی بوڑھاپن آسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود ہی اپنی ذات میں ایک بہت بڑا معجزہ ہیں جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے پیغمبر اور ہر زمانے کے لئے

ہدایت ورہنمائی اور کامیابی کا سرچشمہ ہیں۔ اسلامی شریعت تمام عقلی ودیگر آسمانی قوانین سے بلند تر اور ہر زمانے میں زندگی کے تمام شعبوں کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہے۔ ایمان وعقیدہ اور اخلاق وروحانی اقدار ہی وہ بنیادیں ہیں، جن پر ایک شریف سوسائٹی اور پاکیزہ تمدن کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ نئی تہذیب کے پاس ذرائع ووسائل تو ہیں۔ لیکن اخلاق وعقائد اور زندگی کے مقاصد کا شرچشمہ صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں ہے اور ایک متوازن اور صالح معاشرے کا قیام صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ مقاصد ووسائل صحیح تناسب کے ساتھ جمع ہو جائیں۔

یہ صورتحال اور یہ وہ وقت تھا کہ جب یورپ اپنے فلسفوں کا لشکر لے کر اسلامی دنیا پر حملہ آور ہوا۔ وہ فلسفے جن کی تدوین اور تراش وخراش بڑے بڑے فلاسفہ اور یگانہ روزگار شخصیتوں کی کاوشوں کا ثمرہ تھی جنہوں نے ان پر ایسا علمی اور فلسفیانہ رنگ چڑھایا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی فکر انسانی کی معراج ہے۔ مطالعہ وتحقیق اور عقل انسان کی پرواز اس پر ختم ہے اور غور وفکر کا یہ وہ نچوڑ ہے کہ جس کے بعد کچھ اور سوچا ہی نہیں جاسکتا۔ حالاں کہ ان فلسفوں میں کچھ چیزیں وہ تھیں جو تجربات اور مشاہدات پر مبنی تھیں اور وہ صحیح تھیں۔ اور بہت سی چیزیں وہ تھیں جو محض گمان، اندازوں اور فرضی خیالات پر قائم تھیں، گویا ان میں حق بھی تھا اور باطل بھی، علم بھی تھا اور جہل بھی، مضبوط حقائق بھی تھے اور شاعرانہ تخیلات بھی اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ شاعری، نظم وقافیہ بندی ہی میں منحصر ہے بلکہ یہ فلسفہ اور علم کے میدان میں بھی ہوتی ہے۔

مسلم دنیا میں یہ فلسفے مغربی فاتحین کے جلو میں آئے اور مشرقی عقل وطبیعت نے فاتحین کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت بھی قبول کرلی۔ مشرق کے تعلیم یافتہ طبقے نے بڑھ کر ان کو قبول کیا۔ ان میں کچھ تو وہ تھے جو اس کی حقیقت سے واقف تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، اور اس میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اس کے انجام اور حقیقت سے ناواقف تھے اور ان پرکشش فلسفوں کے اندھے مقلد تھے۔ ان فلسفوں پر ایمان لانا ہی عقل وخرد کا معیار بن گیا اور اس کو روشن خیالوں کا شعار سمجھا جانے لگا۔

اس طرح یہ الحاد وارتداد اسلامی ماحول اور اسلامی دائروں میں بغیر کسی شورش اور کشمکش کے پھیل گیا۔ نہ والدین اس انقلاب پر چونکے، نہ اساتذہ اور مربیوں کو خبر ہوئی اور نہ غیرت ایمانی رکھنے والوں کو کوئی جنبش ہوئی۔ اس لئے کہ یہ ایک خاموش انقلاب تھا۔ اس الحاد وارتداد کو اختیار کرنے والے مرتدین کسی کلیسا میں جا کر نہیں کھڑے ہوتے تھے، نہ کسی معبد میں جاتے، نہ کسی بت کے سامنے ماتھے ٹیکتے اور نہ کسی طاغوت کے نام پر نذرانہ دیتے تھے، جو کہ اس فتنے سے قبل کفر وارتداد اور زنادقہ کی علامت سمجھی جاتی تھیں۔

پچھلے زمانے میں جب کوئی اسلام سے مرتد ہو جاتا تو وہ اسلامی معاشرے کو خیر باد کہہ کر اس معاشرے کے ساتھ مل جاتا تھا جس کا دین اس نے اختیار کیا ہوتا تھا اور وہ اپنے عقیدے اور نظریے کی تبدیلی کو ڈنکے کی چوٹ پر ظاہر کرتا تھا اور اپنے نئے عقیدے کی راہ میں ہر قسم کا نقصان اٹھانے کو تیار رہتا تھا۔ اسے اس پر اصرار نہیں ہوتا تھا کہ پرانی سوسائٹی میں جو حقوق اور منافع اسے حاصل تھے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سوسائٹی سے چپکا رہے۔ لیکن آج جو لوگ دین اسلام سے اپنا تعلق منقطع کرتے ہیں وہ اس پر تیار نہیں ہوتے کہ اسلامی سوسائٹی سے بھی اپنا رشتہ کاٹ لیں، حالاں کہ دنیا بھر میں اسلامی معاشرہ ہی تنہا وہ معاشرہ ہے جس کی عمارت عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اور مخصوص عقائد کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آتا۔ لیکن یہ نئے مرتدین پھر بھی چاہتے ہیں کہ (نظریاتی طور پر مرتد ہونے کے باوجود) اسلامی معاشرے میں رہیں، معاشرے کا اعتماد بھی حاصل کریں اور ان حقوق سے بھی استفادہ کرتے رہیں جو اسلام ایک اسلامی معاشرے کے افراد کو دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی نرالی صورتحال ہے کہ جس سے اسلامی تاریخ کو کبھی سابقہ نہیں پڑا۔

اب تک کی گفتگو زیادہ تر بنیادی عقائد، ایمان باللہ ایمان بالرسل، ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرۃ وغیرہ کے پہلو سے رہی اور بلاشبہ یہی پہلو سب سے اہم ہیں اور کفر وایمان اور زندقہ واسلام کے درمیان یہی حد فاصل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان فلسفوں کے اثرات کے کچھ اور بھی پہلو ہیں جن

کو سامنے لانا بھی بہت ضروری ہے تا کہ موجودہ عالم اسلام کی تصویر مکمل ہو سکے۔

ان فلسفوں نے جہاں ایک طرف عقائد اور اخلاقی قدروں کو مجروح کیا، وہاں دنیائے اسلام میں ان جاہلی جذبات و احساسات کی تخم ریزی بھی کی، جن سے اسلام نے کھل کر جنگ کی تھی اور جن پر پیغمبر اسلام نے پوری قوت سے چوٹ لگائی تھی۔ مثال کے طور پر عصبیت جاہلیہ کو لیجئے جو نسل، وطن یا قومیت کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے، پھر اس کی اس قدر تقدیس کی جاتی ہے کہ اس کی خاطر جانیں دی جاتی ہیں، اس کا ہر طرح سے دفاع کیا جاتا ہے اور اس کے پرچم تلے ایک ہو کر لڑا جاتا ہے اور اسلامی معاشرے کو بھی اسی بنیاد پر تقسیم کیا جاتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کا عقیدہ اور دین درمیان سے نکل جاتا ہے اور عصبیت لوگوں کے دل و دماغ اور زندگی کے آداب اور طور طریقوں پر تسلط حاصل کر لیتی ہے۔ یہ قوم پرستی یقیناً اسی گہرائی، قوت اور ہمہ گیر صفات کی وجہ سے آسمانی ادیان کے برابر ایک دین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس کی گرفت انسانوں کی پوری زندگی پر ہوتی ہے یہ عصبیت جب کسی معاشرے پر چھا جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کی محنتوں اور کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے اور دین جو پوری دنیا پر حاکمیت کے لئے آیا ہے وہ صرف چند عبادتوں اور رسومات کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اسلامی دنیا ایسی چند ریاستوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جو ایک دوسرے سے لڑنے میں مصروف رہتی ہیں اور اس امت کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ جس کے بارے میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿ان هذه امتكم امة واحدة و انا ربكم فاتقون﴾ (الانبیاء: ۹۲)

ترجمہ: ”بیشک تمہاری یہ امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو مجھ ہی سے ڈرو۔“

حضور ﷺ نے اس عصبیت جاہلیہ کے خلاف پوری شدت سے جنگ کی تھی۔ اس کے بارے میں امت کو صاف الفاظ میں آگاہی دی تھی، اور اس کے تمام وہ راستے بند کئے تھے جس سے یہ ابھر سکتی تھی۔ آپ ﷺ کی یہ کوششیں اس لئے تھیں کیونکہ ان عصبیتوں کے ساتھ ایک عالمی دین کے قیام کا کوئی امکان نہیں تھا اور امت واحدہ کی وحدت چار دن بھی سلامت نہیں رہ سکتی تھی۔ اس عصبیت کی

مذمت اور اس کی تردید شریعت اسلامیہ میں ایک مسلم حقیقت ہے اور اس بارے میں دین اسلام میں ان گنت دلائل موجود ہیں جو شخص بھی اسلام کا مزاج جانتا ہو یا دوسرے ادیان کی طبیعت سے واقف ہو وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کوئی بھی دین اس طرح کی قوم پرستی کو قبول نہیں کرتا اگر کوئی شخص سیاسی اور مذہبی رجحانات سے قطع نظر کر کے غور کرے تو وہ با آسانی دیکھ سکتا ہے کہ انسانوں کے درمیان تباہی یا تخریب، فساد اور تفرقے کا سب سے بڑا عامل قوم پرستی ہی ہے۔

جو شخص یہ چاہتا ہو کہ پوری امت مسلمہ ایک ہو کر متحد ہو جائے اور پوری انسانیت ایک عقیدے پر جمع ہو جائے اور ایک ایسا نیا معاشرہ تشکیل پائے جو صرف دین اور رب العالمین پر ایمان کی بنیاد پر قائم ہو اور اس معاشرے میں صلح، امن، محبت اور جوڑ پیدا ہو اور اس میں رہنے والے سب ایک ایسے جسم کے مانند ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کو تکلیف پہنچے تو سب اس کی وجہ سے بے قرار ہو جائیں، تو اس مشن کے حامل انسان کے لئے تو بالکل قدرتی اور عقلی بات ہے کہ وہ ان نسلی، قومی اور وطنی عصبیتوں کے خلاف کھلا اعلان جنگ کرے اور اس انتہائی حد تک ان کے خلاف لڑے کہ یہ قصۂ ماضی بن کر رہ جائیں اور آنے والی نسلوں کے لئے ایسی تاریخ چھوڑ جائے جو ان کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔

لیکن یورپ کے سیاسی اور ثقافتی غلبے کے بعد سے دنیائے اسلام اہل مغرب کے سیاسی اور نظریاتی پروپیگنڈے کی وجہ سے حسب نسب، ذات پات، رنگ و نسل اور وطنیت کی بنیاد پر عصبیتوں کا شکار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئی، بلکہ امت مسلمہ نے اس عصبیت کو اس طرح ایک مسلم حقیقت کے طور پر قبول کر لیا کہ اب ان کے لئے با آسانی اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ آج اس دنیائے اسلام کا حال یہ ہے کہ اس میں بسنے والی تمام قومیں حیرت انگیز حد تک ان عصبیتوں کو زندہ کرنے اور ان کے گن گانے میں مصروف ہیں جن کو اسلام ہی نے موت کی آغوش میں سلایا تھا۔ وہ عصبیتیں جو مشرکین میں اسلام سے قبل موجود تھیں اور جنہیں اسلام نے آ کر ختم کیا آج مسلمان ان کو دوبارہ زندہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہ وہ برائی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جاہلیت کا نام دیا ہے۔ یہ وہ

لفظ ہے جس سے زیادہ وحشت اور تنفر انگیز کوئی دوسرا لفظ اسلام کی لغت میں موجود نہیں، جس سے نجات پانے کو قرآن مسلمانوں پر اپنا احسان جتلاتا اور تاکید کرتا ہے کہ مسلمان اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿واذكروا نعمت الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم علىٰ شفا حفرة من النار فانقذكم منها﴾(آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: ”اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، جب تم دشمن تھے (آپس میں) تو اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور اس (اللہ) کی اس نعمت کی وجہ سے تم لوگ آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ آگ کے گڑھے کے کناروں پر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس (آگ) سے بچایا۔“

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿بل الله يمن عليكم ان هداكم للايمان ان كنتم صادقين﴾(الحجرات: ۱۷)

ترجمہ: ”بلکہ اگر تم واقعی (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔“

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿هو الذي ينزل علىٰ عبده آيات بينات ليخرجكم من الظلمات الى النور وان الله بكم لرئوف رحيم﴾(الحدید: ۹)

ترجمہ: ”اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر کھلی کھلی آیتیں نازل فرماتا ہے، تاکہ تمہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اور یقین جانو اللہ تم پر بہت شفیق، بہت مہربان ہے۔“

قرآن پاک کی یہ آیات پڑھنے کے بعد تو ایک مومن کا حال یہ ہو جانا چاہئے کہ اس ”جاہلیت“ کا جب بھی زبان پر ذکر آئے تو حقارت اور نفرت کے ساتھ آئے اور ناگواری کے جذبات چہرے سے ظاہر ہونے لگیں چاہے وہ جاہلیت اسلام سے پہلے کی ہو یا جدید دور کی روشن خیال جاہلیت۔

آپ نے کبھی کسی قیدی کو نہیں دیکھا ہوگا کہ رہائی کے بعد وہ اپنی قید و بند کی ذلتوں اور سختیوں کو یاد کرے اور اس کے رونگٹے نہ کھڑے ہو جائیں یا کیا آپ نے کبھی کسی مہلک و موذی مرض سے صحت پانے والے شخص کو دیکھا ہے کہ اسے اپنی بیماری کے ایام و احوال یاد آئیں اور اس کا دل افسردہ اور رنگ متغیر نہ ہو؟ اور کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ رات کو ڈراؤنے اور پریشان کن خواب دیکھنے والا صبح کو ان خوابوں کو یاد کرے اور خدا کا شکر نہ ادا کرے کہ یہ محض اوہام و خیالات نکلے؟ پھر جب قیدی اپنے ایام قید و بند کو خوشی سے یاد نہیں کرتا، جب صحت یافتہ مریض کے لئے اپنے ایام کرب کی یاد خوشگوار نہیں ہوتی اور جب برے خوابوں کو یاد کر کے شکر ہی ادا کرنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ خواب بس خواب ہی رہے تو جاہلیت تو ان سب سے بدتر وہ شئی ہے کہ جس میں جہل و گمراہی کی بدترین اقسام پائی جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کتنے ہی نقصانات اور خطرات اس میں پنہاں ہیں۔ اس کی یاد پر تو سزاوار ہے کہ آدمی کو شدید سے شدید تر ناگواری ہو اور بے اختیار شکر ادا کرنے کو جی چاہے کہ اس کے دن بیت گئے اور اللہ نے اسے اس تاریکی سے دور رکھا۔ اسی لئے تو حدیث صحیح میں آتا ہے:

((ثلاث من کن فیه وجد حلاوة الایمان، ان یکون الله ورسوله احب الیه مما سواهما وان یحب المرالایحبه الالله وان یکره ان یعود الی اکفریکره ان یقذف فی النار))(متفق علیه)

ترجمہ: ”جس شخص میں تین صفات پائی جائیں گی وہ ایمان کی مٹھاس محسوس کرے گا:

۱۔ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔

۲۔ اگر آدمی کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لئے کرے۔

۳۔ کفر کی طرف لوٹنا اسے اتنا ناپسند ہو کہ جتنا آگ میں جلنا۔“

اللہ تعالیٰ بہت شدت کے ساتھ جاہلیت کی خصلتوں، اس کی علامات اور نشانیوں اور ان کے بڑوں کی برائی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وجعلنا هم ائمة يدعون لی النار ويوم القيامة لاينصرون واتبعناهم فی هذه الدنيا لعنة ويوم القيامة هم من المقبوحين﴾ (القصص: ۴۱، ۴۲)

ترجمہ: ''ہم نے انہیں قائد بنایا تھا جو لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے، اور قیامت میں ان کو کسی کی مدد نہیں پہنچے گی، دنیا میں ہم نے لعنت ان کے پیچھے لگا دی ہے اور قیامت کے دن وہ ان لوگوں میں شامل ہوں گے جن کی بری حالت ہونے والی ہے۔''

اسی طرح سورۃ ہود میں فرماتے ہیں:

﴿ومامر فرعون برشيد يقدم قومه يوم القيامة فاورد هم النار وبئس الورد المورود واتبعو فی هذه لعنة ويوم القيامة بئس الرفد المرفود﴾ (ہود: ۹۷ تا ۹۹)

ترجمہ: ''حالاں کہ فرعون کی بات کوئی ٹھاکنے کی بات نہیں تھی وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان سب کو دوزخ میں لا اتارے گا۔ اور وہ بدترین گھاٹ ہے جس پر کوئی آئے اور پھٹکار اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لگا دی گئی ہے اور قیامت کے دن بھی۔ یہ بدترین صلہ ہے جو کسی کو دیا جائے۔''

لیکن آج اسلامی دنیا کے بہت سے علاقے مغرب کے فلسفے اور افکار سے متاثر ہونے کی وجہ سے اسلام سے قبل کے زمانۂ جاہلیت کے تمدن، رسم و رواج اور ان کی تہذیب کی طرف لوٹنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں اور ان کو اس زمانے سے دلی لگاؤ پیدا ہوتا جا رہا ہے اور ان میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس زمانے کے دینی شعائر کو دوبارہ زندہ کریں اور ان کے کارناموں کو رہتی دنیا تک زندہ جاوید رکھیں جیسے وہ کوئی تاریخ کا زریں دور ہو یا وہ تہذیب کوئی ایسی بڑی نعمت ہو جس سے اسلام نے ان کو محروم کر دیا ہو۔ جاہلیت کے اس دور کی طرف واپسی کو پسند کرنا درحقیقت اسلام کی بیش بہا نعمتوں کا انکار، اللہ جل شانہ کے احسانات کی ناشکری، رسول ﷺ کی ناقدری، آپ ﷺ کی قدر و منزلت سے ناواقفیت اور حد درجہ کی جہالت ہے۔

ان تمام باتوں کا مطلب تو یہ ہوا کہ کفر و بت پرستی کی برائی دلوں سے نکل گئی اور جاہلی

خرافات سے کوئی نفرت باقی نہ رہی۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ ایک صاحب ایمان باشعور مسلمان کے متعلق ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عقائد تو وہ ہیں کہ جس پر ایمان سلب کرلیا جاتا ہے اور اسلام کی دولت چھین لی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ٹھہرنے کی بجائے اس کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ولاتر کنوالی الذین ظلموافتمسکم النار ومالکم من دون الله من اولیاء ثم لاتنصرون﴾(هود: ۱۱۳)

ترجمہ: ''اور مسلمانو! ان ظالم لوگوں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، کبھی دوزخ کی آگ تمہیں بھی آپکڑے، اور تمہیں اللہ کو چھوڑ کر کسی قسم کے دوست میسر نہ آئیں پھر تمہاری کوئی مدد بھی نہ کرے۔''

فتنۂ مادیت

ان عصبیتی رجحانات کے علاوہ ایک اور فتنہ بھی ہے جس سے عالم اسلام دوچار ہے، وہ فتنہ آنکھیں بند کرکے مادیات کے پیچھے پڑنے کا رجحان ہے یعنی ہر عقیدہ اور ہر شے مال پر قربان۔ دوسرے الفاظ میں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا۔ مذہبی روحانیت سے لاتعلق خواہشات اور ہوس کا پجاری ہونا۔ اس فتنے کا نقصان یہ ہوا کہ مسلم معاشرے میں مال کمانے کی ایک دوڑ لگ گئی، اخلاقی بے راہ روی اور بے حسی اپنے عروج کو پہنچ گئی، اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھا جانے لگا، فسق وفجور اور شراب نوشی جیسے بڑے بڑے گناہ عام ہوگئے، اسلام کے مقرر کردہ حدود وقیود اور فرائض سے آزادی کا ایسا حال ہوگیا کہ جیسے اسلام کا اس معاشرے سے کوئی تعلق ہی نہیں یا اسلامی شریعت منسوخ ہوچکی ہے اور اب اس پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ اسلامی دنیا کے دینی اور اعتقادی حالات کی اجمالی تصویر ہے یہ جاہلیت کے طوفان کا ایک ایسا خطرناک ریلا ہے کہ جس نے اسلامی دنیا کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور یہ اسلامی دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑا سانحہ ہے۔ عالم اسلام پر ہونے والے اب تک

کے حملوں میں ان فتنوں کے اثرات سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ ملت اسلامیہ پر دشمن کے ان فکری حملوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی شرانگیزیوں کا شعور رکھنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں جو ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں یونانی فلسفے کی وجہ سے جونہی الحاد و زندقہ پھیلنا شروع ہوا تو فوراً اس کے مقابلے کے لئے ایسے لوگ میدان میں نکل آئے جو اپنی دانشمندی، بے مثل ذکاوت، قوی علم اور پر اثر شخصیت کے ذریعے اس فلسفے کے خلاف لڑے۔ اسی طرح فرقہ باطنیہ اور ملاحدہ بھی پیدا ہوئے لیکن ان کے خلاف بھی علم و حکمت اور دلیل و برہان کی تلواریں لے کر اسلام کے سرفروش میدان میں آ کودے تھے۔ چنانچہ اسلام ان بروقت نصرتوں کی بناء پر علمی اور عقلی اعتبار سے ایسی مضبوط پوزیشن میں رہا کہ مخالفت کی موجیں اٹھتیں اور سر ٹکرا کر واپس چلی جاتیں۔ سیلاب کے ریلے آتے اور بے اثر ہو کر گذر جاتے۔

آج دنیائے اسلام کا اولین مسئلہ اخلاقی تنزلی کا نہیں اور نہ ہی عبادات و نوافل میں کمزوری، نہ شعائر اسلام کو چھوڑنا اور غیروں کی تقلید کرنا آج کے بنیادی مسئلے ہیں، اگرچہ یہ مسائل بھی انتہائی اہمیت کے حامل اور بھرپور توجہ کے مستحق ہیں لیکن وہ مسئلہ جو آج طوفان بن کر کھڑا ہوا ہے اور پورا عالم اسلام اسی کی زد میں آیا ہوا ہے وہ اسلام پر ثابت قدم رہنے یا اس سے دستبردار ہونے کا مسئلہ ہے۔

اسلامی دنیا میں آج ایک معرکہ برپا ہے، جس میں ایک طرف تو مغرب کا سیکولر (بے دین) فلسفہ ہے تو دوسری طرف آخری آسمانی دین اسلام ہے! ایک طرف مادیت کا سیلاب ہے تو دوسری طرف آسمانی شریعت! یوں لگتا ہے کہ یہ دین اور بے دینی کے درمیان آخری معرکہ ہوگا جو کہ دنیا کی تقدیر کا فیصلہ کرے گا۔

آج کا جہاد، آج کی خلافت نبوت اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ لادینیت کی ان طوفانی موجوں کا مقابلہ کیا جائے اور آگے بڑھ کر ان قوتوں کے دل اور ان کے مرکز پر حملہ کیا جائے جو عالم اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہیں اور عالم اسلام پر

بے دینی کی یلغار کر رہی ہیں۔ آج نئی نسل کے دلوں میں دوبارہ اسلام کے اصول و عقائد، اس کی حقیقت اور قوانین اور محمد ﷺ کی رسالت پر کمزور ایمان کو یقین اور پختگی میں بدلنے کی ضرورت ہے اور ان کے دلوں میں راسخ ہوتی ہوئی نظریاتی کمزوری، اپنے دین پر عدم اعتماد اور اضطراب و بے چینی کی اس کیفیت کو ختم کرنے کی ضرورت ہے کہ جس میں ہمارا روشن خیال طبقہ مبتلا ہے۔ انہیں اسلام پر مطمئن کرنا اور ان کے تمام جاہلی افکار اور نظریات جو ان کے دلوں میں گھر کر گئے ہیں، ان کے خلاف علمی اور عقلی دلائل پر مبنی جدوجہد کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، یہاں تک کہ اسلامی فکر اور اسلامی نظریات ان کی فطرت بن جائیں۔

مکمل ایک صدی سے یورپ ہماری نوجوان نسل اور ہماری عقلوں پر چھاپے مار رہا ہے اور ہمارے ذہنوں میں مذہب کے بارے میں شک، الحاد، منافقت، بے ایمانی اور ایمان بالغیب پر بے اعتمادی کے بیج بو رہا ہے اور اس کے عوض ہمیں جدید اقتصادی اور سیاسی فلسفوں کے جال میں پھنسانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم میں ان نئے فلسفوں سے اسلام کے دفاع کا کوئی شعور اور فکر پیدا نہیں ہوئی اور ہم اپنے اسلاف کی علمی میراث پر ہی تکیہ کیے بیٹھے رہے اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس ترکہ پر اضافہ کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ یورپ کے ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں۔ ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نذر ہوتا رہا اور اس غفلت کے نتیجے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ گذشتہ عرصے میں اسلامی معاشرہ ایمان اور عقیدے کے لحاظ سے برابر تنزلی کا سامنا کرتا رہا اور اسلامی ممالک میں حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ آ گئی جو نہ تو اسلام کے بنیادی اصولوں اور عقیدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے دفاع کو ضروری سمجھتے ہیں اور نہ ان کا مسلم عوام کے ساتھ سیاسی مصلحتوں کے علاوہ کوئی تعلق ہے۔ بے دینی کی اس فکر کو آہستہ آہستہ ادبیات، رسم و رواج، صحافت اور سیاست کے ذریعے عوام کی طرف راہ مل گئی یہاں تک کہ مسلم عوام اس بے دین طبقے کی مکاری اور

معاشرے پر اثر رسوخ کی وجہ سے ان کے جھانسے میں آگئی اور کاروبار زندگی کی لگامیں ان کے ہاتھ میں تھما دیں حالاں کہ مسلم عوام میں خیر، صلاح اور اچھی صلاحیتیں موجود ہیں اور دنیا میں وہ بلند معاشروں میں شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر یہی حال رہا تو الحاد و فساد مسلم معاشرے پر اثر انداز ہونے کے لئے مزید راستے ڈھونڈ لے گا یہاں تک کہ ان لوگوں تک بھی پہنچ جائے گا جو گاؤں اور قصبوں میں رہتے ہیں اور ان کا پیشہ صنعت و زراعت ہے جیسے کہ اس سے قبل یورپ میں ہوا اور اگر بتوفیق خداوندی اس کا راستہ نہ روکا گیا تو مشرق میں بھی یہی تاریخ دہرائی جائے گی۔

اسلامی دنیا کو آج ایک نئی اسلامی دعوت کی ضرورت ہے جس کا نعرہ ہو:

“الی الایمان جدید”

“آؤ پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کرو”

لیکن تنہا یہ نعرہ کافی نہیں، آج کام سے پہلے ایک حکیمانہ دعوت کی ضرورت ہے کہ وہ طبقہ جو اپنے آپ کو روشن خیال کہتا ہے اور عوام کے تمام اختیارات کا مالک بنا ہوا ہے، کس طرح اس کو دوبارہ اسلام کی طرف لوٹایا جائے؟ اور کس طرح ان کے دلوں میں دوبارہ اپنے دین پر یقین کو جاگزیں کیا جائے؟ اور کیسے ان کو زمانے کے بے دین فلسفے، تمدن اور مغربی ترجیحات سے آزاد کیا جائے؟ اسلامی دنیا کو آج ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو اس دعوت کے لئے اپنے آپ کو بالکل فارغ کریں، اپنے علم، استعداد اور دیگر وسائل کو اس راستے میں صرف کریں، وہ ایسے لوگ ہوں جن کو نہ منصب کی ضرورت ہو نہ مال اور مرتبہ کی، نہ ملازمت نہ نوکری اور نہ حکومت کی تلاش ہو، نہ ہی وہ کسی کے لئے دل میں بغض رکھتے ہوں، وہ لوگوں کو تو فائدہ پہنچائیں لیکن اپنے ذاتی مفاد کو بالکل بھول جائیں، وہ ایسے لوگ ہوں جو لوگوں کو دینے والے ہوں ان سے مانگنے والے نہ ہوں۔ اگر کوئی طبقہ کسی چیز کے لئے مرتا ہو تو وہ چیز اسی کے لئے چھوڑ دیں حتیٰ کہ ان پر کوئی تہمت نہ لگائی جا سکتی ہو اور شیطان ان کے خلاف کوئی ہتھیار فراہم کر کے نہ دے سکتا ہو۔ اخلاص ان کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی

عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز ہو! اور جو انہیں مغرب کے ان فلسفوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے، جنہیں ان میں سے کچھ نے تو سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر نے محض وقت کی ہوا سے متاثر ہو کر حرز جان بنا لیا ہے۔ ان کے ذہنوں اور فکروں میں اسلامی تعلیمات دوبارہ جاگزیں ہو جائیں، ان کا دل و دماغ دوبارہ اسلام سے سیراب ہو جائے۔ اس کام کے لئے عالم اسلام کے ہر گوشہ میں آج ایسے ارباب عزیمت درکار ہیں، جو معرکہ کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوں جو دین کو سیاست سے الگ رکھنے کے قائل ہیں اور دین کی ایسی تعبیر اور تفسیر کرتے ہیں کہ جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچہ میں خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو، فٹ ہو جائے، اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ ہی ان لوگوں میں سے ہوں جو سیاست کو قرآن میں مذکور شجرہء ملعونہ کا مصداق سمجھتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں، جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک یہ دعوت دیتا رہوں گا۔ چاہے حالات کے تقاضے، دینی حکمت اور تدریج کو سامنے رکھتے ہوئے مقصد کی طرف چلنے میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔

اب تک ہماری کوششیں اور ہماری صلاحیتیں، ہمارے وسائل اور ہمارے اوقات سیاسی اور تنظیمی تحریکات کی نذر ہوتے رہے ہیں صرف اس بنیاد پر کہ عوام مومن ہے اور وہ روشن خیال صاحب اقتدار لوگ جو عوام کی قیادت کر رہے ہیں بنیادی طور پر مومن لوگ ہیں کیونکہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور عقائد پر یقین رکھتے ہیں اور اسلام کی سربلندی اور عملی نفاذ کے لئے جنون کے درجے میں کام کرتے ہیں لیکن صورتحال اس کے برعکس ہے۔ قوم کا یہ حال ہے کہ ایمان میں ضعف اور اخلاق میں انحطاط آ چکا ہے، لیکن اس کا نہ ہمیں پتہ چلا نہ خود قوم کو شعور ہوا اور روشن فکر طبقے کا حال یہ ہے کہ مغربی فلسفوں اور

سیاست واقتدار کے اثر سے، بیشتر افراد میں عقیدہ گویا پگھل چکا ہے، بلکہ بہت سوں کا حال تو یہ ہو چکا ہے کہ اسلامی عقیدے کے کھلے باغی بن چکے ہیں اور مغربی فلسفوں اور ان فلسفوں کے لائے ہوئے افکار و عقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان لا چکے ہیں اور ان کے لئے دنیا سے لڑ جانے کا جوش و ولولہ اور ان کی نشر و اشاعت کا جنوں اپنے اوپر سوار رکھتے ہیں۔ انہیں یہ فکر ہے کہ زندگی کا نظام ان فلسفوں کی روشنی اور ان کی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور ان کی یہ کوشش ہے کہ پوری قوم کو اس لادینیت سے مانوس کیا جائے۔ پھر عمل کے میدان میں بعض جلد باز ہیں اور بعض درجہ بدرجہ کام کرنے کے عادی ہیں، بعض ان لادینی مغربی نظریات کو بزور بازو قوم پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اور بعض قوم کو اس شیشے میں خوبصورتی کے ساتھ اتارنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ لیکن طریقہ کار کے اس اختلاف کے باوجود ہدف اور آخری مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

ایسے لوگوں کے سامنے ردعمل کے طور پر کام کرنے والے علماء دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ان نظریات کے حامل لوگوں کے خلاف سخت رویہ اپناتے ہیں۔ ان کی تکفیر کرتے اور ان کے سائے سے بھی دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ علماء ان بے دین نظریات اور تہذیب کے اسباب اور بنیادوں کو معلوم کرنے کی جستجو نہیں کرتے اور نہ اس طبقے کی اصلاح کرنے اور ان کی حالت بدلنے کی کوئی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا اس طبقے کے ساتھ میل جول پیدا کیا جاتا اور دین اور دینداروں سے ان کی وحشت دور کی جاتی تا کہ ان کے دلوں میں موجود ایمان کے باقی ماندہ ذرات کی تربیت مؤثر اسلامی دعوت کے ذریعے کی جا سکتی اور ان کے مال و دولت اور منصب سے مستغنی ہو کر آہستہ آہستہ مخلصانہ طریقے سے ان کے دلوں کو پھیرا جاتا۔

دوسرا طبقہ ان علماء کا ہے جو ان کے ساتھ تعاون تو کرتے ہیں مگر دنیاوی مصالح اور منافع حاصل کرنے کے لئے ایسے لوگ ان سے مال و جاہ کے فوائد تو حاصل کرتے ہیں، مگر ان کی اصلاح اور ان کو کسی قسم کا دینی فائدہ پہنچانے کا سوچتے بھی نہیں۔ یہ مفاد پرست لوگ نہ دعوت الٰہیہ دیتے ہیں اور نہ

کسی قسم کی دینی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے اندر اس بگڑے ہوئے طبقے کی اصلاح کی کوئی فکر نہیں پائی جاتی۔

ایسا کوئی گروہ نہیں، جو اس صورتحال پر دردمند ہو۔ جو سمجھے کہ یہ روشن خیال طبقہ ایک ایسا مریض ہے جسے علاج کی ضرورت ہے اور پھر اس کے علاج کی فکر کرے، حکمت اور نرمی کے ساتھ دین کی دعوت لے کر اس میں گھسے اور بے لوث نصیحت کا حق ادا کرے، ایسا کوئی تیسرا گروہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اس مغرب زدہ حصے کو دین اور دینی ماحول سے قریب ہونے کا کوئی موقع نہیں ملتا، اس کی ساری زندگی اس ماحول سے وحشت اور دوری میں کٹ جاتی ہے اور پھر اس وحشت کو اہل دین کا وہ گروہ اور زیادہ بڑھا دیتا ہے جو اس کا سیاسی حریف اور فریق بن کر میدان میں اتر آیا ہے۔ ایسے ہی ایک وہ گروہ بھی اس بعد و وحشت میں اضافے کا سبب بنتا ہے جو دین کے نام پر اس طبقے سے جاہ و منصب اور حکومت و سلطنت کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ دین سے مزید خائف ہو جائیں اور بغض و عناد میں اور آگے بڑھ جائیں۔ کیونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جو شخص اس سے اس کی دنیا چھیننے کی کوشش کرتا ہے یہ اس سے بغض رکھتا ہے اور ان لوگوں سے بھی بغض رکھتا ہے جو اس سے حکومتی اختیارات چھینتے ہوں کیونکہ وہ اپنی بقا صرف حکومت اور اقتدار ہی میں سمجھتا ہے اور ان لوگوں سے بھی کینہ رکھتا ہے جو اس کو عیاشی اور مزوں سے محروم کر دے کیونکہ وہ مادیات اور دنیاوی مزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو پہچانتا ہی نہیں۔ اسلامی دنیا کو آج مخلص مسلمانوں کے ایک ایسے طبقے کی ضرورت ہے جو ذاتی اغراض سے صرف نظر کر کے دین کی طرف مخلصانہ دعوت دے، جو ہر اس چیز سے دور ہوں جو لوگوں میں یہ بدگمانی پیدا کرے کہ ان لوگوں کا مقصد مادیات، ذاتی مفاد اور اپنی قوم یا سیاسی تنظیم کے لئے حکومت کا حصول ہے اور جو اس طبقے سے میل ملاقات کے ذریعے، مراسلت، گفتگو، دعوتی اسفار، پر اثر اسلامی ادب، شخصی روابط، پاکیزہ کردار، بلند خلاق، زہد و استغناء اور پیغمبرانہ اخلاق کی پر اثر نمائندگی کے ذریعے ان نفسیاتی اور عقلی

گرہوں کو کھول دیں، جو مغربی علوم نے پیدا کی ہیں یا جو دینی طبقے کی بے تدبیری، کم فہمی، کم نظری اور اسلام اور اس کے صحیح ماحول سے بُعد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔

یہی وہ گروہ ہے جس نے ہر دور میں اسلام کی خدمت کی ہے۔ اموی سلطنت کا رخ پھیر دینے اور تخت خلافت پر عمر بن عبدالعزیز کو لا بٹھانے کا سہرا اسی گروہ کے سر ہے، اور پھر ہندوستان میں مغل سلطنت میں اسی نوعیت کا انقلاب بھی اسی گروہ کی مرہون منت ہوا۔ اکبر جیسے طاقتور بادشاہ نے اسلام سے انحراف کر کے اور کھلی اسلام دشمنی پر کمر باندھ کر گویا یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس اسلامی براعظم کو جو چار صدیاں اسلامی حکومت کے سایہ میں گذار چکا تھا پھر پرانی جاہلیت کی طرف دھکیل دے۔ لیکن ایک حکیمانہ دعوت اور ایسے حکیم اور داعی اسلام مجدد الف ثانیؒ جو دعوت دین میں اخلاص کی اہمیت اور اسلام اور اسلامی دعوت کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے، ان کی اور ان کے جانشینوں کی باحکمت کوششوں کے طفیل برصغیر ہندوستان کو ایک بار پھر پہلے سے بھی مضبوط اور اچھے انداز میں اسلام کی طرف موڑ دیا، اس کے بعد اکبر کے تخت پر پے در پے ایسے بادشاہ آئے جن میں سے ہر ایک اپنے پیشرو سے بہتر تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے تخت پر ایک ایسا بادشاہ بھی براجمان ہوا جس کے ذکر اور کارناموں سے اسلام اور اصلاح کی تاریخ کو زینت ملی اور وہ اورنگ زیب عالمگیر تھے جن کی طرف فتاویٰ عالمگیریہ منسوب ہے۔ نظریاتی ارتداد کا مقابلہ ایسا اہم فریضہ ہے جس میں ایک دن کی تاخیر کی بھی گنجائش نہیں۔ آج اسلامی دنیا کے بااختیار ممالک اور باصلاحیت نسل کو ارتداد کے اس طوفان کے ایک خطرناک ریلے کا سامنا ہے جو کہ مسلمانوں کے عقیدے، اخلاق اور تہذیب کے خلاف ایک بغاوت ہے اور اگر اسلامی دنیا نے یہ اثاثہ ضائع کر دیا کہ جسے رسول ﷺ نے ان کے لئے بطور میراث چھوڑا ہے اور مسلم نسلوں نے اسے نسل در نسل محفوظ کیا ہے اور اسلام کے غیرت مند سپوتوں نے اس کے دفاع کے لئے جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں، تو پھر اسلامی دنیا کی بقا بھی خطرے میں پڑ جائے گی لہٰذا ضروری ہے کہ یہ موضوع ان تمام لوگوں کی توجہ کا

مرکز بنے جو اسلام کا غم رکھتے ہوں۔ (۱)

---

(۱) علامہ ندوی رحمہ اللہ نے اس دور میں مغربی فلسفہ کے پرستاروں (مرتدوں) کے علاج کے لئے ایک علمی، دعوتی، پرشفقت اور صوفیانہ جدوجہد کا طرزِ عمل پیش کیا ہے۔ یہ اسلوب اپنے وقت میں فطری اعتبار سے ایک صحیح اسلوب تھا لیکن علامہ ندوی رحمہ اللہ نے یہ مقالہ کئی سال پہلے اس وقت کی نظریاتی، سیاسی، اجتماعی اور انتظامی حالات کے تناظر میں لکھا تھا اور اس وقت کے نام نہاد مسلمانوں (مرتدین) نے اگرچہ ایک طرف علمی طرز پر اسلام سے منحرف ہونے کا راستہ اپنایا ہوا تھا لیکن کفر کی قیادت میں اس کے پرچم تلے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع نہیں کی تھی بلکہ منافقت، جعل سازی، ریاکاری اور جھوٹ سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں سے ہمدردی کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ اس لئے علامہ ندوی صاحب رحمہ اللہ اس طرح کے نظریاتی انحراف کے علاج کے لئے نظریاتی وسائل کو بروئے کار لانے کی وصیت کرتے ہیں لیکن اب جبکہ یہ مرتدین علانیہ طور پر کفر کے پرچم تلے ان کی صفوں میں کھڑے ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے رحم عسکری جنگ میں مصروف ہیں اور کفار کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمہ وقت مصروفِ عمل ہیں اور انہوں نے امت مسلمہ کے ساتھ مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ کسی بھی جگہ اسلام کی حاکمیت اور شریعت کا نفاذ اُن کے لئے قابل قبول نہیں اور اگر کوئی اس کی کوشش کرتا بھی ہے تو لازمی طور پر اسے بے رحمی کے ساتھ کچل دیا جاتا ہے یا اسے ملک بدر کر دیا جاتا ہے اس صورتحال میں لگتا ہے کہ ایسے لوگوں کا علاج وہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور کے ارتداد کو ختم کرنے کے لئے کیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مغربی فکر رکھنے والے تمام لوگوں کو ایک ہی ترازو سے تولا جائے ہو سکتا ہے کہ بعض کم عمر اور ناسمجھ اب بھی شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کا شکار ہوں، یا کفریہ ممالک اور باطل قوتوں کے پرچار کی زد میں آ کر ان سے متاثر ہو گئے ہوں لہٰذا اس قسم کی نظریاتی گمراہی سے ان کو نکالنے کے لئے ان کی طرف مصلحانہ ہاتھ بڑھانا بھی اسلامی فکر کے ہم خیال اور مخلص داعیوں کا فریضہ ہے۔

امریکی یونیورسٹیاں

الله
بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخی پس منظر

اسلام کی ابتداء ہی سے مغرب نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اسلام کو اپنے تسلط میں رکھے اور اس کی حاکمیت ختم کر دے، اس مقصد کے لیے اس نے صلیبی جنگیں شروع کیں اور القدس پر قبضہ کرنے کے لیے کئی صدیوں تک مسلسل لشکر جمع کیے اور لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، چنانچہ گاڈز کہتا ہے:

> ''صلیبی جنگوں کے ذریعے ہمارے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ القدس کو ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے تسلط سے نکال لیں اور اسلامی دنیا کے قلب میں ایک مسیحی مملکت بنالیں۔''

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

> ''صلیبی جنگیں القدس کو قبضہ کرنے سے زیادہ اسلام کو ختم کرنے کی نیت سے لڑی جا رہی تھیں''

بعد میں یہی صلیبی جنگیں استعماری جنگوں کی شکل میں بدل گئیں جو ظاہراً اقتصادی شکل میں کی جاتی تھیں جس نے پوری اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کو محکوم رکھا اور شریعت کو زبردستی ان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی سے الگ کر دیا اگرچہ اُس وقت بھی اسلام لوگوں کے دلوں میں بسا ہوا تھا لیکن جب بیسویں صدی کے شروع میں آزادی کی تحریکوں کے نتیجے میں یورپ کی استعماری حکومت سمٹنے لگی تو انگریزوں نے ایک خاص طرز پر دوسری عالمی جنگ کے بعد اپنا استعماری طریقہ کار امریکہ کے حوالے کر دیا، اس لیے کہ اس وقت انگریزوں کے ستارے غروب ہونے لگے تھے اور امریکہ کے ستارے طلوع ہو رہے تھے۔ امریکہ نے یورپ کے استعماری دور کی حاکمیت کی مشکلات سے سبق حاصل کرتے ہوئے اسلامی ممالک کو قبضے میں لینے کے لیے ایک دوسرا طریقہ اپنایا جس کی بنیاد کلیسا کی کوشش اور تعلیمات پر قائم تھی۔ امریکہ نے عیسائی مبلغوں کو یہ ذمہ داری سونپی کہ یورپ کے زیرِ تسلط اسلامی ممالک میں اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے ذریعے ایک ایسی نئی نسل تیار کریں جو صرف نام کے مسلمان ہوں لیکن اس سے زیادہ اسلام کے ساتھ ان کو کوئی ہمدردی نہ ہو۔ ان کا

دین، فکر، اخلاق، ثقافت اور زندگی کے طور طریقے امریکی ہوں تاکہ اس نئی نسل کو تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامی ممالک کے اختیارات حوالے کیے جاسکیں اور اسلامی ممالک کے نظام کو ہمیشہ کے لئے مغربیت (Westernization) میں بدل دیا جائے۔

کلیسا نے اسلامی ممالک میں ایسے تعلیمی مراکز اور ادارے بنائے جو اصل میں تو صلیبی استعماری جنگوں کے مقاصد پورے کرنے کے لیے جنگی گروپ تھے لیکن ظاہراً تعلیم، انسانیت اور رحم دلی کے بلند بانگ دعوے کرتے تھے۔

"لطفی لیفونیان ارمنی منصر" کہتا ہے کہ یورپی ممالک نے جب صلیبی جنگوں میں شکست کھائی تو انھوں نے سوچا کہ مسلمانوں کے خلاف ایک دوسری صلیبی جنگ تعلیم اور تبلیغ کے ذریعے شروع کی جائے اور اس کے لیے انہوں نے کلیساؤں، مسیحی تبلیغ، اسکولوں، یونیورسٹیوں اور شفاخانوں کو کام پر لگایا اور ہزاروں مسیحی مبلغین کو اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔

امریکہ کی یہ منصوبہ بندی بہت کارگر واقع ہوئی کیونکہ نہ صرف یہ کہ اسلامی ممالک کے لوگ ان سے نفرت نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے مصارف خرچ کر کے اپنی اولادوں کو ان کے سامنے سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے بٹھا دیا اور نئی نسل کے مستقبل کو مسیحی مبشروں (تبلیغیوں اور داعیوں) کے حوالے کر دیا۔

مسیحیت تعلیم کے پردے تلے

جب امریکی پروٹسٹنٹ مسیحی مبشرین (Missionary) مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اسلامی دنیا میں لوگ مسیحیت کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں بلکہ مسلمانوں میں یورپ کے استعماری مظالم کی وجہ سے مسیحیت کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے اور بعض علاقوں میں جو اس وقت تک عثمانی خلافت کے ماتحت تھے، وہاں کے حکام نے عیسائیت کی تبلیغ کی مخالفت بھی کی ہے تو امریکی عیسائی مبلغین نے دو اہم کام کیے۔

۱۔ ان عیسائی مبلغین نے اپنی سرگرمیاں ان علاقوں میں شروع کیں جن میں پہلے سے مسیحی اقلیت موجود تھی جیسے لبنان اور مصر وغیرہ، اور ان علاقوں کو دیگر علاقوں کے لیے مسیحی سرگرمیوں کے مراکز کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا اور دنیا کو یہ تاثر دیا کہ وہ صرف ان ہی علاقائی عیسائیوں کے لیے کام کر رہے ہیں لہٰذا کوئی ان پر اعتراض نہ کرے۔

۲۔ اپنے منصوبے کو پہلے مرحلے میں بہترین تعلیمی مراکز کی شکل میں پیش کیا جو تدریس اور نظم وضبط کے بلند معیارات پر قائم تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ گذرنے کے بعد علاقے کے مسلمانوں میں مالدار طبقے کے لوگوں نے اپنی اولاد کو ان تعلیمی مراکز میں داخل کرا دیا اور وقت گزرنے پر پے در پے کوششوں اور علاقائی حکام میں اثر ورسوخ پیدا کرنے کے بعد یہ اسکول اعلیٰ تعلیم کے بڑے مرکزوں میں بدل گئے جن میں سے بعض بعد میں (American Universities) امریکی یونیورسٹیوں کی شکل میں سامنے آئیں، اگلے صفحات میں ہم ان یونیورسٹیوں کی بعض باتوں کو قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

امریکی یونیورسٹیوں کے لیے اسلامی دنیا میں اہم مراکز کا انتخاب

امریکی تبلیغیوں (Missionaries) نے یونیورسٹیوں کی بنیادوں کے لیے ایسے علاقے منتخب کیے جہاں ایک طرف تو وہ آزادی کے ساتھ اپنا کام کر سکیں اور دوسری طرف اس علاقے کی سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور دینی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے آس پاس کے علاقوں میں بھی اپنا اثر ورسوخ پیدا کر سکیں، لہٰذا ایسے علاقوں کا انتخاب امریکی سرگرمیوں کے فروغ میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ ان علاقوں میں سرِ فہرست لبنان، قاہرہ اور استنبول تھے اور اب کابل بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ ہر علاقے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ سطریں پیش کی جاتی ہیں۔

بیروت (لبنان)

امریکی یونیورسٹی بنانے کے لیے لبنان اس لیے اہم تھا کہ ایک طرف تو بحر متوسط کے کنارے یورپ کے سامنے واقع ہے اور امریکا کے لیے سمندر کے راستے سے سیدھی راہ ہے، دوسری طرف بیروت میں پہلے سے غیر مسلم اقلیتیں جیسے مارونی، عیسائی، درزیان، آرمینی اور اسماعیلی رہتے تھے جو امریکی سرگرمیوں کے لیے اچھے مواقع فراہم کر سکتے تھے اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ لبنان سے مصر، عراق، فلسطین، اردن اور جزیرۂ عرب کو بہتر طریقے سے عیسائیوں کے زیرِ اثر لایا جا سکتا تھا۔

قاہرہ (مصر)

مصر ایک طرف تو بحر متوسط کے کنارے واقع ہے اور دوسری طرف ایشیاء اور افریقہ کے دو براعظموں کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ الازھر یونیورسٹی نے سیاسی مرکز ہونے کی وجہ سے پورے شمالی اور مرکزی افریقہ کے لیے ایک علمی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں محمد علی کے حاکم گھرانے نے جب مغرب کی طرف رخ کیا تو انھوں نے مصر کو عثمانی خلافت سے الگ کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مصر میں ہر چیز کو مغربی ثقافت میں ڈھال دیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ پہلے فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں کے تسلط کے زمانے میں مصر کے نصرانیوں (قبطیوں) نے بھی خوب ترقی کی، ان سب نے امریکی مبلغین کے لئے عیسائی اور مغربی تعلیم کے فروغ اور امریکی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے زمین ہموار کی۔

استنبول (ترکی)

استنبول جو تقریباً پانچ صدیوں تک ترکی میں اسلامی خلافت کا مرکز رہا اور دنیا میں خوبصورت مسجدوں والا شہر ہونے کی وجہ سے میناروں کا شہر کہلایا جاتا تھا اور اس کے علاوہ یہ شہر عثمانی خلافت کا پایہ تخت بھی رہا، وہ عثمانی خلافت کہ جس نے ہر طرف فتوحات کے انبار لگا دیئے تھے حتیٰ کہ مشرقی یورپ

میں بھی بہت سے علاقے فتح کر لیے تھے لیکن بالآخر اسے بھی یہودی اور مسیحی منصوبہ بندیوں کی وجہ سے زوال کا سامنا ہوا، اس خلافت کا مرکز استنبول بھی امریکی مسیحی تبلیغیوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے دل کو باہ لینے والی جگہ تھی اس لیے وہاں انہوں نے سب سے پہلے "رابرٹ کالج" کی بنیاد رکھی جو بعد میں سیکولر ترکی (لامذہب ترکی) کے زمانے میں امریکی یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

کابل (افغانستان)

افغانستان جو تاریخ کے ایک طویل عرصے تک اسلام کا ایک مضبوط قلعہ اور جہاد اور قربانیوں کا ملک مانا جاتا رہا اور اس کے باشندے ہمیشہ مضبوط ایمانی قوت سے دنیا کی بڑی بڑی فوجوں کے مقابلے میں ڈٹتے رہے اور دشمن کا زوال بھی اسی سرزمین سے شروع ہوا، یہ ملک اسلامی دنیا میں بہت اہمیت رکھتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سرزمین کے لوگ ہمیشہ سے ایمان، شریعت، اسلامی ثقافت، ملی اور اخلاقی اقدار کو مضبوطی سے تھامے رہے ہیں اور انھوں نے کبھی بھی غیروں کی ثقافت کو قبول نہیں کیا، اسی فطری اور خالص اسلامی مزاج کی وجہ سے اور اپنے عظیم جہاد کے نتیجے میں چودہ سو سال بعد بھی اسلام کے عہد اول کی طرح ایک اسلامی نظام قائم کر دکھایا، یہ کام مغرب اور خاص طور پر امریکہ کے لیے جو کہ "گلوبلائزیشن" کے نام پر ساری دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا تھا اور اپنے پرچم تلے لانا چاہتا تھا، ناقابلِ قبول تھا اسی لیے اس نے اپنے صلیبی اتحادیوں کے ساتھ ملکر افغانستان کے خلاف بڑی صلیبی جنگ کا آغاز کیا اور کابل پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد اس شہر میں ایک امریکی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، جس کی مزید تفصیلات ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

اسلامی دنیا میں امریکی یونیورسٹیاں کیوں؟

جب یورپ اور خاص طور پر امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسلامی دنیا کے ہزاروں مسلمان نوجوان پڑھتے ہیں اور ان کے ماحول سے متاثر ہو کر ان کے ہم خیال بن جاتے ہیں تو پھر اسلامی ملکوں

میں امریکی یونیورسٹی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سوال کا جواب سب سے پہلے بیروت میں قائم ایک امریکی یونیورسٹی کے بانی Denial Bliss نے ۱۸٦۲ء میں یہ دیا تھا:

"لبنان میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بڑا ادارہ بنانا اس لیے ضروری ہے کہ اکثر اسلامی دنیا کے وہ نوجوان جو مغرب اور امریکی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں وہ واپس اپنے ملکوں میں نہیں آتے تاکہ یہاں امریکی مبلغین کے ساتھ مستقل تعاون کریں بلکہ وہیں مغرب میں ملازمتوں اور مصروفیات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف "سیمون کالھون" کے مکتب کے فضلاء جو ۱۸۳۵ء میں لبنان میں قائم ہوا تھا، عملاً مسیحی مبلغین کے مکاتب میں اساتذہ، مبلغین اور حکومتی عہدیداروں کی حیثیت سے اسلامی ممالک میں کام پر لگے ہوئے ہیں اسی ضرورت کے پیشِ نظر امریکی تعلیمی ادارے اسلامی ممالک میں اپنے اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کرتے ہیں"۔

اسلامی ممالک میں امریکی یونیورسٹیوں کے مقاصد واغراض

قبل اس کے کہ ہم اسلامی ممالک میں مشہور امریکی یونیورسٹیوں کی تفصیلات بیان کریں، ضروری ہے کہ عمومی طور پر اختصار کے ساتھ وہ اہداف اور مقاصد بیان کیے جائیں جن کے حصول کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کر کے یہ یونیورسٹیاں قائم کی جاتی ہیں۔

پہلا ہدف:

مسلم ممالک کے سیاسی اقتدار کو مسخر کرنا

امریکی یونیورسٹیاں اسلامی ممالک میں اپنے طلباء کی اس طرح تربیت کرتی ہیں کہ آنے والے وقت میں ملک کی تعلیم، سیاست، اقتصاد، ثقافت اور فوجی قیادتوں میں ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ان کے ذریعے اسلامی ممالک میں سیاسی اقتدار کو مسخر کر سکیں اور ان ملکوں میں اپنی مرضی کے نظام بنا سکیں، تاریخ اور تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ امریکہ کے یہ تربیت یافتہ منافق

سیاست دان اسلام اور اسلامی قوانین اور احکام کو ختم کرنے میں یورپیوں اور امریکیوں سے بھی زیادہ ماہر اور سخت دل ہوتے ہیں۔ امریکی یونیورسٹیاں بڑی مہارت اور منظم انداز میں مسلم نوجوانوں کے دل ودماغ بدلنے (Brain washing) کا عمل انجام دیتی ہیں، ان کی فکر اور ذہن کو مغرب کے اصول، قوانین، ثقافت اور اخلاقی اقتدار کے مطابق ڈھالتی ہیں اور ساتھ ساتھ اسلام کو ایک جھوٹ افسانہ، نامعقولیت، پسماندگی، سخت دلی اور خون ریزی کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں۔ امریکی یونیورسٹیوں سے فراغت کے بعد ہزاروں نوجوان معاشرے اور نظام حکومت کے بڑے بڑے مراکز اور اہم منصوبوں کے عہدیدار تو بن جاتے ہیں لیکن اسلام کے عقیدے، اصول، اخلاق، فکر اور ثقافت سے نہ صرف یہ کہ بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ پوری شدت اور سخت دلی کے ساتھ اس کو ختم کرنے کے لیے حکومتی اور شہری اداروں کے ذریعے عملی کوششیں بھی کرتے ہیں اور اپنے معاشرے اور معاشرتی وتاریخی اقدار سے بغاوت کرتے اور غیروں کے قوانین کو رائج کرنے میں مصروفِ کار رہتے ہیں۔

دوسرا ہدف:

نئی نسل کو عیسائی بنانا

امریکی کالج نیویارک میں پروٹسٹنٹ (Protestent) مسیحی فرقے کے مرکزی کلیسا کی طرف سے بنایا جاتا ہے، اسی کی طرف سے اموال ملتے ہیں اور یہی کلیسا اس کی سرپرستی بھی کرتا ہے، اسی وجہ سے ان کا سب سے بڑا ہدف مسلم نوجوانوں کو عیسائی بنانا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی باقی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کے حصول کے لئے وسائل اور اسباب کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، جن کی تفصیلات کچھ بعد میں ذکر کی جائیں گی۔ یہ ہدف ظاہری طور پر قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی کے قیام کے اغراض میں دوسری شق میں اس طرح ذکر ہوا تھا:

''قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی کے اہداف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مصر کے قریبی ممالک کے

نوجوانوں کو عیسائیت کی تربیت دی جائے اور پھر اعلیٰ سطح پر ایک یونیورسٹی کے ذریعے پوری اسلامی دنیا کے سامنے مسیحی اخلاق اور طرز زندگی کا عملی نمونہ متعارف کرایا جائے۔“

تیسرا ہدف:

اسلام کی حقانیت سے متعلق نوجوان نسل کو شکوک وشبہات میں ڈالنا

امریکی مبلغین کو یہ معلوم تھا کہ مسلمانوں کا عقیدہ خواہ جتنا بھی کمزور ہوجائے وہ مسیحیت قبول نہیں کرتے اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی بجائے اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات میں ڈالنے کا سلسلہ شروع کردیا تاکہ یہ ان کے لئے عیسائیت میں داخل ہونے کی پہلی سیڑھی ثابت ہو۔ لہٰذا انھوں نے اسلام کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرنے کے ذریعے مسلم نوجوانوں کو اسلام کے بارے میں غیر یقینی کیفیت میں مبتلا کرنا شروع کردیا جس کے نتیجے میں نوجوانوں کو الحاد (Existentialism) اور اخلاقی بے راہ روی کی طرف موڑ دیا تاکہ مسلم نوجوان اگر عیسائی نہ ہوں تو صحیح مسلمان بھی نہ رہیں۔ یہ عیسائیت کے لیے ایک اہم کامیابی اور فتح تھی، اس ہدف کے حصول کے لیے عیسائی ایک خاص انداز سے ان گھرانوں کے نوجوانوں کو کام پر لگاتے ہیں جو معاشرے میں اثر ورسوخ رکھتے ہوں تاکہ وہ مستقبل میں نسل درنسل معاشرے میں قدرت واختیار کے منصب پر باقی رہ سکیں۔

چوتھا ہدف:

اسلام کے دفاعی نظریاتی سرچشموں کو ختم کرنا

امریکہ اور یورپ جس طرح جہاد اور جہادی تحریکوں سے ڈرتے ہیں اس سے زیادہ مسلمانوں کی بیداری اور ان کے خلاف دفاعی اور نظریاتی سرچشموں سے ڈرتے ہیں اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ مجاہدین کے اسلحے اور جدید ٹیکنالوجی سے تو لڑا جاسکتا ہے لیکن اُس معنوی اور فطری قوت کے

ساتھ جو جہاد کے پس پشت مجاہدین کی تربیت اور دشمن کی نشاندہی کا کام کرتی ہے اور قدم بقدم مغرب اور امریکی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ جہادی تحریکوں کے لیے مناسب نظریاتی، سیاسی، نشریاتی، اور عسکری لائحہ عمل کی تشخیص بھی کرتی ہے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے طریقے بھی بتاتی ہے۔ ان کے ساتھ اس معنوی اسلحہ کی طاقت سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اثر ورسوخ کو کمزور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علاقائی سطح پر اسلامی ممالک میں امریکی تعلیمی اور نظریاتی ادارے بنائے جائیں اور اسی علاقے کے لوگ اس میں تجزیہ نگار، نگران اور نظم وضبط چلانے والوں کی حیثیت سے کام پر لگائے جائیں۔ اسی طرح جہادی افکار ختم کرنے کے لیے علاقائی سطح پر منصوبے ترتیب دیے جائیں اور موجودہ حالات وشرائط کو سامنے رکھتے ہوئے ان پر کام کیا جائے۔ اس طرح کے اشخاص کو تربیت دینا اور پھر انہیں اسلامی ممالک میں حکومتی اداروں کے مختلف شعبوں میں کام پر لگانا امریکی یونیورسٹیوں کے اہم اہداف میں سے ہے۔

قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی نے پہلے تو ایشیا اور افریقہ کی بیشتر اسلامی اور جہادی تحریکوں کے بارے میں تجزیہ نگاری کر کے ایک حد تک بعض اسلامی مفکرین اور جہادی شخصیتوں کو مختلف طریقوں سے اپنے جال میں پھنسایا پھر انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا، چنانچہ اب یہی علاقائی اشخاص اور ادارے جہاد اور مجاہدین کے بارے میں نوجوانوں کے دلوں میں غیر اطمینان بخش صورتحال پیدا کرتے اور ان کے ذہنوں میں تشویش ڈالتے ہیں جس کے نتیجے میں جہاد کی مشروعیت اور اس کی افادیت کا نظریہ ان کے ذہنوں میں سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

پانچواں ہدف:

نوجوانوں کو مقامی سطح پر مغربی کمپنیوں کے لیے امریکی طرز پر تربیت دینا

چونکہ مغرب میں صنعت، اقتصاد اور تجارت روبہ ترقی ہے اس لئے اہل مغرب چاہتے ہیں

کہ مسلم ممالک مجموعی طور پر ان کی مصنوعات بکنے کے لئے استہلا کی مارکیٹیں بن جائیں اور ان کا اقتصاد مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں میں رہے۔ چنانچہ مغرب نے ابھی بھی بہت سے ممالک کو اقتصادی طور پر زیر کیا ہوا ہے۔ یہ سب کمپنیاں اسلامی ممالک اور خاص طور پر ان ممالک میں ہیں جن پر یہ قبضہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لیے انھیں ہزاروں ایسے ملازمین کی ضرورت ہوتی ہے جو مغربی طرز پر نظم وضبط (Management) کے حاملین ہوں تاکہ مغرب کی ان استعماری اور پیداواری کمپنیوں کو اچھے طریقے سے چلایا جاسکے۔ یہ کمپنیاں انتہائی باریک بینی کے ساتھ اس طرف بھی متوجہ رہتی ہیں کہ وہ تمام اقتصادی اور تجارتی منصوبے جن کے منافع اسلام اور جہاد کے فروغ کے لئے لگائے جاتے ہوں انھیں ترقی نہ کرنے دیں، ان کی راہ میں مختلف رکاوٹیں پیدا کریں اور ان پر پابندیاں لگائیں تاکہ وہ ختم ہو جائیں۔ ان تمام کاموں کے لیے افراد کی تیاری بھی امریکی یونیورسٹیوں کے اہم اہداف میں سے ہے۔

چھٹا ہدف:

اسلامی ممالک میں مغربی طرزِ زندگی رائج کرنا اور مسلمانوں میں امریکی مصنوعات کے استعمال کا شوق پیدا کرنا

امریکہ اپنی ثقافت کے فروغ کے لیے کوشش کرتا ہے کہ اسلامی ممالک میں مغربی طرز زندگی کو رائج کرے تاکہ لوگ زندگی کے ہر موڑ پر امریکی اور مغربی مصنوعات استعمال کریں تاکہ اسلامی دنیا مغربی مصنوعات کے لیے ایک بڑی مارکیٹ میں تبدیل ہو جائے۔ اس کام کے لیے بڑی بڑی کمپنیاں جیسے فورڈ ''Ford'' اور جنرل موٹر ''General Motor'' وغیرہ بڑے پیمانے پر امریکی یونیورسٹیوں کے ساتھ تعاون کرتی ہیں اور یہ امریکی یونیورسٹیاں مشرق میں ان کے لیے ثقافتی مراکز کی حیثیت سے مارکیٹ میں حالات سازگار کرتی ہیں، اس کے ذریعے ایک طرف تو وہ مسلمانوں کی اجتماعی

ثقافت کو تبدیل کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی دنیا میں مقامی صنعت کاری پر حاوی ہو جاتے ہیں اور مغرب کی اقتصادی ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر حالات بھی ساز گار ہو جاتے ہیں۔

امریکی یونیورسٹی ایک مسیحی یونیورسٹی ہے

ہر اسلامی ملک میں امریکی یونیورسٹی ایک مسیحی یونیورسٹی ہوتی ہے جس کی بنیاد نیویارک میں پروٹیسٹینٹ مسیحی فرقے کی بڑی کلیسا (presbyterian) کی طرف سے رکھی جاتی ہے اور وہیں سے اس کا نظم وضبط چلتا ہے، ان یونیورسٹیوں کا ایک اعلیٰ مشاورتی بورڈ ہوتا ہے جس کے اراکین پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی بڑی شخصیات کے علاوہ بڑی بڑی کمپنیوں کے مالک، نامور تاجر اور تعلیم اور اجتماعی علوم کے متخصصین (Specialist) ہوتے ہیں، اسلامی ممالک میں ہر امریکی یونیورسٹی بنیادی طور پر عیسائیت کے فروغ کے لئے بنتی ہے اور باقی تمام چیزیں اس کے وسائل کے طور پر استعمال میں لائی جاتی ہیں۔

سن ۱۸۶۲ء میں پہلی دفعہ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ بیروت میں ''سوریا کی انجیلی فیکلٹی'' کو امریکی یونیورسٹی کا نام دیا جائے اور اس نئی یونیورسٹی کے لیے امریکہ نے ایک بڑے مسیحی مبلغ 'ڈینیل بلس' کو پہلے رئیس کے طور پر نامزد کیا، نامزد ہونے کے بعد 1863ء میں وہ دو بڑے مسیحی سربراہوں سے مشورے کے لیے نیویارک گیا اور وہاں مرکزی کلیسا Presbyterian میں اس نے ایک بیان کیا جس کے ایک حصے میں وہ کہتا ہے:

> ''مشرق کو ہماری ہی تعلیمات کی ضرورت ہے اسلئے وہاں تورات اور انجیل (بائبل) کو ایک دائمی تدریسی کتاب بنانا ضروری ہے۔''

اور اس نے بیروت کی امریکی یونیوسٹی کی طرف اپنی نمائندگی کے بارے میں کہا:

''بیروت کی امریکی یونیورسٹی کو چاہئے کہ مسیحی کتابوں کے ذریعے ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کے ساتھ ہمارا رابطہ قائم کرے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان مسلمانوں کے دلوں میں مالی امداد وغیرہ کے

ذریعے عیسائیت کی محبت پیدا کی جائے۔"

اسی طرح یونیورسٹی کے تاسیسی ادارے نے یہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کے ہر استاذ کا دینی مبلغ ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۹۰۹ء میں جب یونیورسٹی کے ایک مسلمان گروپ نے یونیورسٹی کے کلیسا کے سامنے احتجاج کیا اور یونیورسٹی کے ادارے سے مطالبہ کیا کہ مسلمان طلباء کو جبری طور پر یونیورسٹی کے عیسائی مراسم میں شریک نہ کیا جائے تو جواب میں یونیورسٹی کے ادارے نے ایک اعلان کیا جس کی چوتھی شق یہ تھی:

"بیروت کی امریکی یونیورسٹی ایک مسیحی یونیورسٹی ہے جو کہ مسیحی ملت کے مصارف سے بنی ہے اور اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ انجیل اس کے تعلیمی نصاب میں شامل ہو تاکہ مسیحی دین کے فوائد اور اچھائیاں ہر طالب علم کے سامنے رکھی جائیں، اس لیے جو کوئی اس یونیورسٹی میں پڑھنا چاہتا ہے تو اس پر لازمی ہے کہ داخلے سے پہلے ہر چیز پر غور کر لے کہ یونیورسٹی میں اس پر کیا کچھ لازم ہوگا۔"

اسی طرح یونیورسٹی کے مشاورتی بورڈ نے اعلان کیا کہ:

"امریکی یونیورسٹی لوگوں کو تورات اور انجیل کے حقائق سکھانے کے لیے بنائی گئی ہے تاکہ یہ یونیورسٹی مسیحیت کی روشنی کا ایک مرکز بن جائے اور اس روشنی کو اپنانے کی لوگوں کے اندر رغبت پیدا ہو جائے۔"

اسی بنیاد پر ۱۹۲۲ء تک تورات (عہد قدیم) قانونی طور پر یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھی اور تمام طلبہ کو پڑھائی جاتی تھی۔

عیسائیت کی تبلیغ کے شروع میں مبلغین کا احتیاطی رویہ

چونکہ یہ یونیورسٹیاں اسلامی ممالک میں قائم کی جاتی ہیں اس لیے شروع میں اس کے ذمہ دار بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں، روز اول سے مسلم عوام کو مخالفت پر نہیں ابھارتے اور شروع میں طلباء

کا مسیحی تعلیمات سے سامنا نہیں کراتے۔ اس بارے میں بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا رئیس Denial Bliss کہتا ہے:

''تاسیس کے ابتدائی سالوں میں ہم عیسائی بنانے کا کام بہت احتیاط سے کرتے ہیں کہ کہیں یونیورسٹی کے مضبوط ہونے سے پہلے ہی عثمانی خلافت غضبناک نہ ہو جائے لیکن بعد میں تمام طلباء کو مسیحی عبادتوں اور ہفتے کے دن کی خدمات پر مجبور کیا جائیگا۔''

اس کا نام امریکی یونیورسٹی کیوں ہے؟

اس طرح کی عیسائی یونیورسٹیاں ہر اسلامی ملک میں امریکہ کے 'پروٹسٹنٹ' مسیحی فرقے کے سب سے بڑے مرکز N.Y Presbyterian کی طرف سے بنائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ''مسیحی'' کا لفظ اس لیے نہیں لگایا جاتا کہ کہیں اسلامی ممالک میں اس کے خلاف حساسیت اور شعور نہ پیدا ہو جائے۔

مصر (قاہرہ) میں بھی جب امریکی یونیورسٹی بن رہی تھی تو یونیورسٹی کے مشاوراتی بورڈ کے بڑوں کے درمیان نام کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا، بعض نے کہا کہ نام واضح طور پر ''مسیحی یونیورسٹی'' رکھا جائے، بعض نے کہا کہ نام مصر اور نزدیک کے علاقے والوں کے لیے ''امریکی تعلیمی ادارہ'' ہونا چاہیے اور ایک تیسرے گروپ نے کہا کہ نام ''قاہرہ کے مسیحی کالجوں کا گروپ'' ہو۔ آخر میں ۱۹۱۷ء دسمبر کے مہینے میں نام کے تعین کے لیے ارکان کے درمیان انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں یونیورسٹی کا نام A.U Cairo یعنی ''قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی'' منتخب ہوا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دو ناموں کے بارے میں مصر کی حکومت کی بعض اہم شخصیات کو چند تحفظات کی وجہ سے اعتراض تھا، تاہم اس نام کے باوجود مشاوراتی بورڈ کے اراکین ان یونیورسٹیوں کو اپنے درمیان مسیحی یونیورسٹی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بیروت کی امریکی یونیورسٹی

بیروت کی امریکی یونیورسٹی اسلامی دنیا میں سب سے پہلی امریکی یونیورسٹی ہے، اس یونیورسٹی نے گذشتہ ۱۴۳ سال کے عرصے میں اسلامی دنیا میں پیش آنے والے اندوہناک واقعات میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، اس یونیورسٹی نے مسیحیت کے فروغ کے ساتھ ساتھ مغربی اور اسلامی دنیا میں سیکولرزم کے فروغ اور اسے حاکمیت بخشنے کے لیے بھی بہت کام کیا ہے۔ مغربی دنیا میں عثمانی خلافت کو ختم کرنے کے لیے عرب نیشنلزم کی کوشش بھی یہیں سے شروع ہوئی تھی اور وہ بھی اسی یونیورسٹی کے فضلاء ہی تھے کہ جنھوں نے عربی دنیا میں مغرب کے افکار اور نظریات کو رائج کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

اس یونیورسٹی کا اثر و رسوخ عرب دنیا سے باہر خطے کے بعض دیگر ممالک میں بھی سرائیت کر گیا، یہاں تک کہ افغانستان میں سینکڑوں افغانی جن میں سے سات اس وقت کرزئی کابینہ میں وزیر بھی ہیں، اسی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔

امریکہ کے افغانستان میں قبضہ کرنے میں جس شخص کا امریکہ کے ساتھ تعاون میں سب سے بڑا ہاتھ رہا تھا اور امریکہ نے قبضہ کے بعد بھی تمام حکومتی کاموں کا عملی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں دیا یعنی ”زلمے خلیل زادہ“ بھی اسی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے، یہ یونیورسٹی خطے کی دیگر یونیورسٹیوں کے لیے ماں کی سی حیثیت رکھتی ہے اور ایشیاء اور افریقہ کے اسلامی ممالک میں پروٹسٹنٹ مذہب کی مسیحی سرگرمیوں کے لیے تعلیمی اور ادارتی (اکیڈمک) منصوبے بھی اسی یونیورسٹی میں بنتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کو بنانے کے لئے ماحول سازی ۱۸۳۵ء میں اس وقت شروع ہوئی جب امریکی مسیحی مبلغ 'سیمون کالھون' نے بیروت میں لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے ایک اسکول بنایا۔ اس اسکول نے علاقائی مسیحی نسل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی نسل کو بھی کھینچ لیا، عیسائی استادوں کی اچھی توجہ اور وسیع تر وسائل کی وجہ سے اس کول نے خوب ترقی کی اور اس سے بہت سے طلباء فارغ ہوئے جو کہ مسیحی

اداروں اور تعلیمی مراکز میں کاموں پر لگ گئے۔ 'سیمون کالھون' کے اسکول کے طلباء کے اچھے نتائج نے نیویارک سے آنے والے مسیحی مبلغین کے گروپ کے بڑوں Denial Bliss اور D William Tomson کو بیروت میں اعلیٰ تعلیمی ادارہ بنانے پر آمادہ کر دیا، یہ دونوں اپنی رپورٹوں اور تجاویز نیویارک کی کلیسا Presbyterian مشورے کے لیے لے گئے اس کام پر تین سال یعنی ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۵ء تک مشورے ہوئے اور پھر پروگرام بنایا گیا اور اساتذہ کو بھی تیار کیا گیا۔ ۱۸۶۵ء میں Denial Bliss کو یونیورسٹی کا رئیس (Principal) نامزد کیا گیا، لہٰذا ۱۸۶۵ء میں اس نئی امریکی یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔ یونیورسٹی کا نصاب، زبان، ادارہ، اساتذہ اور ہر چیز امریکی تھی، نصاب میں انجیل تدریسی کتاب کی حیثیت سے مقرر کی گئی تھی، پورے ۵۷ سال یعنی ۱۹۲۲ء تک انجیل ایک لازمی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی اگرچہ بعد میں انجیل اور دیگر مسیحی مراسم اور مذہبی امور کی تعلیم کو اختیاری شکل دے دی گئی لیکن یونیورسٹی کے اداراتی شعبے اور اساتذہ کی اس طرح تربیت کی گئی تھی کہ ان سے پڑھنے کے بعد طلباء خود ہی عیسائیت کی طرف مائل ہوتے اور یہی ان کا اصل ہدف بھی تھا۔ اسی طرح یونیورسٹی کا ایک دوسرا رئیس ''Penrose'' جو ۱۹۴۷ء میں اس کرسی پر آیا، نے اس بارے میں اپنی افتتاحی تقریر میں کہا:

> ''دلائل نے ثابت کر دیا ہے کہ تعلیمی ادارے سب سے زیادہ مؤثر اسلحہ ہوتے ہیں۔''

اسی اسلحے کو امریکی مبلغین نے شام اور لبنان میں مسیحیت کے فروغ کے لیے استعمال کیا اور اس غرض کے لیے بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا رئیس بھی امریکی پروٹیسٹنٹ مبلغین کی جماعت سے ہی چنا گیا تھا۔

آج کی عرب دنیا میں بہت سے حاکم جنہوں نے اپنے ممالک کی عوام کو امریکی غلامی پر مجبور کیا ہوا ہے اسی یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں، یہ وہی ہیں جنہوں نے عرب دنیا میں نفاذ شریعت کی راہ روکی ہوئی ہے اور جو شخص بھی مغرب کی غلامی سے آزادی اور اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے کی بات

کرتا ہے، ان حاکموں اوران کے خانہ ساز قوانین کی رو سے اسے پھانسی دے دی جاتی ہے یا اسے قید کر دیا جاتا ہے یا پھر وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی

قاہرہ کی یونیورسٹی بھی عربی دنیا میں پروٹسٹنٹ مبلغین Missionary فکر کی پیداوار ہے۔ اس یونیورسٹی کو بنانے کا خیال پہلی بار مصر میں امریکی مسیحی مبلغ ''چارلس واٹسن'' جو کہ مصر میں مشہور امریکی مبلغ انڈر واٹسن (Ander Watson) کا بیٹا تھا، کے ذہن میں پیدا ہوا۔

'چارلس واٹسن' نے پہلے مصر میں بچوں اور نوجوانوں کو عیسائی بنانے کے لیے تعلیمی سرگرمیاں شروع کیں پھر اس نے قاہرہ میں امریکی یونیورسٹی بنانے کے لیے منصوبہ تیار کیا۔ ۱۹۱۴ء میں یہ شخص اس منصوبے کو اپنے ساتھ امریکہ لے گیا، تاکہ وہاں بڑے کلیسا میں امریکی یونیورسٹیوں کا مشاورتی بورڈ اس پر غور وفکر کرے، اسی سال تیس دسمبر کو کلیسا کے سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ موضوع بھی چھیڑا گیا، بحث کے دوران مختلف رائے سامنے آئیں جن میں سے 'چارلس واٹسن' نے کلیسا کے بڑوں کے سامنے اپنی یہ تجویز پیش کی کہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد پہلے مرحلے میں چاہیے کہ یونیورسٹی کے طلبہ پر مسیحی مراسم اور عبادات لازم نہ کی جائیں تاکہ ہم اپنا کام مسلمانوں کی مخالفت مول لیے بغیر اطمینان کے ساتھ کر سکیں۔

یونیورسٹی کی منظوری کے بعد ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک قاہرہ میں یونیورسٹی کی عمارت کے لیے عمارتوں کی خریداری اور بعض دیگر ابتدائی کام مکمل ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں اکتوبر کی پندرہ تاریخ کو پہلے پہل ''لنکولن کالج آف ایسٹ ایجوکیشنز'' کے نام سے ایک کالج کھولا گیا جو بعد میں قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی 'A U Qaira'' کی شکل اختیار کر گیا اور 'چارلس واٹسن' اس یونیورسٹی کا پہلا پرنسپل بنا جو ۱۹۴۵ء تک اسی منصب پر فائز رہا۔

قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی شروع میں صرف امریکہ کے کلیساؤں کی مدد سے چل رہی تھی لیکن

آج عالمی مسیحی این جی اوز کے تعاون سے اپنا کام آگے بڑھا رہی ہے۔

آج کل امریکہ مصر میں اپنی یونیورسٹی کی طرف سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے کیونکہ مصر میں ایک طرف تو الازھر یونیورسٹی کا وجود ہے جو کئی صدیوں سے اسلامی علوم کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے، اگرچہ آج وہ بھی دیگر سرکاری اداروں کی طرح ایک سیکولر حکومت کے کنٹرول میں ہے، پھر بھی اسلامی علوم کا سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسلامی تحریکوں کا آغاز بھی بیسویں صدی کے اوائل سے ہی 'امام حسن البناء' کی جماعت ''اخوان المسلمین'' کی شکل میں ہوا جو اگرچہ بعد میں مختلف نظریاتی اور جہادی شاخوں میں پھیل گئی لیکن مجموعی طور پر سب کی یہی سوچ تھی کہ مشرق کو مغرب کے تسلط سے کیسے آزاد کیا جائے۔

مصر کا امریکہ کی توجہ کا مرکز بننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ القاعدہ کی جہادی تنظیم میں مصر کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے بلکہ جماعت کی قیادت کا کام بھی تقریباً وہی سنبھال رہے ہیں، اسی وجہ سے امریکہ دوسرے عرب ممالک سے زیادہ مصر کی طرف توجہ دیتا ہے۔

ترکی (استنبول) کی امریکی یونیورسٹی

ترکی اور اس کی اسلامی اہمیت کے بارے میں تذکرہ پہلے گزر چکا ہے کہ تقریباً پانچ سو سال تک ترکیوں نے خلافتِ عثمانیہ کی باگ ڈور سنبھال رکھی جس کا پایہ تخت استنبول رہا اور جو مغرب کے لیے بالکل قابل قبول نہیں تھا، چنانچہ مغرب نے ترکی میں اسلامی خلافت کو ختم کرنے کے لیے کئی صدیوں تک مسلسل انتھک کوششیں کیں، مشرقی یورپ کے لوگوں کو بغاوت پر ابھارا اور اس کے علاوہ بھی خلافت کے خاتمے کے لیے بہت کچھ کیا لیکن وہ اپنی سازشوں میں اس وقت تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ پا سکے جب تک کہ انہوں نے ترک قوم کے اندر ایسے لوگ نہ تیار کر لیے جو اسلام سے نفرت کرتے تھے اور ترکی میں اسلام کی بجائے مغربی قوانین کے نفاذ کو پسند کرتے تھے۔

ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کو منہدم کرنے والے اصل مجرم وہ لوگ تھے جنہوں نے یا تو مغرب

میں تعلیم حاصل کی تھی یا ترکی میں رہ کر ہی مغربی افکار سے متاثر ہو گئے تھے اور ان کو مغربی میڈیا اور یورپی تعلیمی اداروں نے شہرت دی تھی۔ ان مجرموں نے ترکی کو اسلام سے محروم کر دیا، اسلامی خلافت کو لغو قرار دیا اور اس کی جگہ سیکولر ترکی کو سامنے لے آئے، اسلامی شعائر پر پابندی لگا دی گئی، چالیس سال تک ترکی کے مسلمانوں نے اذان کی آواز نہیں سنی، اتنی ہی مدت تک ترکی کے مسلمانوں کو حج کی ادائیگی سے روکا گیا، مدارس بند کر دیے گئے، مساجد کو عجائب گھروں میں تبدیل کر دیا گیا، اسلامی حجاب کو ممنوع قرار دیا گیا اور معاشرے میں اسلام کو دوبارہ عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے ہر قسم کی کوششوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۹۲۴ء سے آج تک ترکی کے بااختیار لوگ مختلف طریقوں سے پے در پے یہ کوششیں کرتے چلے آئے ہیں کہ ترکی کو سیاسی اور انتظامی طور پر یورپ کا حصہ بنا دیا جائے تاکہ ترکی کو بھی یورپی یونین میں شمولیت مل جائے لیکن مغرب یہ ماننے کے لئے تیار نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ترکی میں اب تک اسلام موجود ہے۔

ترکی میں اس طرح کے حالات پیدا کرنے میں جو عناصر ملوث تھے ان میں ایک استنبول کی امریکی یونیورسٹی بھی تھی، اس امریکی یونیورسٹی کے لیے مسیحی مبلغین نے پہلے سے کوششیں شروع کی ہوئی تھیں۔ ۱۸۳۱ء میں جب امریکی مسیحی مبلغین کا پہلا گروپ ترکی میں آیا تو اس گروپ کے سربراہ کے گھر میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ”قسطنطین واشنگٹن“ رکھا گیا تاکہ اسے قسطنطین (استنبول) اور واشنگٹن کے درمیان وحدت اور تعلق کے لئے بطور ذریعہ استعمال کیا جائے۔

اس گروپ نے ترکی میں ایک لمبا عرصہ گزارا اور مُرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ استنبول میں ایک مسیحی یونیورسٹی کے قیام کے لیے زمین ہموار کرتا رہا۔

۱۸۴۳ء میں مشہور امریکی مسیحی مبلغ ”ھاملین“ نے نیویارک کے ایک بڑے سرمایہ دار روشیلڈ یہودی کے ساتھ مشورہ کیا اور اس سے کہا:

”ترکیوں نے استنبول پر قبضہ کرنے کے لیے جنگ سے پہلے ”رومیلی“ (استنبول کے قریب ایک جگہ کا

نام ہے) میں ایک فوجی قرارگاہ اور ایک عسکری قلعہ بنایا تھا بعد میں اسی جگہ سے قسطنطنیہ کی مسیحی حکومت کو گرادیا تھا۔ اس لیے میں بھی اسی جگہ ایک ثانوی درجے کا مکتب (اسکول) کھولنا چاہتا ہوں تاکہ ترکیوں کی اسلامی خلافت کو گرادوں۔"

"روشیلڈ" اس کی یہ بات مان گیا اور پھر یہی ہوا کہ پہلے وہاں ایک ثانوی مکتب بنا جو بعد میں استنبول کے رابرٹ کالج میں تبدیل ہو گیا اور آج ترکی کی امریکی یونیورسٹی میں بدل گیا، اسی امریکی یونیورسٹی کے مذہبی کردار کے بارے میں مشہور مسیحی مبلغ اور بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا پہلا پرنسپل Denial Bliss کہتا ہے:

> "ترکی کا رابرٹ کالج (آج کی امریکی یونیورسٹی) ایک مسیحی کالج ہے، اس کا تعلیمی نصاب اور تعلیمی ماحول واضح طور پر مسیحی ہے کیونکہ وہ مسیحی مبلغین کا مقرر کردہ ہے۔"

ہر دور میں اس یونیورسٹی کا رئیس اور مدیر بھی ایک مسیحی مبلغ ہی ہوتا ہے۔

افغانستان میں مسیحی سرگرمیوں کا پس منظر

برطانیہ نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد افغانستان پر بھی پے در پے حملے کیے تاکہ وہ بھی انگریزی حکمرانی کا حصہ بن جائے اور یہاں بھی لوگوں کے ذہن اور زندگی مین مغربی ثقافت اور مسیحی عقائد کو جگہ ملے، اسی وجہ سے انگریزوں نے تقریباً ۱۲۰ سال پہلے انجیل کا پشتو میں ترجمہ کیا اور پشتو بولے جانے والے علاقوں میں پھیلا دیا لیکن یہ "پشتون" دین پر مضبوطی سے قائم رہنے والے لوگ تھے (اور اب بھی ایک حد تک ہیں) انھوں نے انگریزوں کو دشمن اور ان کے دین کو کفر سمجھا لہٰذا اُس وقت ان کے راسخ عقیدے کی وجہ سے عیسائیت کی دعوت ان کے سامنے مؤثر نہ رہی چنانچہ جب مسیحی مبلغین اس حقیقت کو سمجھ گئے کہ یہ لوگ مسیحیت کو اس طرح قبول نہیں کریں گے تو انہوں نے اپنی تبلیغ کا طریقہ بدل ڈالا اور کھلے عام مسیحیت کی دعوت کی بجائے وہاں کے لوگوں میں یورپی زبانوں اور ثقافت کو رواج دینا شروع کیا۔ یورپ کے مسیحی مبلغین کے مقالات (مضامین) کے مجموعے میں جسے محب الدین

خطیب مصری نے ''الغارة علی العالم الاسلامی'' یعنی ''اسلامی دنیا پر حملے'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے، اس میں مسیحی مبلغین کے لئے افغانستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے بارے میں یہ تجویز بیان کی گئی ہے:

''پٹھان بہت پکے لوگ ہیں، وہ مسیحیت کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کریں گے لہٰذا ان کے افکار کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ مغربی ثقافت اور مغربی ادبیات کو ان کی زبان میں ترجمہ کر کے نشر کیا جائے تا کہ آہستہ آہستہ مسیحی اور یورپی افکار سے ان کو مناسبت پیدا ہو۔''

یہی وجہ تھی کہ ''امان اللہ خان'' کے دور میں نہ صرف یہ کہ افغانستان کے دروازے مغربی ثقافت اور افکار کو رواج دینے کے لئے کھل گئے بلکہ مغربی لباس اور ثقافت بھی زبردستی افغانیوں پر تھوپی گئی، اگرچہ بعد میں اس صورتحال کو بائیں بازو کے لوگ اور کمیونسٹ اپنے فائدے کے لئے بروئے کار لائے۔ چونکہ کلیسا کے لیے افغانستان میں کام کا دروازہ بند ہوگیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کلیسا مغرب کی نمائندگی کرتا تھا اور افغانستان میں حاکمیت روسیوں اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی، اس لئے اس ناکامی کے بعد مغربی کلیسا نے افغان مہاجرین جو کہ پاکستان اور یورپ میں تھے، میں مسیحیت کے فروغ کے لئے کام شروع کیا۔

عیسائیت کے فروغ کے تین ہتھیار: غربت، جہالت، بیماری

فقر، جہل اور بیماری وہ تین ذرائع ہیں جن کے ذریعے مسیحی مبلغین اسلامی ممالک میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں انسانیت کی مدد، تعلیم اور فراہمی صحت کے کاموں کے بہانے داخل ہو کر مسیحیت کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں اور پھر جنگ وہ چیز ہے جو ان تینوں مصیبتوں کو وجود دیتی ہے۔ افغان بھی جنگ ہی کی وجہ سے ہجرت پر مجبور ہوئے اور ہجرت میں فقر، جہالت اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان سب چیزوں نے افغان کیمپوں میں مغربی این جی اوز کے لیے کام کا دروازہ کھول دیا اور کام کے ساتھ ساتھ ان این جی اوز نے خفیہ اور اعلانیہ طور پر افغانوں میں مسیحیت کے فروغ کے

لئے سرگرمیاں بھی شروع کر دیں، ہوتے ہوتے مسیحیت کی یہ سرگرمیاں اتنی کھلے عام ہونے لگیں کہ چودہ اگست ۱۹۸۸ء کے دن پشاور میں افغان کمشنر نے اپنے معاون ''سید احمد اختر'' کے دستخط سے پاکستان میں تمام مغربی این جی اوز کو مہاجرین کے درمیان مسیحی کتابیں اور نشریات تقسیم نہ کرنے کے بارے میں ایک نوٹس صادر کیا اور تعزیراتِ پاکستان کے قانون کی پندرھویں شق کے مطابق اس کام کو دینی تذلیل شمار کیا جس کے کرنے والے کو قید، جرمانہ یا دونوں بیک وقت ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود مہاجرین کے کیمپوں میں مسیحیت کی نشر و اشاعت جاری رہی۔ اس وقت کے افغان کمشنر جناب ''رستم شاہ مہمند'' نے اس اقدام کو ''الجہاد'' عربی رسالے کے ذریعے ۱۹۸۹ء فروری کے مہینے کے شمارے میں بھی ایک مضمون شائع کر کے مزید تقویت دی، موصوف نے یہ بھی کہا کہ اس جرم کے نتیجے میں مغربی این جی اوز کے بعض ممبروں کو پاکستان سے ملک بدر بھی کیا گیا ہے۔

انگلش لینگویج سینٹر یا مسیحی تبلیغی مراکز

جیسے کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ پرانے مسیحی مبلغین کی توجیہات اور مشوروں کے مطابق مغربی زبانیں اور یورپی اور امریکی ثقافت کے فروغ کے لیے درجنوں این جی اوز جو کہ دراصل مسلمانوں کی فکر اور نظریات تبدیل کرنے کے لیے کام کرتی ہیں، نے سینکڑوں انگلش لینگویج سینٹر کھولے جن میں ہزاروں نوجوان لڑکوں، لڑکیوں اور بڑی عمر کے مردوں اور عورتوں کو بھی انگریزی زبان سکھائی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ انھیں یورپ اور امریکہ جانے کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ ان این جی اوز میں سے چند کی کارگزاریاں ذیل میں آپ کی پیشِ خدمت ہیں:

انٹرنیشنل ریسکیو کمیٹی I.R.C :

I.R.C ایک خالص کلیسائی این جی او ہے جس کا معنی ہے ''عالمی نجات کی کمیٹی'' ''نجات'' انجیلی کلمہ ہے، جس کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو عیسائیت قبول کر لے وہ حساب کتاب اور آخرت کے عذاب سے بری ہوگا، اس لیے کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ان کے گمان کے مطابق اللہ جل شانہ کو عیسیٰ علیہ

السلام نے قربان ہونے سے پہلے دے دیا تھا، یہ بات بذاتِ خود ایک غلط اور کفریہ عقیدہ ہے چہ جائیکہ کسی کی نجات کا ذریعہ ہو۔

I.R.C نے مجاہدین کے کیمپوں اور پاکستان کے شہروں میں اپنے سینکڑوں ادارے کھولے جن میں ابتدائی طور پر تو اساتذہ بھی یورپی یا امریکی تھے لیکن بعد میں افغان اساتذہ کو تربیت دے دی گئی۔ ان افغان استادوں نے انگریزوں سے بڑھ کر انگریزی زبان کی خدمت کی۔ I.R.C، نہ صرف انگریزی زبان سکھاتی تھی بلکہ اس کے توسط سے مسلمانوں میں یورپی اور امریکی ثقافت بھی پھیلاتی تھی۔ اس کے علاوہ پشاور میں اس کا اپنا طباعت خانہ بھی تھا جسے سید جمال الدین افغانی کے نام سے چلایا جاتا تھا، اس کے ساتھ یہ این جی او مکاتب کے نصاب اور استادوں کی تربیت کا کام بھی کرتی تھی جس کے لیے وقتاً فوقتاً معلمین کے تربیتی سیمینار بھی منعقد کیے جاتے تھے۔

امریکن سینٹر

ایک دوسری ثقافتی مسیحی این جی او ہے جس کا مرکز پشاور صدر میں ہے۔ یہ این جی او عربی زبان کے ساتھ ساتھ ثقافتی مسیحی سرگرمیاں بھی رکھتی ہے۔ جس میں عموماً امریکی خواتین پڑھاتی ہیں۔

برٹش کونسل

برٹش کونسل بھی ایک ثقافتی این جی او ہے جس کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ یہ این جی او بھی انگریزی زبان سکھانے کی آڑ میں دیگر گمراہ کن ثقافتی سرگرمیاں انجام دیتی ہے۔

ورلڈ ریلیف اور ٹائم

یہ دو بھی مسیحی این جی اوز ہیں جو کہ ہالینڈی (زولاک) سے تعلق رکھتی ہیں۔ ورلڈ ریلیف کا اسلام آباد میں افغانوں کے لیے انگریزی زبان کا ایک بڑا مرکز E.S.L کے نام سے G/97 کے علاقے میں واقع ہے۔ اس مرکز میں انگریزی زبان کے کورس کے اختتام پر فارغ ہونے والے طلباء کو

کھلم کھلا پشتو اور فارسی میں ترجمہ شدہ مسیحی کتابیں دی جاتی ہیں اور مختلف طلباء کو ایسی مسیحی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا کردار پیش کیا جاتا ہے۔

شیلٹر ناو انٹرنیشنل

شیلٹر ناو انٹرنیشنل وہ مسیحی این جی او ہے جس میں عبدالرحمٰن پنج شیری نے مرتد ہو کر عیسائی مذہب اختیار کیا تھا، اِسی این جی او نے ناصر باغ (پشاور) کے مہاجر کیمپ میں بیواؤں کے لیے ہنر سیکھنے کا ایک سنٹر بنایا تھا جہاں ہنر سکھانے کے ساتھ ساتھ مسیحیت پھیلانے اور فحاشی کی ترویج کے لیے بڑے پیمانے پر کام ہوتا تھا، کیمپ کے ذمہ داروں سے کئی دفعہ اس بات کی شکایت کی گئی کہ یہ ادارہ کیمپ میں ناجائز کاموں میں ملوث ہے، جن میں سے ایک یہ کہ اس نے بیواؤں میں مانع حمل گولیاں بھی تقسیم کی ہیں حالانکہ بیوہ عورتوں کو اس قسم کی گولیوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں، مہاجرین نے کئی بار افغان کمشنر کو بتایا لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی جس کے نتیجے میں 24/4/1990 کو تقریباً دس ہزار مہاجرین نے اس این جی او کے دفتر پر عید الفطر کی نماز کے بعد حملہ کر دیا اور مرکز کے سارے ساز و سامان کو ختم کر دیا، شلٹر ناؤ کے اُس وقت کے ایک با اختیار افسر ''بیتال ھال'' کے مطابق جو اس نے ''الجہاد'' رسالے کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا، جو ۶۸ ویں شمارے میں مذکور ہے کہ:

> ''اس حملے کے نتیجے میں شیلٹر ناؤ کو ایک ملین ڈالر کا نقصان ہوا۔''

اسی شیلٹر ناو این جی او نے طالبان کے دور حکومت میں خفیہ طریقے سے بڑے پیمانے پر کابل میں مسیحی سرگرمیاں شروع کی ہوئی تھیں اور طالبان کے خفیہ ادارے اور امر بالمعروف کی طرف سے ہزاروں مسیحی کتابوں کے نسخوں سمیت اس کے ذمہ دار بھی پکڑے گئے تھے، جب تحقیقات کے لیے ان مجرمین کو عدالت کے سپرد کیا گیا تو ان کو چھڑانے کے لیے اقوام متحدہ سمیت سینکڑوں ادارے اور ممالک حرکت میں آ گئے لیکن جب ان کی یہ کوششیں کارگر ثابت نہ ہوئیں تو امریکہ نے فوری طور پر ایک فوجی حملہ کیا اور اپنی استخبارات کی مدد سے ان لوگوں کو ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے غزنی ولایت سے چھڑا کر

لے گئے۔

تعلیمی اور فلاحی امداد کرنے والی مسیحی این جی اوز کے ساتھ ملکر امریکی اور یورپی عیسائیوں نے گذشتہ ۲۵ سال سے پاکستان کے مسیحی طبقے کی مدد سے افغانوں کو مسیحی بنانے کے لیے اسلام آباد اور راولپنڈی میں ایک مسیحی ریڈیو بھی چلا رکھا ہے جو مختلف افغانی زبانوں میں صبح شام مسیحی نشریات نشر کرتا ہے جن میں نشریات کے فرائض انجام دینے والے سب کے سب وہ افغانی ہوتے ہیں جو اسلام سے مرتد ہو گئے ہیں۔ اس ریڈیو نے اس وقت ایسی عوام کے لیے نشریات شروع کی تھیں جن میں ایک بھی عیسائی نہیں تھا لیکن آج اس نے سینکڑوں لوگوں کو عیسائی بنا دیا ہے لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ مرتدین سب کے سب وہ کمیونسٹ اور سیکولر عناصر ہیں جو پہلے ایک طرح کے کافر تھے اور اب انہوں نے دوسرے قسم کا کفر اختیار کر لیا ہے۔ ریڈیو کے علاوہ انٹرنیٹ میں بھی مرتد افغانیوں نے جو کہ اعلانیہ طور پہ عیسائی بن گئے ہیں بہت سی سرگرمیاں شروع کی ہوئی ہیں جن میں ٹیلی ویژن کی نشریات بھی شامل ہے۔

افغانستان پر امریکہ اور مغرب کے صلیبی حملے کے بعد وہاں اعلانیہ طور پر کلیسائیں بھی بن گئی ہیں جو کہ صلیبیوں کے فوجی مرکزوں میں کابل، قندھار، مزار شریف، ارگون، جلال آباد، ہلمند اور بگرام میں واقع ہیں۔ ان کلیساؤں میں انگریزوں کے ساتھ ان کے مرتد افغانی ساتھی بھی اتوار کے روز عیسائی مراسم میں حصہ لیتے ہیں، کچھ عرصے سے کرسمس کا جشن بھی افغانستان میں بڑے پیمانے پر منایا جارہا ہے جس میں انگریزوں کے ساتھ مرتد افغانی بھی پوری دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔

ایک دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ چونکہ افغانوں سے عسکری جنگ میں برسرِ پیکار ہیں اس وجہ سے عام افغانوں کی نظر میں بھی وہ دشمن کی حیثیت رکھتے ہیں، چونکہ یہ بات مسیحیت کے فروغ میں ایک رکاوٹ بن سکتی ہے اس لئے عیسائیت کی تبلیغ کی ذمہ داری جنوبی کوریا کے عیسائیوں کو جو امریکہ کے قریبی اتحادی ہیں، سونپی گئی ہے۔

جنوبی کوریا کا پروٹسٹنٹ کلیسا ایشیاء میں سب سے بڑا کلیسا ہے جو امریکی پروٹسٹنٹ کلیسا کے بعد دنیا میں اپنے سب سے زیادہ مبلغین رکھتا ہے، اس کے صرف بیس ہزار مرد اور عورتیں تعلیمی این جی اوز کی شکل میں اسلامی دنیا میں مسیحیت کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں۔

فرانس کے ”لیبراسیون“ روزنامے نے جولائی ۲۰۰۷ء میں ایک رپورٹ شائع کی تھی کہ جنوبی کوریا کی کلیساؤں کا مسیحی تبلیغی جماعت کا مرکز جو کہ اس ملک کے دارالحکومت ‘سیول’ کے پڑوس میں واقع ایک چھوٹے شہر ”بوندانگ“ میں واقع ہے، ۲۰۰۶ء میں دو ہزار عیسائی مبلغین کو افغانستان سفر کے لیے سیاحت کے ویزے دیے گئے جن میں سے صرف ڈیڑھ ہزار افراد اس سال جون کے مہینے میں کابل پہنچ گئے۔ اور وہاں اہل تشیع کے علاقے جیسے بامیان، مزار، کابل، کارتہ سخی اور قلعہ شادہ میں شیعوں کے گھروں میں عیسائیت کی دعوت شروع کردی۔ (عربی رسالہ ”الصمود“ شمارہ ۲۰)

یہ گروپ اپنے ساتھ چھوٹے قریب البلوغ بچے بھی لائے تھے جنھیں یہ لوگ اخلاقی فساد پھیلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا یہ منصوبہ اس وقت بے نقاب ہوا کہ جب اس گروپ کے بعض اراکین مسلمانوں کے گھروں میں بھی دعوت دینے کے لیے گئے جس پر لوگ ان کے خلاف مشتعل ہو کر نکل آئے چنانچہ منصوبے کا راز کھل جانے کے فوراً بعد کرزئی حکومت نے ان سب مسیحی مبلغین کو کوریا کے سفارت خانے میں جمع کیا اور ازبکستان بھیج دیا لیکن جب لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو دوبارہ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ان لوگوں کو دوبارہ افغانستان میں داخل کر دیا گیا۔

کوریا کے مسیحی مبلغین کی دوسری رسوائی اس وقت سامنے آئی کہ جب 19/7/2007 کو تئیس افراد کو غزنی کے علاقے ‘قرہ باغ’ میں قندھار کے راستے میں طالبان نے گھیر لیا۔ شروع میں کرزئی حکومت نے ان کو خیراتی کام کرنے والی این جی اوز کے کارکن ظاہر کیا بعد میں کوریا کی حکومت اور یرغمال بنائے گئے مبلغین کے گھر والوں نے اعتراف کیا کہ یہ سب یرغمالی عیسائی مبلغین ہیں جو افغانستان میں امریکہ کے سائے تلے دعوت کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ایک طویل مذاکرات کے

بعد بھاری بھر کم معاوضہ اور تمام عسکری اور غیر عسکری کورین باشندوں کے افغانستان سے نکلنے کی شرط پر ان مبلغین کو چھوڑ دیا گیا۔

مغرب اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں عیسائیت کے فروغ کے لیے بڑے پیمانے پر اپنی سرگرمیاں شروع کی ہوئی ہیں۔ بعض افغانی شیعہ، آغا خان فاؤنڈیشن اور کیانی اسماعیلیہ بھی ان کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کے لیے ہر قسم کی مشکلات برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ امریکہ کے ایک بڑے مسیحی مبلغ ”زویمر“ جس نے تقریباً ۳۵ سال عرب ممالک اور ہند میں عیسائیت کے فروغ کے لیے کام کیا، اپنی کتاب ”Islamic World Today“ میں مسیحی مبلغین کو وصیتوں کے ذیل میں لکھتا ہے:

> ”مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ عیسائی ان کے دشمن نہیں ہیں، مسلمانوں کو عیسائیت کی دعوت دینے کے لیے ان لوگوں کو مقرر کرنا چاہیے جو اسلام سے عیسائیت کی طرف آئے ہیں۔ اس لیے کہ درخت گرانے کے لیے کلہاڑی کا دستہ درخت کی شاخ کا ہی ہوتا ہے۔ مسیحی مبلغین کو چاہیے کہ وہ اپنی دعوت کے نتائج کی کمزوری سے مایوس نہ ہوں اس لیے کہ مسلمانوں میں یورپ کے علوم اور عورتوں کی آزادی کی طرف شدید میلان نظر آتا ہے۔ انجیل کو مسلمانوں کی زبانوں میں ترجمہ کر کے انھیں پھیلایا جائے۔“

اسی ”زویمر“ نے ہندوستان کے شہر کلکتہ میں ایک بڑی کانفرنس میں اپنے مبلغین کو مسلمانوں کے سامنے بالتدریج دعوت کے مراحل کے بارے میں کہا:

> ”کوشش کرو کہ مسلمانوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرو تا کہ وہ تمہارے بھائی بن جائیں اور اگر مسلمان آپ کا دین قبول نہ کریں تو ان کے لیے ایسے حالات پیدا کرو اور ان کو ایسے کاموں میں لگاؤ کہ وہ اسلام سے نکل جائیں یعنی اگر وہ عیسائی نہ بنیں تو مسلمان بھی نہ رہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو میدانِ جنگ سے روکنا بھی بذاتِ خود ایک بہت بڑا ہدف ہے، اگر مسلمان اسلام سے بھی نہ نکلیں تو پھر کوشش کرو کہ ان کی فکر اور نظریے کو ایسا خراب کر دو کہ وہ اسلامی شریعت سے نفرت کریں اور جو کچھ کریں بیٹ

اور شہرت کے لیے کریں۔“

کابل میں امریکی کالج

امریکہ نے افغانستان میں فوجی حملے کے ساتھ کچھ اور کوششیں بھی شروع کیں تا کہ اس سرزمین پر اپنی بقا اور سیاسی اثر و رسوخ کو طویل عرصے کے لیے یقینی بنا سکے۔ امریکہ کو اس بات کا تو یقین ہے کہ اس کی فوجیں ایک نہ ایک دن افغانستان سے نکلنے پر مجبور ہوں گی لیکن صرف اس لیے کہ یہاں کا نظامِ حکومت مخلص مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگے، اس نے پہلے ہی دن سے افغانستان میں ایسے اداروں، قوانین، سیاسی جماعتوں اور شہری معاشرے (”سول سوسائٹی“) کے نام پر جرگوں کی بنیاد رکھنا شروع کر دی تا کہ اس کے انخلا کے بعد یہ سب اس کے نائب بن کر اسلام کا مقابلہ کر سکیں۔

ان جماعتوں اور اداروں کو امریکا کی منشاء کے مطابق چلانے اور ان کی حفاظت کے لیے ایسے افراد اور جماعتوں کی ضرورت تھی جو امریکہ کے ہاتھوں اس کی فکر و سوچ کے مطابق تربیت یافتہ ہوں، جو بعد میں سیاست دانوں، فوجیوں، وزیروں اور سیاسی اشخاص کی شکل میں امریکہ کے لیے اچھے نائب ثابت ہوں اور ہمیشہ اس ملک کو مغرب کے تابع رکھیں اور ملک کے دروازے بھی ہمیشہ کے لیے مسیحیت اور سیکولرزم کے لیے کھلے رکھیں۔

امریکہ کو افغانستان میں اپنے مستقبل کے تحفظ کے لیے ”کرزئی“، ”زلمی خلیل زاد“، ”اشرف غنی“، ”جلالی“، ”احدی“ اور اس طرح کے دیگر اور بہت سارے ان جیسے ذہنی غلاموں کی ضرورت تھی جو امریکی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ ہوں، کیونکہ بے تعلیم، ان پڑھ فوجی اور جاہل فوجی کمانڈر طویل عرصے تک عوام اور ملک کو نہیں سنبھال سکتے، اس لیے ضروری تھا کہ معاشرے میں اپنا ایک مقام رکھنے والے لوگوں کی تربیت کی جائے۔ لہٰذا اس طرح کی ایک نسل کی تربیت کے لیے امریکی حکومت اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے اکابرین نے کابل میں امریکی یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

کابل کی امریکی یونیورسٹی نیو یارک میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی مرکزی کلیسا کی طرف سے

چلائی جاتی ہے۔ اس کی تعمیر کا اعلان 7/11/2003 میں کرزئی حکومت کے اس وقت کے ایک وزیر ''شریف فایزا'' کی طرف سے ہوا جو کہ اس یونیورسٹی کا موجودہ پرنسپل ہے۔

موصوف نے اعلان کیا کہ یہ امریکی یونیورسٹی کابل کے دارالامان میں ستر جریب زمین پر بنائی جائیگی جو درج ذیل خصوصیات کی حامل یونیورسٹی ہوگی :

☆ یونیورسٹی کا نصاب امریکی ہوگا۔ (یعنی وہ نصاب جو ما قبل میں ذکر کردہ یونیورسٹیوں کا نصاب ہے)

☆ تدریس انگریزی زبان میں ہوگی۔

☆ اساتذہ سب امریکی ہونگے۔

موصوف نے آزادی ریڈیو کی طرف سے یہ بھی کہا کہ افغان اساتذہ اس یونیورسٹی میں استاد بننے کی کوشش ہرگز نہ کریں کیوں کہ افغانیوں کی علمی استعداد اس یونیورسٹی کے شایانِ شان نہیں۔

☆ اس یونیورسٹی میں تعلیم کی فیس ڈالروں میں وصول کی جائے گی۔

مندرجہ بالا صفات اور شرائط کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ امریکہ نے افغانستان پر دائمی قبضے کا خطرناک منصوبہ بنایا ہوا ہے۔

امریکہ نے اس یونیورسٹی کا نصاب صرف اس لیے امریکی ماہرین سے مرتب کروایا کیونکہ ان کے غلام ان کے مطلوبہ معیار کا نصاب تیار نہیں کر سکتے تھے، افغانی نصاب بھی اگرچہ سیکولر نصاب ہے لیکن اس میں پھر بھی افغانیت اور وطن پرستی کا کچھ نہ کچھ اثر نظر آتا ہے، روس کے خلاف ہونے والے جہاد میں بھی دیکھا گیا کہ زیادہ تر جہادی لیڈر افغانی یونیورسٹیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس لیے امریکہ نہیں چاہتا کہ اس کے جانے کے بعد یہ یونیورسٹیاں جہاد اور اسلامی سرحدات کے دفاع کے لئے جنگ کے میدان بن جائیں بلکہ اس کی بجائے وہ چاہتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلباء کا ہمیشہ کے لیے جہاد اور اسلام سے رابطہ منقطع ہو جائے اور یہ کام صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب تعلیمی نصاب مکمل طور پر اسلامیت اور افغانیت سے خالی ہو جائے۔

تدریسی زبان کے لیے انگریزی زبان کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ امریکہ ایک طرف تو یہ چاہتا ہے کہ زبان کے ذریعے اپنی گری پڑی مسیحی ثقافت افغانیوں پر مسلط کرے اور دوسری طرف افغانی زبان میں نئی ٹیکنالوجی کے علوم منتقل کرنے کی راہ روکے کیونکہ اگران کا یہ مقصد نہ ہوتا تو پھر علم اور ٹیکنالوجی نشر کرنے کا سب سے اچھا اور آسان راستہ یہ تھا کہ تمام اچھی اور مفید معلومات افغانوں کی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے جیسے کہ ایرانیوں اور عربوں نے کیا لیکن امریکا یہ چاہتا ہے کہ نئے علوم صرف ایک جماعت کے لوگوں میں جو کہ ان کے تیار کردہ اور تربیت یافتہ ہوں، تک محدود رہے۔

جہاں تک یونیورسٹی میں امریکی اساتذہ کی بات ہے تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ افغان اس یونیورسٹی میں استاد بننے کی استعداد نہیں رکھتے بلکہ اصل غرض یہ ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ بیروت، استنبول، اور قاہرہ کی امریکی یونیورسٹیوں کے فضلاء کی طرح خالص امریکی مبلغین ہوں اس لیے کہ ان یونیورسٹیوں میں استاذ بننے کی اہم شرط یہی ہے اور یہی شرط بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں سال ۱۹۵۴ء کے داخلے کی شرائط میں صراحت کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ اگر صرف صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے ان کو محروم کیا جاتا تو پھر یہی افغان اساتذہ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں کیوں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہوتے؟ تو جب وہاں اہلیت رکھتے ہیں تو یہاں کیوں نہیں رکھتے؟

تعلیمی فیس کا ڈالروں میں ہونا

مسلسل گزشتہ تین عشروں سے جاری جنگوں اور بیرونی فوجی حملوں کی وجہ سے افغانستان کی اقتصادیات صفر درجے تک پہنچ چکی ہیں، لوگ ایک وقت کے کھانے کے لیے وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں، اقتصادی بحران کی وجہ سے تقریباً ۸۰ فیصد نوجوانوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا ہے، افغانستان کی ایسی ناگفتہ بہ حالت میں بھی امریکہ کا اپنی یونیورسٹی کی فیس ڈالروں میں رکھنے کے پیچھے کئی اہم مقاصد مضمر ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس شرط کی وجہ سے اس مسیحی یونیورسٹی میں صرف وہی لوگ

داخلہ لے سکیں گے جن کا ڈالروں سے واسطہ پڑتا ہے اور جو (دنیاوی اعتبار سے) معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہوں یا انہیں وہ لوگ داخلہ لیں گے جو ایک طرف تو امریکہ کی خدمت اور ان کے لیے جاسوسی کے عوض میں ان سے ڈالر لیں اور دوسری طرف تعلیم کے عوض اُن کو واپس دے دیں، اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے، اپنے لیے غلام بھی پیدا ہو جائیں گے اور کلیسا کے لیے کمائی بھی ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور مغرب کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ افغانی علم اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوں بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ ان کی غلامی کے نظریاتی جال میں پھنسے رہیں۔ اگر ان کی منشا یہ نہیں ہے، بلکہ یہ افغانوں کو واقعی علم و ہنر سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر افغانستان میں پہلے سے موجود یونیورسٹیوں کے ساتھ کیوں تعاون نہیں کرتے؟؟ تاکہ علم عام ہو جائے۔ حال ہی میں افغانستان میں کابل، ننگرہار، خوست، مزار شریف، قندھار، ہرات اور کاپیسا کی یونیورسٹیوں میں تعلیمی، لاجسٹک، اور فنی شعبوں میں مالی امداد کی شدید ضرورت تھی، لیکن امریکہ ان یونیورسٹیوں کے ساتھ اس لیے تعاون نہیں کرتا کہ وہاں افغان نوجوان اپنے افغان اساتذہ کے زیر سرپرستی افغانی معاشرت اور ثقافت کے مطابق افغانی مصالح کے لیے تربیت پاتے ہیں، جس سے امریکہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس سے افغانوں کے لئے خود کفیل ہونے کی راہ ہموار ہوتی ہے، جس سے امریکہ کا سراسر نقصان ہے کیوں کہ اس کی چاہت تو یہ ہے کہ افغانستان ہمیشہ اس کا محتاج رہے۔

امریکہ نہ صرف یہ کہ علاقائی یونیورسٹیوں کو تقویت نہیں دینا چاہتا بلکہ قصداً یہ کوشش بھی کرتا ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کو بھی مفلوج کر کے رکھ دے تاکہ بہترین استعداد رکھنے والے نوجوانوں کی توجہ امریکی یونیورسٹیوں کی طرف ہو جائے۔ لبنان میں جنگ کے زمانے میں بیروت کی عربی یونیورسٹیوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے بموں سے اڑا دیا گیا اور یونیورسٹی کے تمام شعبوں کو باریک بینی کے ساتھ منہدم کر دیا گیا، جس کے خسارے کا اندازہ اس وقت ۲۰۰ ملین ڈالر لگایا گیا حالانکہ اسی شہر میں موجود امریکی یونیورسٹی کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا۔

امریکی یونیورسٹی کے شعبے (Faculties) اور تخصصات

امریکہ نے کابل کی امریکی یونیورسٹی میں وہ شعبے اور تخصصات سرے سے شروع ہی نہیں کیے جن کی افغان قوم کو فوری ضرورت تھی اور اس کا فائدہ بھی جلدی حاصل ہونے والا تھا اور جنگ زدہ افغانوں کی ضروریات بھی اس سے پوری ہو سکتی تھیں جیسے طب، انجینئرنگ، زراعت یا دیگر صنعتی شعبے، بلکہ ان کی جگہ امریکہ نے وہ شعبے کھولے کہ جن کے ذریعے سیاسی، فکری، ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے افغانستان کی عوام کو امریکی قالب میں ڈھالا جا سکے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ سیاسی علوم کا شعبہ

سیاسی علوم کا شعبہ عوام کے لیے ایسے سیاستدان اور حکام تیار کرتا ہے کہ جو ایک خاص منشور کے مطابق ملک کا سیاسی نظام اور بیرونی روابط بنا سکیں اور اپنی ملت کے دیگر ملتوں کے ساتھ معاملات کرنے کے ایسے اصول بنا سکیں جس میں امریکی اور اہل مغرب کے منشور کے اہداف محفوظ ہوں۔ ایسے شعبوں کا موجود ہونا امریکہ کو اس کی دائمی بقاء کی ضمانت دیتا ہے۔

۲۔ اقتصاد کا شعبہ

مغرب کا سارا اقتصادی نظام سرمایہ کاری کی بنیاد پر کھڑا ہے جس میں سود، احتکار (ذخیرہ اندوزی) اور بیمہ اور اہم بنیادیں ہیں۔ اس قسم کے نظام کے ذریعے اس نے پوری دنیا کے اقتصادی وسائل کو اپنی خدمت میں لگایا ہوا ہے، اس نظام کو چلانے کے لیے امریکہ ہر جگہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر لوگوں کو تربیت دیتا ہے تاکہ پوری دنیا کی اقتصادی سرگرمیاں اس کی مرضی اور طریقے کے مطابق چلیں۔ افغانستان چونکہ اس خطے کا ایک بڑا معدنی ملک ہے اور دیگر ملکوں کے درمیان تجارت کے لئے ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے امریکہ اس علاقے کے اقتصادی مستقبل پر قبضہ جمانے کے لیے ابھی سے لوگوں کو اپنے اقتصادی اصولوں کے مطابق تیار کر رہا ہے۔

۳۔ صحافت کا شعبہ

صحافت اور میڈیا ایک ایسا طاقتور اسلحہ ہے جو معاشرے میں ایک انقلاب برپا کرسکتا اور ایک نظام کو گرا کر اس کی جگہ دوسرے کو لا سکتا ہے، اسی کے ذریعے نئے نظام متعارف کرائے جاتے اور پرانے معاشرتی افکار کو رواج دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاشرے کے اخلاق بنانے اور بگاڑنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ اسی لیے آج دنیا میں حکومت کے قوانین عملی طور پر نافذ کرنے اور ان کی قانون سازی کرنے والی طاقتوں کے ساتھ ساتھ میڈیا کو بھی نظام حکومت کا ایک مستقل حصہ سمجھا جاتا ہے۔ افغان معاشرہ چونکہ ہمیشہ سے مغرب کے بداخلاق اور بے دین نظریات سے دور رہا ہے اور ان کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی اسلامی اور قومی بنیادوں پر قائم ہے جس کی وجہ سے وہ کسی بھی بے دین نظریات اور بیرونی حملوں سے مقابلے کی ہمت اور طاقت رکھتا ہے۔ اس لئے یہ چیز امریکہ اور مغرب کے لئے ہمیشہ سے ناقابل قبول رہی ہے۔ لہٰذا اب ان کی یہ کوشش ہے کہ میڈیا اور صحافت کے میدان میں بھی ایسے لوگوں کو تیار کریں جو ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبار، رسالوں اور دیگر وسائل کے ذریعے افغانیوں کا رابطہ اپنے ماضی سے منقطع کر کے ان کا مستقبل مغرب کے ساتھ جوڑ دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے امریکی یونیورسٹیوں میں میڈیا اور صحافت کے شعبے کھولے گئے ہیں۔

۴۔ نظامِ حکومت (مینجمنٹ) کا شعبہ

یہ شعبہ بھی امریکہ کے لیے ایک ایسی نسل تیار کرنے کا کام سرانجام دے رہا ہے جو افغانستان میں امریکہ کے لیے امریکی طریقہ کار کے مطابق ملکی ادارے چلائے۔

۵۔ فنون لطیفہ کا شعبہ

یہ شعبہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ مغرب کی ذلیل ثقافت کے لیے زمین ہموار کی جا سکے۔ مغرب میں 'فنون لطیفہ' موسیقی، رقص، مصوری، مجسمہ سازی، گانا بجانا اور اِدھر اُدھر کی دیگر بداخلاقیوں کو کہا

جاتا ہے۔ مسیحی مبشرین اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ جب تک مسلمان اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہیں گے اس وقت تک وہ عیسائی نہیں بنیں گے لیکن جب مغربی طرز زندگی اپنالیں گے تو پھر مسیحیت قبول کرنا ان کو مشکل نہیں لگے گا۔

۶۔ ادبیات اور تعلیم و تربیت کے شعبے

یہ شعبہ بھی امریکی یونیورسٹی کے اہم شعبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان شعبوں کے ذریعے معاشرے کے افراد کو تعلیم کے نام پر مغربی تربیت دی جاتی ہے جو کہ مسیحی تربیت کے لیے پہلی سیڑھی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

امریکی یونیورسٹی کی غیر نصابی سرگرمیاں

امریکی یونیورسٹی نے ان تمام اسلامی ممالک میں جہاں جہاں یہ یونیورسٹیاں موجود ہیں اپنی نصابی اور تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا ہوا ہے۔ ان سرگرمیوں سے ان کا مقصد عوام پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا ہوتا ہے۔ بعض سرگرمیاں اور پروگرام تحقیقاتی منصوبوں کی شکل میں اور بعض دیگر اجتماعی پروگراموں کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں ان پروگراموں میں سے بعض کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

☆ یونیورسٹی میں کلیسا بنانا اور کلیسا کی تمام سرگرمیوں میں ہر روز طلباء کو شریک کرنا۔

☆ نوجوانوں کے لیے مسیحی فلموں کی نمائش۔

☆ لیکچرز (تقاریر) وغیرہ کے پروگرام منعقد کر کے معاشرے کے بلند طبقے کے افراد کے سامنے مختلف سیاسی، اجتماعی، قومی اور دیگر موضوعات پر بیانات کرنا اور غیر محسوس طریقے سے اسلام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا۔

☆ ایسے سیمینار اور کانفرنس منعقد کرنا جس میں بعض شرعی موضوعات جیسے حدود، حقوق اور دیگر

امور کو انسانی عقل کے ترازو میں تولا جاتا ہے اور عقل کو وحی کے مقابلے میں حق اور باطل پہچاننے کا معیار ثابت کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے معاشرے کے بااثر افراد کو وحی (قرآن و حدیث) کے بارے میں شک میں ڈالا جاسکے۔

☆ لبرل (ہر قید و بند سے آزاد) اور مخلوط تعلیم، یونیورسٹیوں میں سینماؤں کا قیام، موسیقی کے اجتماعات اور دیگر بے دین موضوعات پر پروگرام منعقد کر کے امریکی ثقافت کے فروغ کے لیے راہ ہموار کی جاتی ہے۔

☆ مختلف تحقیقی اور تجزیاتی پروگراموں کی آڑ میں معاشرے کی ان عادات اور رسومات کا تجزیہ کرنا جو اسلامی ممالک میں مغربی ثقافت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ امریکی یونیورسٹی نے اس کام کے لیے مختلف اشخاص اور این جی اوز کو کام پر لگایا ہوا ہے جن کے دیئے ہوئے نتائج اور تجربات پر باہمی تبادلہ امریکہ میں ان اداروں کے ساتھ مل بیٹھ کر کیا جاتا ہے جو اسلامی ممالک میں امریکی حکومت کے مختلف اداروں کو پالیسی بنا کر دیتے اور ان کے لیے مختصر اور طویل اہداف متعین کرتے ہیں۔

☆ حکومتی اداروں کے ملازمین اور کام کرنے والوں کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے انگریزی زبان کے طویل اور مختصر کورسز کا اجراء کرنا۔

اقتصادی وسائل حاصل کرنے کی تربیت

اسلامی ملک میں امریکی یونیورسٹیوں کو مالی اور اقتصادی طور پر اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے تاکہ وہ نیویارک میں مرکزی کلیسا (Presbyterian) پر بوجھ نہ بنیں یا مالی مشکلات کی وجہ سے کہیں ان کے دیوالیہ ہونے تک نوبت نہ پہنچ جائے، امریکہ نے انہی علاقوں میں ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے مضبوط اقتصادی سلسلے شروع کیے ہوئے ہیں تاکہ ایک طرف تو ان ممالک کا اقتصاد اپنے قبضے میں لے لیا جائے اور دوسری طرف یونیورسٹی چلانے کے لیے علاقائی سطح پر مالی وسائل بھی فراہم ہوجائیں۔ مثال کے طور پر مصر میں امریکی کمپنی کا سیون اپ (Seven up) کا کارخانہ

خریدنا، اسی طرح مصر میں پیرامائڈ کے نام سے مشہور ہوٹل جو بیرونی سیاحوں کے استعمال میں آتا تھا، کا خریدنا، اس کے علاوہ قاہرہ میں متنی بسوں کا منصوبہ چلانا، اسی طرح مصر کے شہروں میں بہت سی اچھی اچھی جگہوں پر زمینیں خریدنا اور قیمت بڑھنے پر حیران کن منافع پر بیچنے کے ساتھ ساتھ مزید نظریاتی بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے مختلف شہروں میں کمپیوٹر اور انگریزی زبان کے کورسز کرانا بھی امریکی یونیورسٹیوں کے مالی وسائل پورے کرنے کے عام ذرائع ہیں۔

اسی امریکی یونیورسٹی نے مصر میں امریکہ کی ایک بااختیار این جی او USAID کے تعاون سے انسانی نسل کی تحدید (Birth Control) کے لیے دو ملین مصری لڑکیوں کو مانع حمل کی گولیاں تقسیم کرنے کے کاموں پر لگایا ہوا ہے۔

لہٰذا اب فکر کی بات یہ ہے کہ اگر امریکی یونیورسٹی نے کابل میں بھی اپنے پاؤں مضبوط کر لیے تو پھر اس طرح وہ افغانستان میں بھی ملک کے اقتصادی چشموں کی طرف ہاتھ لمبے کرے گی اور مسیحیت کے فروغ کے لیے افراد کی پیداوار کے ساتھ ساتھ اپنے کاموں کو ترقی دینے کے لیے مالی وسائل بھی افغان عوام کی ہی جیب سے حاصل کرے گی یعنی ہماری ہی چھری سے ہم کو ذبح کرے گی۔

امریکی یونیورسٹی اور C.I.A کے لیے جاسوسی -

- امریکی یونیورسٹی مسیحیت کے فروغ اور معاشرے میں نظریاتی بگاڑ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ امریکی خفیہ ادارے C.I.A کے ساتھ خفیہ اور علانیہ روابط بھی رکھتی ہے بلکہ C.I.A کے جاسوس باقاعدہ ان یونیورسٹیوں میں موجود بھی ہوتے ہیں، مثال کے طور پر کرسٹوفر تھون ۷۰۔۱۹۶۰ء کے درمیانی عشرے میں قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی کا پرنسپل بھی تھا، اور مصر میں C.I.A کے لیے کام بھی کرتا تھا۔ بیروت میں امریکی یونیورسٹی کا ایک پرنسپل مالکوم کیر C.I.A کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ لبنان میں اس کے لیے جاسوسی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

امریکی یونیورسٹیاں درج ذیل میدانوں میں C.I.A کے لیے کام کرتی ہیں:

☆ اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اسلام کی طرف توجہ کا گراف معلوم کرنا اور ان تمام اسباب، عوامل، موثر اشخاص، جماعتوں اور تحریکوں کے بارے میں C.I.A کو معلومات فراہم کر کے ان کا راستہ روکنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔

☆ اسلامی ممالک میں اسلامی تنظیموں کی سرگرمیوں کو معلوم کرنا اور ان کے بارے میں C.I.A کو معلومات فراہم کرنا۔

☆ جہاد اور جہادی فکر کے بارے میں وسیع پیمانے پر تجزیہ کرنا اور اس کے نتائج C.I.A کو دینا۔

اختتامی کلمات

گذشتہ صفحات میں دیکھا گیا کہ کسی بھی ملک میں امریکہ کی طرف سے چلائی جانے والی یونیورسٹی ایک خالص مسیحی یونیورسٹی ہوتی ہے جسے کلیسائیں اپنی دینی، استعماری اور اقتصادی مقاصد کی تکمیل کے لیے اسلامی ممالک میں بناتی ہیں تا کہ ایک طرف تو اسلامی امت کے ممتاز گھرانوں کے بچوں کو ان کے ذریعے مسیحیت کی طرف دعوت دی جائے یا کم از کم انھیں اپنے جال میں پھنسالیا جائے اور دوسری طرف اسلام کے فروغ اور اس کے غلبے کا راستہ روکا جائے۔

یہی کوشش آج افغانستان میں بھی کابل کی امریکی یونیورسٹی کی شکل میں جاری ہے۔ اگر اس ملت کے دردمند اور باشعور نوجوان اور اسلام سے ہمدردی رکھنے والے احباب اس فتنے کا سد باب آج ہی سے نہیں کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ یہ یونیورسٹی افغانستان بلکہ اس پورے خطے میں اسلام کے مستقبل کے لیے ایک بڑے خطرے کی صورت اختیار کر لے۔ اس یونیورسٹی کی حقیقت، تاریخ اور اہداف سے متعلق مجھے مختلف عرب ممالک میں تعلیم حاصل کرنے اور وہاں رہنے کے دوران مشاہدے اور مطالعے

سے جو بھی معلومات حاصل ہوئی تھیں، میں نے اپنی ذاتی ذمہ داری پوری کرنے کی خاطر اپنی ملت کے باشعور مؤمن نوجوانوں کے سامنے رکھ دیں، کابل کی امریکی یونیورسٹی کے بارے مین مزید معلومات ان شاء اللہ تعالیٰ اگلی اشاعت میں پیش کی جائیں گی۔

و ماتوفيقى الا بالله عليه توكلت و اليه انيب

ملت

عالم اسلام پر مغرب کی فکری یلغار

امریکی اسلام

نظریاتی جنگ

سیکولر نظام تعلیم

فکری ارتداد

کابل کی مسیحی یونیورسٹی

جمہوریت

مولف:

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالہادی مجاہد حفظہ اللہ

مترجم: ابو عبداللہ